THE ZANANA. JAN 1938
Regd. No: A. 211

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱
جملہ حقوق محفوظ ہیں

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔ اے

نمبر ۱	جنوری ۱۹۳۸ء	جلد ۷۰

فہرست مضامین

تصاویر (۱) شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر عظیم آبادی مرحوم
(۲) سر جگدیش چندر بوس مرحوم

دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا
ششماہی ۳ روپے ... مالک غیر سے ... سالانہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ
فی پرچہ ۸ آنے

زمانہ کا پریم چند نمبر
جو یادگار پریم چند کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے اور جسمیں اس نامور ادیب کی زندگی کے ہر پہلو پر اُن کے پُرانے اور واقف کار دوستوں کے لکھے ہوئے حالات شائع کئے گئے ہیں۔ اور اُن کی تمام تصانیف پر مُلک کے قابل و منتخب نقادوں کے لکھے ہوئے مضامین درج ہیں۔ کل مضامین کا حجم ۲۶۰ صفحات ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند صاحب کی مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون عکسی تصاویر، اور اُن کی تحریر کا عکس اور خود اُن کے خود نوشت حالات بھی بڑی تلاش و تحقیق سے دیدئے گئے ہیں
اس قابل قدر نمبر کے صرف چند نسخے تیار کرائے گئے ہیں
Rs. 1/8/-
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول
شائقین اُسے فوراً طلب فرمائیں، ورنہ بعد میں یہ ادبی تحفہ "زمانہ جوبلی نمبر" کی طرح کسی قیمت پر بھی کہیں سے دستیاب نہ ہو سکیگا۔
المشتہر:۔ مینجر زمانہ کانپور
ہاف ٹون و عکسی تصویریں
مرزا غالب، مومن۔ انیس، آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی، سرشار، اقبال، چکبست، نظر لکھنوی، حضرت وصل بلگرامی، عزیز لکھنوی، ناشاد، شاد عظیم آبادی، رسوا، برق دہلوی، لالہ سری رام، سلیم پانی پتی، طباطبائی، اثر لکھنوی، محروم، تسکین، افسر، حسرت موہانی، داغ، راز چاندپوری، مہر، فرحت اللہ بیگ، امیر مینائی، ذکاء اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، سر سید احمد خان، سرور جہان آبادی، ریاض خیر آبادی، اکبر الہ آبادی۔ مولانا صفی لکھنوی، عزیز، شوق قدوائی، جوش ملیح آبادی، رواں مرحوم، حفیظ جالندھری، جگر، کیفی، سدرشن، منشی بالمکند گپتا، پریم چند، محشر لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملا۔ جگر بریلوی، رام بابو سکسینہ، راشد الخیری، ایک آنہ فی تصویر۔ نوٹ۔ ان تصویروں کا البم تیار ملیگا
ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور
بیسویں صدی کی بہترین کتاب
کوئی کتاب کسی خوبی کے بغیر ایک لاکھ کی بھاری تعداد میں نہیں بک سکتی
ہدایت نامہ خاوند
عملی ہدایتوں، راز کی باتوں اور زندگی بخش نصیحتوں کا بیش بہا خزانہ ہے
آپ مطالعہ فرمائینگے تو کہیں گے
کاش میں نے یہ کتاب پہلے پڑھی ہوتی
سب کتب فروش اور ریلوے بک سٹال بیچتے ہیں
کویراج ہرنام داس بی اے لاہور

سر جگدیش چندر بوس

پیدائش سنہ ۱۸۵۸ء　　　　وفات سنہ ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین زمانہ جلد نمبر ۷ جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۳۸ء

تصاویر:۔ شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر عظیم آبادی مرحوم ۔ سر جگدیش چندر بوس مرحوم ۔ شری یت سوبھاش چندر بوس صدر کانگریس ۔ ڈاکٹر اقبال ۔ علامہ اقبال کا اصلی مسودہ "ہندوستان ہمارا" مطبوعہ زمانہ سنہ ۱۹۱۰ء

حصۂ نثر

حصہ نظم

جلد ۶۷ — جنوری ۱۹۳۶ء — نمبر ۱

دیہاتی ناچ

از مسٹر جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

ہند قدیم کی پُرانی رسمیں فنِ رقص کی قدامت کا زندہ ثبوت ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دیہاتوں میں ناچ کا رواج ہنوز اپنی ابتدائی حالت میں جاری وساری ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شہروں میں تہذیب وتمدّن کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اِس فنِ لطیف نے بھی ارتقا کی انتہائی منازل طے کر لی ہیں لیکن دیہاتوں میں اصلاح وترقی کے موقعے عام طور پر موجود نہیں ہیں ورنہ معیارِ فن کے اعتبار سے دونوں مقامات کے صاحبِ کمال مشترکہ بنیادی اصولوں پر کاربند ہیں۔

دیہاتی ناچ محض تفریح طبع کا دلچسپ مشغلہ اور ہنسنے ہنسانے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اُن کی ہر صنف اپنے خاص انداز میں روح کے کسی ایک یا دوسرے لب بستہ پیغام سے ہمدوش ہے جس کے سمجھنے کے لئے عقل وسلیقہ کی ضرورت ہے۔ عام نظریں دیہاتی رقص کی جن مخصوص جنبشوں کو ایک بے معنی ہڑبونگ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتیں۔ وہ دراصل بعض معینہ اُصولوں کی پابندی کا ایک متحرک سلسلہ ہے۔ جو بذاتِ خود ایک منتخب مقصد اور ایک مناسب موقع کے تابع ہے۔

آج تک ہمارے نامہذب دہقان اور نیم وحشی کہلائے جانے والے مَن کے اُجلے اور تن کے اُلے انسان ان رموز ونکاتِ فن کے (جنھیں نئی روشنی نے پسِ پشت ڈال دیا ہے) امین بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تمام دیگر اصنافِ فن کی طرح رقص وسرود کی تربیت وترقی

بھی مذہب ہی کی گود میں ہوئی۔ اور مذہب کا اثر و اقتدار ہمارے دیہاتوں میں جتنا ہمہ گیر ہے شہروں میں اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہی باعث ہے کہ مذہب سے اہل دیہہ کو ان کی خوش اعتقادی کے طفیل میں جو کچھ ملا اُسے یہ سادہ لوح اور فرشتہ سیرت انسان اپنے سینہ سے لگائے رہے۔ شاہراہ ترمیم و تنسیخ کی جانب سے اُنھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تقدیس مذہب کے پاک جذبہ سے مرعوب ہو کر اُسی پُرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے رہے جو اُن کے پیشرو ان کے نزدیک عطیۂ فطرت تھا۔ یہ ضرور ہے کہ تقاضائے بشریت کے مطابق کہیں کہیں ان کے دستور العمل میں کچھ تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں۔ لیکن چونکہ آفتاب علم کی شعاعیں ان تک پہونچنے سے قاصر رہیں اس لئے نہ تو ان کے جذبات و احساسات کی مناسب تہذیب و تدوین ہوئی اور نہ ان کے اظہار جذبات کے محدود وسائل میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو سکا۔

اس کے برخلاف شہروں میں ترقی علم کے ساتھ ساتھ مذہب کا رنگ پھیکا پڑتا گیا اور لوگوں کا مذاق سلیم آہستہ آہستہ اتنا بلند و بالا ہو گیا کہ مہذب نگاہیں ہر شئے میں حسن و سلیقہ تنظیم و باقاعدگی کی جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب رہنے لگیں۔ اس نئی طلب اور نئے ذوق و اشتیاق کا فن رقص پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جمالیاتی رجحان کی تشنگی بجھانے و نیز دیگر مادّی ضروریات کی تکمیل کے لئے طرح طرح کے ناچوں کی تنظیم ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ فن اتنا لطیف و بلیغ ہو گیا کہ اس کے شباب کی پُرکیف رعنائی و برنائی اور حُسن کی سحر کار لطافت و نزاکت کے روبرو اس کے ابتدائی نقش و نگار بھونڈے نظر آنے لگے۔

ہندوستان کے بیشتر مواضعات میں فن رقص ابھی تک عہد طفلی کی خوش خرامیوں سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ لیکن بنگال۔ گجرات اور دکن کے بعض گاؤں میں اس نے غیر معمولی شعور و بلوغ حاصل کر لیا ہے۔ اور وہ رنگ و روپ نکالا ہے کہ باید و شاید۔ اب آہستہ آہستہ اس کے حسن و جمال کا آوازہ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اور مہذب و فنی باریکیوں کے آئینہ دار ناچ اسے اپنے صف اولیں میں ممتاز جگہ دینے کے لئے تیار دکھائی دے رہے ہیں۔

یہ امر کہ ہندی فن رقص تمدن و ارتقاء کے کتنے درمیانی درجے طے کر کے اس بلندی پر پہنچا ہے ہنوز تحقیق طلب ہے۔ لیکن اس کی ابتدائی حیثیت اور بعض درمیانی کیفیتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہند قدیم کا ہزار ہا سال کا اندوختہ سرمایہ ہے۔

صدیاں گذریں برج اور مدھوبن کی کنج گلیوں میں راس لیلاؤں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ابتدا

یہ لیلائیں بعض مختلف ناچوں کا ایک سلسلہ ہوتی تھیں۔ لیکن جب فنِ رقص وقیع و وسیع ہوگیا اور عام لوگوں کی وہاں تک رسائی مشکل ہوگئی تو ان میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی، اور نوٹنکی ناچ عرصۂ وجود میں آیا۔ پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ نقل اور سوانگ ناٹکوں کی ابتدائی صورت ہیں۔ لیکن قدیم ہندی ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے پہلے ایک اور چیز بھی موجود تھی، جو بلاشبہ سلسلۂ ناٹک کی ایک کڑی ہے۔ یہ "درس" (नृत्य) یا نرتیہ ناٹک کہلاتی ہے۔ سنسکرت میں اس نوع کے ناٹکوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ ان ناٹکوں کا سنگِ بنیاد "درو" (ध्रुव) راگ ہے جو غالباً دھرو یا دھرپد کا مخفف یا اس کی مسخ شدہ صورت ہے۔ بعض مستشرقین کی رائے ہے کہ "درو" کسی قدیم زبان کا لفظ ہے جس سے دھرو یا دھرپد سنسکرت الفاظ مشتق ہیں۔ اسی راگ سے پرانے سنسکرت ناٹکوں کا آغاز ہوتا تھا۔

"درو" (ध्रुव) راگ کے تتبع میں مختلف قسم کے ناچ رائج تھے، جو اس راگ کی حرف بحرف ترجمانی کرتے تھے۔ درس فی الحقیقت راگ (موسیقی) اور رقص کا دل خوش کن مجموعہ ہوتے تھے۔ لیکن ان پر ابھی مکالموں کا رنگ و روغن نہ چڑھنے پایا تھا۔ اس نوع کے ناٹکوں کی ترتیب کا یہ مقصد تھا کہ ایک مقررہ لے اور تال کی پابندی کے ساتھ مختلف گانے لکھے جائیں اور ان پر مختلف ناچوں کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ اس التزام کے تحت میں ہر راگ ایک خاص رس کا مالک ہوتا تھا۔ اور اس کی تشکیل و ترجمانی کے لئے ایک جداگانہ ناچ معین تھا۔ گجرات کا کتھک نرتیہ اور دکن کا کتھاکلی ناچ اسی طرح کے ناچ ہیں۔ درس دراصل ان حسین و جمیل کوششوں کا نتیجہ ہیں جو رس کو سرود سے ہمکنار کرنے کے لئے کی گئی تھیں۔ نرتیہ ناٹک دکن میں خوب پھلے پھولے اور ایک طویل عرصہ تک مروّج رہے۔ رفتہ رفتہ ان میں مکالموں نے اپنا دخل جمانا شروع کیا۔ اب عام بول چال کی زبانوں میں مکالے لکھے جانے لگے۔ اس طرح ہندی ناٹکوں کا ایک رنگین خاکہ تیار ہوگیا۔ آگے چل کر جب ان پر ادبی رنگ غالب آنے لگا تو یہی ناٹک بن گئے۔ نرتیہ ناٹک کی غیر معمولی کامیابی اور عالمگیر ہردلعزیزی نے گیت کا دیّہ اور راگ ناٹکوں کی بنیاد ڈالی۔ ادبی ناٹک عام فہم نہ ہونے کے باعث راگ ناٹکوں کی عام پسندی کا مقابلہ نہ کر سکے اور اسی لئے وہ بہت جلد معرضِ زوال میں آگئے۔

نرتیہ اور راگ ناٹکوں میں صرف یہ امر مابہ الامتیاز ہے کہ جہاں اول الذکر ناٹکوں کا رقص سے براہ راست تعلق تھا وہاں راگ ناٹک محض بتاوے تک ہی محدود تھے۔ نرتیہ ناٹک مکالموں سے عاری تھے لیکن یہی مکالمے راگ ناٹکوں کی جان تھے۔

دکن میں عام دیہاتی ناچوں کے مقابلہ میں ورس اس قدر مقبول ہوئے کہ مدتوں انھیں کا چرچا ہوتا رہا۔ سیتارام بھگوتر شلا سنگم میں اور ناٹیہ شاستری میراتر میں سوامی بھگوترا وتھو گُدو میں قدما کی فنی باریکیوں اور اُن کے درس کی تقلید میں برسوں سر کھپاتے رہے۔ اور کچھ ایسا کمال حاصل کیا کہ جس کی نمائش سے بڑی بڑی ذی شعور اور باکمال دیو داسیاں بھی مبہوت ہوگئیں۔ تنجور دربار کی مشہور سے مشہور رقاصہ بھی بھگوتر کے سکھائے ہوئے لڑکوں سے کَن جَن (किनजन) نامی زنانہ ناچ میں ہار مان بیٹھیں۔ اِن ناچوں کے لئے وینکٹارا ما شاستری نے جو تیاگ راج کے ہمعصر تھے تلگو میں کتنے ہی درس تصنیف کئے جو ادبی حیثیت سے تیاگ راج اور پلوی گوپال ایر کی تصانیف کی ٹکر کے ہیں۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ نرتیہ ناٹک کے عین بعد راگ ناٹک کا ظہور ہوا لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ سنسکرت ادب کی مستند تاریخ شاہد ہے کہ ہندی ناٹکوں کی ابتدا فطری طور پر نثر سے ہوئی۔ علاوہ بریں مسلسل مکالے نظم کرنا یونہی مشکل ہے اور اُن کا نظم میں ہونا خلاف فطرت بھی ہے۔ اور ناٹک کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت کا چربہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں بھی قرین عقل ہے کہ راگ ناٹکوں کی ابتدا حقیقی ناٹکوں کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہوئی ہو۔ کیونکہ جو کام بآسانی ہوسکتا ہے اسی سے کسی مشکل اقدام کا آغاز ہونا لابدی ہے۔

مواضعاتِ ہند میں جو ناچ مروّج ہیں اور درس سے جو اقسام رقص وابستہ ہیں، اُن کا ذکر تو کیا نام و نشان بھی بھرت ناٹیہ شاستر میں نہیں ہے۔ اِس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کول دراوڑ اور ہندوستان کے دوسرے قدیم و اصلی باشندگان کی یادگار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خیال درست ہو لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ سنسکرت میں درس لکھنے کا کب اور کس طرح آغاز ہوا۔ تاہم ان کے سنسکرت ناٹکوں کے پیشرو ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

ناٹیہ شاستر میں ان ناچوں کا مذکور نہ ہونا اس امر کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اِس قسم کے ناچوں سے آریہ قوم نابلد تھی۔ آج تک کسی موضوع پر دنیا کی کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی جو ہر پہلو سے جامع اور مکمل ہو۔ اس کے علاوہ ناٹیہ شاستر میں نہایت بلند پایہ ناچوں پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے بنیادی اُصولوں کی باعتبار فن تشریح و توضیح کی گئی ہے، ورنہ اس کا اصل موضوع تو ناٹک ہے۔ اس لحاظ سے ہم بھرت سے یہ اُمید نہیں کرسکتے کہ وہ رقص کی ہر صنف سے تفصیلی بحث کرتا۔

صوبۂ بنگال کے بعض اضلاع مثلاً سلہٹ فریدپور اور جیسور کے مواضعات میں خاص قسم کے

برت (رسمی) اور دیوایک (وہ ناچ جن کا رسوم شادی سے لگاؤ ہے) نرتیہ کثرت سے رائج ہیں۔ نالیا (واقع فرید پور) اور باج گھاٹ (واقع جیسور) میں اس طرح کے جتنے ناچ مروج ہیں، ان کی مختصر کیفیت یہ ہے:۔

(۱) گھٹ اولنو (घट उलनो) یہ برت نرتیہ کے ذیل میں آتا ہے۔ بنگال میں سیتلا دیوی کی پوجا کا رواج عام ہے چنانچہ دیوی کو خوش کر کے اس سے دان مانگنے اور چیچک کی وبا سے محفوظ رکھنے کی التجا کرنے کے لئے یہ رقص کیا جاتا ہے۔ پہلے دیوی کی پوجا کی جاتی ہے پھر بستی کی عورتیں ایک تھال (کُلا) میں کلس رکھ کر گھر گھر دان لینے جاتی ہیں تاکہ دیوی کے قدموں میں ایک شاندار بھینٹ چڑھائیں۔ ان کے پہونچنے پر ہر گھر کی رانی صحن میں آسن بچھا دیتی ہے جس پر یہ گھٹ رکھ دیا جاتا ہے، پھر دان مانگنے والی خواتین کا گروہ اس آسن کا طواف کرتے ہوئے رقص کرتا ہے۔ ناچ کے ساتھ ڈھاک یا دف بھی بجایا جاتا ہے۔

(۲) تبندن نرتیہ:۔ دیوی دیوتاؤں کے حضور میں اظہار عقیدت کے لئے بندن نرتیہ کیا جاتا ہے ہم اُسے اوسط درجہ کا برت نرتیہ کہہ سکتے ہیں۔

(۳) دین نرتیہ: یہ کتھا کلی کی ٹکر کا دیوایک ناچ ہے۔ اس کی معینہ حرکات نہایت ادق اور پیچیدہ ہیں۔

(۴) کچ مرا نرتیہ:۔ یہ دیوایک نرتیہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ جس میں کمر سے خاص کام لیا جاتا ہے۔ رقص اس صنفِ لطیف پر مادّی رنگ بدرجۂ اتم غالب ہے۔

(۵) نمسکار نرتیہ:۔ یہ بھی برت نرتیہ کی ایک قسم ہے۔ ناچنے والیاں ایک بیضاوی قطار باندھ کر کھڑی ہوتی ہیں اور ہر قدم پر دوسرے گھٹنے کو خمیدہ کئے ہوئے نصف قدم بڑھ کر پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ اسی طرح دوسرا قدم اٹھاتی اور دوسرے ہاتھ سے سلام کرتی ہیں۔ ایک خاص انداز میں پرنام یا بندگی کے ساتھ رقص جاری رہتا ہے۔ ناچنے والیوں کی رنگا رنگ ساڑیوں، خوبصورت نقرئی وطلائی زیورات کی پیہم و ہموار جنبش اور مرصّع و رنگین انگلیوں کی مستانہ ادا سے قوس قزح کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

اوپر جن اصنافِ رقص کا ذکر ہوا ہے وہ تمام و کمال زنانہ ناچ ہیں۔ حالانکہ ان ناچوں کا مذہبی روایات و رسوم سے بہت گہرا تعلق ہے۔ تاہم یہ اس درجہ حسین اور لطیف ہیں کہ داد نہیں دی جاسکتی۔ فنی اعتبار سے بھی ان کا پایہ نہایت بلند و رفیع ہے۔

رسمی ناچوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے ناچ ان مواضعات میں عام ہیں جن کا مقصد نظر نوازی کے ساتھ ساتھ نشاطِ روح اور عشرتِ حیات کا سامان مہیّا کرنا ہے۔ حالانکہ ابتداءً ان پر بھی خالص مذہبی رنگ غالب تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ حدودِ مذہب سے باہر ہوتے گئے۔ اور عام انسانی زندگی کا منہ بولتا مجسمہ بن گئے۔ اس طرح ان میں حسن و عشق کی سحر آفریں رنگینی حلول کرتی گئی۔ ان میں سے بعض ناچ

کی اجمالی تفصیل یہ ہے :-

(۱) کلکادر　कलकादर
(۲) ارو　अरु
} یہ دونوں "بندن" اور "بین نرتیہ" کی طرح رسمی ہوتے ہوئے بھی خالص مذہبی نہیں ہیں۔

(۳) "جوڑ نرتیہ" :- یہ رادھا کرشن نرت کی دوسری صورت ہے۔ اس میں دو دو ناچنے والیاں ایک ساتھ مل کر رقص کرتی ہیں۔

(۴) پیپری مار یا چیونٹی مارنے والا ناچ۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ رقص کرتے وقت پاؤں اس طرح زمین پر رگڑنا پڑتے ہیں کہ چیونٹیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ چند مزاحیہ رقص یہ ہیں :-

(۱) خودی رام کا دردِ سر۔ (۲) پشپ چین (पुष्प चयन) یا پھول چُننا (۳) بیراگی کو بُلانا اور (۴) تمباکو جلانا۔ یہ ناچ اس درجہ فتیح اور پُر مذاق ہیں کہ دیکھنے والے ہنستے ہنستے بیخود ہو جاتے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ ان میں کہیں سے سوقیت اور پست مذاقی کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔

ان ناچوں کے علاوہ ایک اور ناچ ہے جو "انجلی" (پانی دینا) نرتیہ کہلاتا ہے۔ اسے برت نرتیہ کی تمام دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے۔ اور اہم فنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ دیوانک نرتیہ کی جملہ اقسام پر بھاری ہے انجلی رقص کی معینہ حرکات اس قدر مشکل ہیں کہ رقاصہ کا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ ناچنے والی ایک دائرہ کی شکل میں کھڑی ہوتی ہیں، اور آہستہ آہستہ بائیں جانب سے داہنی طرف رقصاں ہوتی ہیں۔ کمر سے اوپر کا حصہ برابر متحرک رہتا ہے۔ ہاتھ اور بازوؤں سے خاص کام لیا جاتا ہے اور عجیب وغریب حرکات و سکنات کی مدد سے طرح طرح کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ہر رقاصہ کا سر اس انداز سے خم رہتا ہے کہ کنول کے شگفتہ پھول کا شبہ ہوتا ہے۔ اس تمام نمائش میں اول سے آخر تک پاؤں زمین سے چسپاں رہتے ہیں۔ اور ایڑی و پنجہ جوڑ کر پیروں کو پھسلاتے ہوئے اس طرح حرکت کی جاتی ہے کہ زمین پر تصویر بنتی جاتی ہے۔ بنگال کے شہرۂ آفاق نقاد اِن فن مسٹر او۔سی۔ گنگولی اور ڈاکٹر رمیش چندر رائے کی رائے میں یہ ناچ مستورات کے لئے مفید ورزشِ جسمانی کا بھی ذریعہ ہیں، جن میں جسم کو توڑ مروڑ کر دشوار مگر دلفریب حرکات کے ذریعہ سے دل کی دنیا کو آنکھوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے۔

بعض معترضین کی رائے ہے کہ موجودہ بنگال منگول نسل سے آباد ہے، اور یہ ناچ اسی قوم کا سرمایہ ہیں۔ بنگالیوں کے سروں کی ساخت خواہ کیسی ہی ہو اور وہ نسلی تقسیم کے اعتبار سے چاہے منگول ہوں یا آریہ و منگول اقوام کے اختلاط کا نتیجہ ہی کیوں نہ سمجھے جائیں، لیکن ظاہر ہے کہ منگول تہذیب و تمدن کو مٹے ہوئے صدیاں

گذر چکی ہیں، اور ان کے نام لیوا سیکڑوں برس ہوئے آریہ تہذیب و تمدن کو بہ حیثیت مجموعی قبول کر چکے ہیں۔ پھر یہ مان لینے میں کیا قباحت ہے کہ اور تمام باتوں کی طرح بنگالیوں نے یہ ناچ بھی آریہ قوم ہی سے مستعار لئے ہیں۔

ہندُستانی نرت کے اشارات

شِکھر یا مٹھی ناٹیہ شاستر کے مطابق

مٹھی کی عام تمثیل

اردھ چندر یا ہلال کی عام تمثیل
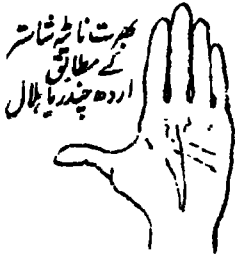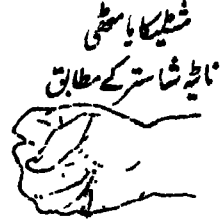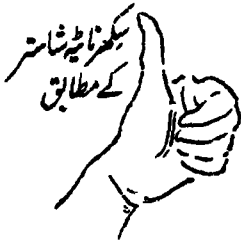
بھرت ناٹیہ شاستر کے مطابق اردھ چندر یا ہلال

سوچی مکھ ناٹیہ شاستر میں

سِکھر کی عام تمثیل

سِکھر ناٹیہ شاستر کے مطابق

جل پان ناٹیہ شاستر کے مطابق

پتر ترنٹر ناٹیہ شاستر کے مطابق

دھفش ٹنکور ناٹیہ شاستر کے مطابق
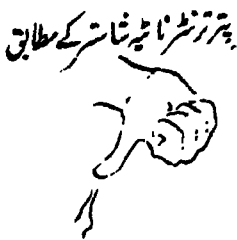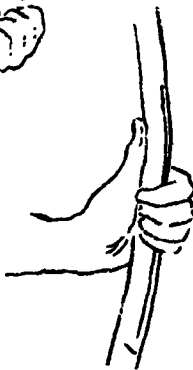
افکارِ تازہ

شاہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر، شجیعؔ حیدر آباد دکن

تری نظر میں نہیں دل، تو کیا ملا نہ ملا، کہ صرفِ درد ملا، درد کا مزا نہ ملا

اسی خیال میں کٹتے ہیں دن جدائی کے اجل تو ہے، جو کوئی اور آسرا نہ ملا

تری نظر نے دکھائی تھی راہِ عشق و وفا پھر اس کے بعد ہمیں کوئی رہنما نہ ملا

ہم اس کی بزم کو محشر سمجھ کے آئے تھے مزا یہ ہے کہ یہاں بھی وہ بے وفا نہ ملا

نگاہ اُن سے لڑی تھی کہ موت آپہونچی دوائے درد ملی، دردِ لا دوا نہ ملا

اُسی کے دِل نے اُٹھائے مزے محبت کے جسے کچھ اور ترے درد کے سوا نہ ملا

رہا ہوئے تو چمن میں خزاں کا موسم تھا نہ شاخِ گل نظر آئی نہ آشیانہ ملا

بہت قریب تھی دنیائے بیخودی لیکن خودی کی حد میں بھٹکتے رہے، خدا نہ ملا

خیال یہ ہے کہ اب جستجو کی تاب نہیں ملال یہ ہے کہ اب تک ترا پتا نہ ملا

تمھیں جو دُور سے دیکھا تو آپ میں نہ رہے تمھارے پاس پہونچنے کا راستا نہ ملا

ہم اُن کے درد کو اک راز جانتے ہیں شجیعؔ
خدا نے فضل کیا درد آشنا نہ ملا

جذباتِ جگر

(حضرت جگر مراد آبادی کی دو تازہ ترین غزلیں)[1]

۱

عاشقی امتیاز کیا جانے — فرقِ ناز و نیاز کیا جانے

ناخنِ عشق کتنے ٹوٹ گئے — گرہِ نیم باز کیا جانے

سچ ہے سب نیک و بد ہمیں سے ہے — گردشِ چشمِ ناز کیا جانے

آئینہ کی نزاکتیں ہے ہے! — دستِ آئینہ ساز کیا جانے

سینۂ نَے پہ جو گذرتی ہے — وہ لبِ نَے نواز کیا جانے

غیرتِ بندگی و ناچاری — کوئی بندہ نواز کیا جانے

نگہِ شوق کی ہے سب تحریک — حسنِ تمہیدِ ناز کیا جانے

رہروِ راہِ بیخودی ہے جگر
وہ نشیب و فراز کیا جانے

---

[1] پچھلے ماہ ہمارے قدیم کرم فرما دوست حضرت جگر مراد آبادی کا پنور آئے تھے۔ چنانچہ آپ کے اعزاز میں علم دوست احباب نے ایک بزم جگر قائم کی ہے جس کی طرف سے حال میں ایک مہتم بالشان مشاعرہ بھی ہو چکا ہے۔ جگر صاحب جب کا پنور آتے ہیں تو غریب خانہ پر کرم فرمائی کئے بغیر نہیں رہتے۔ اس دفعہ ناظرینِ زمانہ کے لئے آپ نے اپنی یہ دو تازہ ترین غزلیں اور چند اشعار عنایت فرمائے ہیں جنھیں ہم دلی شکریہ بلکہ فخر و مباہات کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

(۲)

دل گیا، رونقِ حیات گئی
غم گیا، ساری کائنات گئی

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیِ التفات گئی

ترکِ الفت بہت بجا، ناصح!
لیکن اُس تک، اگر یہ بات گئی؟

اَب جنوں آپ ہے گریباں گیر
اب وہ رسمِ تکلفات گئی

تیری باتوں سے آج تو واعظ
وہ جو تھی خواہشِ نجات، گئی

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر
لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی

دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں،
ایک رات آئی، ایک رات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اِک مسیحا نفس کی بات گئی

قیدِ ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی، اگر حیات گئی

اشعار

دل مرا توڑ کر کہا اُس نے زبانِ راز میں
ساز میں نغمے وہ کہاں جو ہیں شکستِ ساز میں

یہ جو تمام نغمہ ہے دعوتِ عام نغمہ ہے
موجِ خرام نغمہ ہے، نغمہ نہیں ہے ساز میں

غیر جو تلخ کام ہے۔ اُس کے نصیب کی کمی
مجھکو تو اِک مزا ملا ہے غمِ جاں گداز میں

کام نہ آئیں عقل کی عقدہ کشائیاں جگر
اور اضافہ ہوگیا سلسلہ ہائے راز میں

ہندوستان کے بینک

دیسی ساہوکارہ

(از مسٹر عبدالرحیم شبلی، بی کام)

ہندوستان میں روپیئے کا بازار یا نظام ساہوکاری مندرجہ ذیل اجزار پر مشتمل ہے:۔

(۱) ریزرو بینک آف انڈیا،

(۲) امپیریل بینک آف انڈیا،

(۳) ایکسچینج بینک (تبادلہ بنک)

(۴) جائنٹ اسٹاک بینک (مشترکہ سرمایہ دار بینک)

(۵) کوآپریٹیو بینک (امداد باہمی کے بینک)

(۶) صراف۔ مارواڑی۔ ساہوکار۔ مہاجن وغیرہ۔

علاوہ ازیں پوسٹل سیونگ بینک، زمیندارہ بینک اور اسٹاک ایکسچینج بھی جو حال میں وجود میں آئے ہیں اس میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

ہم اِن میں سے بعض اہم بینکوں کا حال درج ذیل کریں گے:۔

پہلے ہم دیسی ساہوکاری کو لیتے ہیں۔

دیسی بنک دیسی بنک ہندوستان کی تجارت وصنعت کی طرح نہایت ہی پُرانی قسم کے ہیں۔ غالبًا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ساہوکارہ اُس وقت بھی مروج تھا جب کسی ملک کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ چنانچہ ایم۔ ایل۔ ٹینن اپنی کتاب (Banking Law and Practice in India) میں رقمطراز ہیں:۔

"زمانۂ قدیم سے ساہوکار ہندوستانی سوسائٹی کا لازمی جزو رہا ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی شہادت موجود ہے کہ مغربی خیالات کی درآمد سے قبل کا ہندوستان بینکوں کی ہیئت کذائی سے ناواقف نہ تھا۔" (صلا)

چانکیہ کے ارتھ شاستر میں (۳۰۰ ق م) اُن تاجر ساہوکاروں کا حال درج ہے جو امانتیں جمع کرتے، قرض دیتے

اور وہ تمام کام کرتے تھے جو آجکل کے نئی طرز کے بنک کرتے ہیں۔

میڈوٹیلر اپنی کتاب میں ہندوستانی ساہوکارہ کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:۔

"منو کے قوانین سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح تین ہزار سال قبل بھی ہندوستان میں بنکوں کا نظام مکمل شکل میں موجود تھا۔ ساہوکاروں کو زر کے تغیرات سے پوری واقفیت تھی، اور وقتی ضروریات کے مطابق وہ اپنے آپ کو ڈھال لیتے تھے۔ وہ کھاتے اور حساب کتاب کے دیگر رجسٹر وغیرہ باقاعدہ رکھتے، سود لیتے، بیمہ کرتے اور ہنڈیاں فروخت کرتے تھے۔ غرض ان کو عہد جدید کے سب طریقوں سے جو بہت کم تبدیل ہوئے ہیں پوری واقفیت تھی۔"

جب مسلمانوں کے حملوں کی وجہ سے کچھ بے امنی پھیلی تو لوگوں نے دیسی صرافہ ملتوی کر دیا اور اپنے اندوختے گھروں ہی میں محفوظ رکھنے لگے۔ تاہم نجی ساہوکارہ کا کام جاری رہا اور حکومت بھی مہاجنوں وغیرہ سے قرض لینے لگی، حتیٰ کہ کوئی ریاست ریاستی ساہوکاروں سے خالی نہ تھی۔ عموماً انھیں ساہوکاروں کو وزیر مالیات کا عہدہ دیدیا جاتا۔ بنگال کے نوابوں کے پاس جگت سیٹھ کے موروثی ساہوکاروں کی موجودگی بتلاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستانی ساہوکاروں کو سیاسیات میں کس قدر دخل تھا۔

مغلوں کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا زمانہ آیا۔ کمپنی بھی ترسیل زر اور فراہمیِ سرمایہ کے لئے ہندوستانی ساہوکاروں کی رہینِ منت ہوئی

اٹھارھویں صدی کے آخر میں یوروپین ایجنسی گھر (European Agency Houses) قائم کئے گئے جن کی وجہ سے ہندوستانی صراف کسی قدر ماند پڑ گئے۔ پھر بھی خاص خاص مقامات میں یوروپین طرز پر پریسیڈنسی بنک (Presidency Banks) قائم کئے گئے۔ جن کے مقابلہ کی وجہ سے دیسی صرافوں کی قدر کم ہوتی گئی۔ تاہم وہ بالکل ناپید نہیں ہوئے بلکہ اب تک موجود ہیں۔ اور دیہاتوں میں ان کا اثر بہت ہے ہر شہر اور ہر گانوں میں کوئی نہ کوئی مہاجن۔ صراف، ملتانی، مارواڑی یا بنیا موجود ہے۔ جو زمینداروں کی مالی ضروریات کو پورا کرتا رہتا ہے۔

دیسی ساہوکاری مشترک سرمایہ داری کے اصول پر منظم نہیں ہے۔ ان کا امانت فنڈ بھی بہت کمزور ہوتا ہے اور "واپسیاں" چکوں وغیرہ کے ذریعہ کی بجائے نقد ہوتی ہیں، ان کا سرمایہ بھی مشترک نہیں ہوتا اور نہ حصے فروخت کرکے روپیہ اکٹھا کیا جاتا ہے، اور نہ حصہ داروں کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی صراف عموماً دوسروں کی مالی امداد کے علاوہ خود بھی تجارت کا کام کرتے ہیں، جو ڈاکٹر ایل۔ سی۔ جین کے الفاظ میں ہندوستانی ساہوکاری کی پستی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

Meadows Taylor. Students Manual of the History of India.

پھر ہندوستان کے دیسی بنکوں نے اٹھارھویں صدی کے برطانوی بنکوں کی طرح عندالطلب نوٹ بھی کبھی جاری نہیں کئے حالانکہ عرصۂ دراز تک کوئی قانونی ممانعت نہ تھی۔

پُرانے زمانہ میں صرافوں کا کام سکّوں کا تبادلہ تھا، اُن دنوں ہر ریاست اپنا علٰحدہ سکّہ مسکوک کرنے کی مجاز تھی، اس لئے ملک میں مختلف قسم کے روپیئے مروج تھے جن کو آپس میں تبدیل کرتے رہنا صرافوں کا کام تھا صراف ہنڈیوں اور Letters of Credit کا بھی کاروبار کرتے تھے، اور حکومت کو بھی گراں قدر مالی امداد دیا کرتے تھے۔

کاروبار آج تک دیسی بنک ہندوستان کے مالی نظام میں نہایت اہم حصہ لے رہے ہیں اور ہندوستانی بازار زر اور ملک کے تجارت پیشہ اصحاب کے درمیان ایک لابدی ذریعۂ الحاق بن گئے ہیں۔ وہ زمیندار، دستکار اور دُکاندار کی مالی امداد کرتے ہیں، غلہ کو تجارتی منڈیوں اور بندرگاہوں تک پہونچانے میں مدد دیتے ہیں اور ہر قسم کا مال و اسباب ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

یہ بنک فصل وغیرہ کے موقع پر حسب ضرورت اپنے گماشتے بھی بذریعہ ریل گاڑی بھجوا دیتے ہیں اور کسانوں کی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹتے اور اُن کی مالی امداد کرتے ہیں۔

اگر ان بنکوں کو روپیہ کی تنگی ہو تو وہ اپنی ہنڈیوں پر امپریل بنک یا دیگر تجارتی بنکوں کے ذریعہ دوبارہ بٹہ کٹوا لیتے ہیں

دیسی ساہوکار مشترک سرمایہ دار بنکوں کے زبردست حریف ہیں، کیونکہ وہ امانتوں پر بنکوں سے زیادہ شرح سُود ادا کرتے ہیں، اس لئے عوام کی امانتیں جدید مشترک سرمایہ دار بنکوں کی نسبت زیادہ تر انھیں کے پاس رہتی ہیں۔

ساہوکار شخصی ضمانت پر بھی قرض دیتے ہیں اور اُن کی شرطیں بڑے بنکوں سے نسبتاً بہت نرم ہوتی ہیں ساہوکاروں کو بڑے بنکوں کی نسبت اس لئے بھی زیادہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان سے چھوٹے چھوٹے تاجروں کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ بڑے بنک بڑے بڑے تاجروں اور کارخانہ داروں کے علاوہ کسی کو بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

غرض دیسی ساہوکار بڑے بنکوں اور تجارت پیشہ لوگوں کے درمیان ایک واسطہ کا کام دیتے ہیں۔ بنگلٹن کیبلی نے اس تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"جن لوگوں سے بڑے بنک کاروبار کرتے ہیں وہ بالعموم شہروں کے نیکنام اور مقدور صراف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ صرف اس وقت بنکوں کے پاس آتے ہیں جب وہ اپنا سرمایہ چھوٹے چھوٹے صرافوں کی ہنڈیاں خریدنے

ہیں لگا چکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے صرّاف جن کی ہنڈیاں بڑے صراف خریدتے ہیں غالباً اپنے سے کم درجہ کے مہاجنوں کی مالی امداد کرتے ہیں، اور وہ مہاجن معمولی بنیوں، غلہ فروشوں یا سُناروں کو ہنڈیوں پر روپیہ دیتے ہیں۔ مثلاً امرتسر کے کسی صرّاف نے لاہور کے کسی صراف کی لکھی ہوئی ہنڈی خریدی اب اُس نے اس ہنڈی کو کسی پریسیڈنسی بنک کے ہاتھ فروخت کردیا، اور اُسے بمبئی میں ادائگی کے لئے بھیج دیتا ہے۔'

جدید بنکوں کی موجودگی سے صرّافوں کے کاروبار پر چنداں اثر نہیں پڑا کیونکہ اُنھیں فلز یا Specie بھیجکر قرض نہیں لینا پڑتا۔ بلکہ صرف ہنڈیوں کے ذریعہ ان کا کام بن جاتا ہے۔ وہ تاجروں سے ہنڈی خرید لیتے ہیں اور بنک کی شرح سے کسی قدر زیادہ شرح پر بٹہ کاٹ کر شرح کے فرق کا منافع خود حاصل کرلیتے ہیں۔ ہنڈی کی بازاری شرح کلکتہ میں بنک کی شرح سے ۲ یا ۳ فیصدی اور بمبئی میں صرف ½ فیصدی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موخرالذکر مقام پر صرّافوں کے درمیان بہت زیادہ مقابلہ و مبارزہ ہے۔

جدید بنکوں سے اتحاد کی ضرورت

ملک کے مالی ذرائع اور قرض کے نظام کو ایک ضبط کے ماتحت لانے کے لئے اِس بات کی سختی سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ دیسی بنکوں کا مشترک سرمایہ دار بنکوں سے رابطہ واتحاد قائم کیا جائے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہندستان کے دیسی بنک تمام مالی نظام کا نوّے فیصدی حصہ ہیں لیکن تاحال اُن کا جدید بنکوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

مرکزی مجلس تحقیقات ساہوکاری[۱] نے اس باب میں مندرجہ ذیل سفارشات کی تھیں:-

(۱) جب ریزرو بنک قائم ہو جائے تو اُسے نہ صرف مشترک سرمایہ دار بنکوں کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ بلکہ ایسے دیسی بنکوں کو بھی اپنے ساتھ ملحق کرلینا چاہیئے جو صرافہ کا کام کرتے ہیں اور صرّافہ کے علاوہ باقی کام چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ریزرو بنک کو چاہیئے کہ ایسے تمام بنکوں کی ایک مصدقہ فہرست مرتب کرے، اور اُن کے کاغذات پر دوبارہ بٹہ کاٹنے کی سہولتیں بہم پہونچائے۔ بیز[؟] اصل کے لئے اُسے ایک معیار مقرر کردینا چاہیئے، اگرچہ یہ اُتنی زیادہ نہ ہونی چاہیئے جتنی کہ مشترک سرمایہ دار بنکوں کے باب میں ہوتی ہے۔ مزید براں اُسے اِن بنکوں کو حساب کتاب کے باقاعدہ رجسٹر رکھنے اور منظور شدہ آڈیٹروں سے اُن کی جانچ پڑتال کرانے پر مجبور کرنا اور خود بھی کبھی کبھی معائنہ کرنا چاہیئے۔

(۲) ریزرو بنک اور مشترک سرمایہ دار بنک اِن دیسی بنکوں کو چیکوں اور ہُنڈیوں کی رقم وصول کرنے کے لئے گماشتے بنا سکتے ہیں۔ لیکن انھیں شرح ترسیل اور ساہوکاروں کے رجسٹروں کے متعلق قانون شہادت

al . Central Banking Enquiry Committee 1929-30 Paras 139-145.

کی عام مراعات کے سوا کوئی مزید رعایت نہ دی جائے۔"

(۳) تمام وہ ساہوکار جو دیسی بنکوں کی شرطیں پوری کریں ان تمام مراعات کے حقدار سمجھے جائیں۔

(۴) جن دیسی بنکوں کے نام ریزرو بنک کی مصدقہ فہرست میں مندرج ہوں وہ مجوزہ "آل انڈیا بنکرز ایسوسی ایشن کے ممبر بن سکیں، جو تمام بنکوں اور بنک والوں پر مشتمل ہو اور اپنے ناموں کے سامنے ممبر آف دی سنٹرل بنکرز ایسوسی ایشن لکھ سکیں۔ ریزرو بنک کے نظام کے باہر جس قدر بنک یا بینکار ہوں انھیں Associate Members کا خطاب دیا جائیگا۔

اس کارروائی سے دیسی بنکوں کا معیار بلند ہو جائیگا اور اُن کی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔

مزید براں "انجمن صرافان بمبئی" کے نمونہ پر دیسی بنکوں کی انجمنوں کو بھی ترقی دینا چاہیئے۔

(۵) علاوہ بریں دیسی بنکوں کی بہبودی کے لئے مجلس تحقیقات نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی ہیں:۔

(ا) مقامی دیسی بنکوں کے کاروبار کو مشترک سرمایہ دار بنکوں کے ساتھ مدغم کرلیا جائے۔

(ب) جرمنی کے اُصول کمانڈٹ (Kommandit) کی بنا پر بنک قائم کئے جائیں۔ جس کی رُو سے بجائے کسی مقام پر اپنی شاخ کھولنے کے بنک وہاں کے ساہوکاروں کو اپنا شریک کار بنا لیتے ہیں اور مزید اخراجات کے بغیر مقامی ساہوکار کی واقفیت عامہ اور اُن کی غیر محدود ذمہ داری کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(ج) دیسی ساہوکاروں کی انجمن ہائے امداد باہمی بنائی جائیں جو اُن کی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹیں اور خود ہنڈیوں پر ریزرو بنک سے دوبارہ بٹہ کٹوالیں۔

(د) ہنڈی، دلالی کو دیسی بنکوں کے کاروبار کا جزو لاینفک قرار دیا جائے۔

خاتمہ پر مرکزی مجلس تحقیقات کے اراکین نے لکھا ہے کہ:۔

"دیسی بنکوں کو مذکورہ بالا تجاویز پر عمل کرنا چاہیئے اور اپنے فائدہ کے لئے جدید تجارتی بنکوں کے طریق عمل کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیئے اور حسابات کی پڑتال کرانا چاہیئے۔ بلوں اور چکوں کا عام استعمال ہونا چاہیئے۔ وصولی اور ادائیگی میں باقاعدگی ہونی چاہیئے، اور کل کاروبار قانون کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اگر ان باتوں پر عمل کیا جائے تو اُن کو ملک کی ساہوکاری میں مناسب جگہ مل سکتی ہے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ساہوکاروں وغیرہ کو کاروبار شروع کرنے کے لئے لائسنس لینا لازمی قرار دیا جائے لیکن اراکین تحقیقاتی کمیٹی کی کثرت رائے نے اسکی تائید نہیں کی، کیونکہ انکا خیال تھا کہ اس طرح لوگ ساہوکاری پیشہ سے منحرف ہو جائیں گے۔

— — —

یہ امر افسوسناک ہے کہ تاحال دیسی بنکوں کی ریزرو بنک میں شمولیت نہیں ہو سکی ہے۔ تاہم ریزرو بنک سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قیام سے تین برس کے بعد اس باب میں ایک رپورٹ مرتب کر سکے گا۔

راس چائلڈ کے سنہری اصول

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب دنیا کے نامور کروڑپتی راس چائلڈ کا انتقال ہوا تو اُن کے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکلا جس پر مندرجہ ذیل ہدایتیں لکھی تھیں :-

(۱) اپنے کاروبار کے ہر پہلو پر غور و خوض کرو۔

(۲) ہر کام کو مستعدی سے انجام دو۔

(۳) غور و فکر میں کافی وقت صرف کرو لیکن جو فیصلہ کرو وہ صاف اور مستقل ہو۔

(۴) ہمیشہ آگے ہی قدم بڑھاتے رہو۔

(۵) زندگی میں جو تکالیف پیش آئیں اُن کا بہادری سے مقابلہ کرو۔

(۶) اپنے کاروبار کے سلسلہ میں کبھی جھوٹ نہ بولو۔

(۷) اپنے شناساؤں کے حلقہ کو فضول نہ بڑھاؤ۔

(۸) جو کچھ تم واقعی ہو اُس سے زیادہ نمود و نمائش کرنے کی کبھی کوشش نہ کرو۔

(۹) اپنا قرض ہمیشہ بروقت ادا کرو۔

(۱۰) شراب خوری سے بچو۔

(۱۱) اپنا وقت اچھے طریقے سے صرف کرو۔

(۱۲) محض اتفاق یا قسمت کا آسرا نہ کرو۔

(۱۳) کبھی ہمت نہ ہارو۔

(۱۴) ہر شخص سے حسنِ اخلاق سے پیش آؤ۔

ترغیبِ غیب

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے)

ذرا کروٹ بدل اب ہندیِ زار ہوئی ہے روحِ عالم تجھ میں بیدار
دمِ تحلیل و وقتِ امتحاں ہے تری جانب نگاہِ آسماں ہے
محیطِ شش جہت ہے ابر باطل ہے غرقِ تیرگی دنیا کی محفل
سمومِ مادیت چل رہی ہے وہ گرمی ہے کہ دنیا جل رہی ہے
غبارِ خود پرستی چھا گیا ہے زمانہ بھر میں اِک طوفاں بپا ہے
یہ مغرب کی ہواؤں کا اثر ہے بشر بیگانۂ فرضِ بشر ہے
اسیرِ خود فریبی آدمی ہے حجابِ دیدۂ باطن خودی ہے
مآلِ زیست ہے ظاہر پرستی بشر کی زندگی ہے ننگِ ہستی
ہوا و حرص و آز ایمانِ دل ہے شقاوت اور قساوت جانِ دل ہے
ہوں اخلاقِ حسن یا دردمندی یہ سب ہیں داخلِ رجعت پسندی
بشر پیمانۂ سود و زیاں ہے متاعِ دل متاعِ رائگاں ہے
ترقی نام ہے بے دینیوں کا کلامِ حق میں نکتہ چینیوں کا
طریقوں میں ہے جس کے رنگِ الحاد اُسے کہتی ہے دنیا مردِ آزاد
سمجھتے ہیں اسے روشن خیالی کہ حسِ مذہبی سے دل ہو خالی
مآلِ زندگی سے بے خبر ہیں شہیدِ لذتِ گوش و نظر ہیں
نہاں ہیں جو نشاطِ روح دل میں سمجھتے ہیں ریاضِ آب و گل میں
یہ مجمل حالتِ اہلِ جہاں ہے زمیں کو جانتے ہیں آسماں ہے

نئی محفل نئے آئینِ ترتیب ہوئیں عریانیاں معراجِ تہذیب

اُڑی ہے طبقۂ نسواں سے غیرت
مزاجوں میں ہے بیباکی سفاہت

مدارِ زندگانیٔ زن و شو
وفادارانہ ہے ربط و لطفِ دِلجو
ق

وہ جانِ حُسن، اندازِ نسائی
غیورانہ وہ نازِ دِل رُبائی

خرابِ حسرتِ مردانگی ہیں
مکدّر سارے لطفِ خانگی ہیں

ہوس کی عشق پہ ہے حکمرانی
چلے ہیں ازدواجِ امتحانی

غرض ہر شے میں ہے رنگِ تجارت
وہ مذہب ہو کہ سامانِ معیشت

زمانہ ہے ملوکیّت سے بیزار
بساط اس کی اُلٹ دینے کو تیار

غریبوں کی مگر جاتی نہیں پیش
ہوئے ہیں متحد باہم جفاکیش

اُدھر قہرِ خدا سرمایہ داری
اِدھر مزدور کی بے اختیاری

غمِ فاقہ کشی سے ہو کے مجبور
مشینوں میں پسا جاتا ہے مزدور

خدا ترس و ضعیف و زار و بے زر
ہیں اہلِ مال کے رحم و کرم پر

وبالِ جاں ہوئی ہے زندگانی
ہیں خواہش مندِ مرگِ ناگہانی

مشینوں پر ہو نازل قہرِ جبّار
دھواں پھیلا ہوا ہے تیرہ و تار

دماغوں میں کثافت بھر گئی ہے
بجھا ہے دل طبیعت مر گئی ہے

یبوست آ گئی ہے آدمی میں
نہیں باقی لطافت زندگی میں

تفنگ و توپ پر کوئی ہے نازاں
اور اُس پر قہرِ عقلِ فتنہ ساماں

ڈھلا کرتے ہیں دن رات آلۂ حرب
سرِ کمزور ہے اور ضرب پر ضرب

دلیلش ایں اصولِ فتنہ خیز است
"حیاتِ جاوداں اندر ستیز است"

تماشا ہے کہ دعویدار پیکار
ہوئے ہیں امنِ عالم کے طلبگار

پئے امن و اماں کوشش بہم ہے
عجب یہ بھی ظریفانہ ستم ہے

یہ امن و راحتِ عالم کا چرچا
ہوائے ملک گیری کا ہے پردا

کہاں حرصِ ملوکیّت، کہاں امن!
کہاں افزایشِ قوت، کہاں امن!

جو حرصِ ملک گیری سر سے جائے
تو بے تدبیر دورِ امن آئے

ہوا میں اُڑ کے یہ کہتے ہیں مغرور
ہمیں حاصل ہے اب قدرت پہ مقدور
ہمیں تو مالکِ کون و مکاں ہیں
خداوندِ زمین و آسماں ہیں

کہیں ثروت ہے اور گمراہیاں ہیں
کہیں عسرت ہے اور جانکاہیاں ہیں
جواں ہو جا ارے او پیرِ ہندی
مٹا دے گمرہی اور مستمندی
بہت دن رہ چکا عزلت نشیں تو
ہلا دے پایۂ عرشِ بریں تو
بس اب پیغامِ گیتا یاد کر لے
دل و جاں حکمِ حق سے شاد کر لے
عمل کا وقت ہے وقفِ عمل ہو
نہ گوشہ گیرِ صحرا و جبل ہو
خدا کا نام لے میدان میں آ
دکھا دے کچھ اثر روحانیت کا
رہِ الفت میں سر دینا ہے تجھ کو
جہاں میں درد بھر دینا ہے تجھ کو
اُلٹ دینا ہے سارا کارخانہ
پلٹ دینا ہے تقدیرِ زمانہ
لگا کر آگ سینہ میں تڑپ جا
دکھا دے ہاں محبت کا کرشمہ!
تری رگ رگ میں نشتر کی خلش ہو
ترے دل میں قیامت کی طپش ہو

اُٹھا دے امتیازِ دین و ملت
رہِ حق ہے مساوات و محبت
ترے سینہ میں وحدت جلوہ گر ہے
ترے دل میں محبت کا شرر ہے
بنا لے شعلۂ غم اس شرر کو
جلا لے سینہ و قلب و جگر کو
تری رگ رگ سے وہ شعلے ہوں روشن
جو انوارِ صداقت کا ہوں مخزن
گرا کر برقِ الفت طور ہو جا
سراپا نار ہو کر نور ہو جا
لگا دے آگ دنیا میں لگا دے
جلا دے خرمنِ باطل جلا دے
جہاں جنگ و جدل سے پاک ہو جائے
تفنگ و توپ جل کر خاک ہو جائے
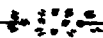
فروغِ عشق ہے قربانیوں میں
بقا ہے سوختہ سامانیوں میں
محبت امتحانِ قلب و دیں ہے
محبت ابتلائے آتشیں ہے
ترا دل واقفِ رسمِ کہن ہے
جزائے عاشقی دار و رسن ہے

ستم سارے جہاں کے اب اٹھا لے دل و جاں نوکِ پیکاں پر لگا دے

عیاں ہیں تجھ پہ رمز و رازِ ہستی ترا سینہ ہے لوحِ حق پرستی
ترے دل میں ہیں مخفی کرشن اور رام تجھے از بر ہے آنحضرت کا پیغام
ملا دے سازِ ناقوس و اذاں کو جگا دے نعرۂ حق سے جہاں کو
دکھا دے شانِ حق باطل نہیں ہے سرائے آب و گل منزل نہیں ہے
نگاہِ شوق کی منزل بدل دے غلامِ مادمن کا دل بدل دے
بدلنا قلب کا آساں نہیں ہے یہ کارِ رستم و دستاں نہیں ہے
یہاں بیکار ہیں آلاتِ پیکار یہاں درماندہ ہیں افکارِ عیار
یہاں ہے قوتِ اخلاق درکار اہنسا، ضبطِ نفس و جوشِ ایثار
تری گھٹی میں یہ جوہر پڑے ہیں قسم رب کی ترے رتبے بڑے ہیں
تو ہی ہے دین کا دنیا میں پیکر تصدق دہر تیری خاکِ پا پر
تری تہذیب قدرت کر چکی ہے فنا کا رنگ تجھ میں بھر چکی ہے
ازل سے تو ہے ناکامِ تمنا چڑھا دل پر نہ تیرے رنگِ دنیا
نہیں غیظ و غضب کا تو گنہگار کہ صدیوں سے نہیں کھینچی ہے تلوار
نہ تیغ و نیزہ تیرے ہات میں ہے نہ تلخی اور تیزی بات میں ہے
چلا ہے تو تو آغوشِ بلا میں مٹا ہے راہِ تسلیم و رضا میں
کہاں تو اور کہاں ابنائے ہستی کہاں عشق اور کہاں دنیا پرستی
کوئی اس کام کے شایاں نہیں ہے سوا تیرے کوئی انساں نہیں ہے
نگاہیں جانبِ عرشِ بریں رکھ یقیں رکھ قدرتِ حق کا یقیں رکھ
نشانِ سجدہ ہے تیری جبیں پر لرز جائے گی روحِ فتنہ و شر
معطل آلۂ پیکار ہوں گے قدم رکھ راستے ہموار ہوں گے

تری صورت سے کٹ جائیگا باطل
مثالِ ابر چھٹ جائے گا باطل

حضرت اثر عظیم آبادی

از سید رضا قاسم ناظم انجمن ترقی اردو جیلا حسین آباد (بہار)

حسنِ معشوق سے بھی حسنِ سخن ہے کمیاب
ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی (صفیر بلگرامی)

شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب اثر (فیلو پٹنہ یونیورسٹی) سترھویں اگست ۱۸۴۹ء کو بمقام سالار پور ضلع پٹنہ (عظیم آباد) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حکیم سید محمد حسن[1] صاحب بنارسی اور مولوی سید گل صاحب جلال آبادی سے حاصل کی۔ آپ کی اوائل عمر کا زیادہ حصہ نیورا (ضلع پٹنہ) میں گزرا لیکن آخر عمر میں بمقام آگیلہ (ضلع گیا) سکونت اختیار کر لی تھی جہاں سترھویں اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پچاسی۸۵ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

آپ نے ضلع شاہ آباد کے صدر مقام شہر آرہ کی عدالتوں میں تھوڑے دنوں وکالت کی تھی، مگر ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر وکالت چھوڑ دی۔ بات یہ ہوئی کہ ایک روز عدالت فوجداری میں کسی ایسے ملزم کی طرف سے پیروی کر رہے تھے جو واقعی بالکل ہی بے قصور تھا۔ لیکن باوجود انتہائی کد و کاوش وہ مجرم قرار پا کر عدالت سے سزایاب ہو گیا۔ آپ پر اس کا اس قدر اثر ہوا کہ اس بدقسمت شخص سے گلے مل کر بےحد روئے اور اپنے پیراہنِ وکالت کو وہیں احاطۂ عدالت میں تار تار کر دیا اور اس پیشے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔

موصوف پٹنہ کالج میں علوم مشرقیہ کے پروفیسر بھی مقرر ہوئے تھے اور اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے آپ کو شمس العلما کے خطاب سے سرفراز فرمایا، مگر کچھ دنوں بعد آپ اس خدمتِ جلیلہ سے بھی مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد آپ سورج پورہ (ضلع شاہ آباد) کی ریاست میں کچھ عرصہ کے لئے بہ حیثیت منیجر بھی مامور رہے تھے۔

---

[1] حکیم صاحب مذکور الصدر ضلع سارن کے صدر مقام شہر چھپرہ میں سکونت پذیر تھے اور وہیں طبابت کرتے تھے موصوف کے صاحبزادے حکیم سید محمود الحسن صاحب مرحوم عرف حکیم ملا صاحب کا صوبۂ بہار کے مشہور حاذق الطبا میں شمار تھا۔ حضرت اثر کے والد بسلسلۂ ملازمت بہت عرصہ تک شہر چھپرہ میں مقیم رہے تھے اسی وجہ سے موصوف کو حکیم صاحب مذکور سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دستیاب ہوا۔

بہرحال آپ کا شمار مغتنمات زمانہ سے تھا۔ والد کی طرف سے آپ کا شجرۂ نسب سید زیدی الواسطی تھا اور ماں کی جانب سے آپ موسوی رضوی نیز زیدی تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ حضرت سید ابوالفرح زیدی الواسطی حضرت زید شہید کی نسل سے ایک مشہور بزرگ تھے۔

حضرت آثر کے خاندان میں بہت سے اعلیٰ مرتبت بزرگ گزرے ہیں جن میں سے یہاں پر بعض حضرات کا ضمناً ذکر بے جا نہ ہوگا۔

(۱) نواب امیر نوزرا حاجی محمد سعید خاں فیروز جنگ۔ عہد شاہجہاں اور عہد عالمگیر میں چالیس سال تک وزیر اعظم رہے۔

(۲) نواب سید عتیق اللہ خاں۔ عہد عالمگیر میں صوبہ دار اٹاوہ تھے اور تا زندگی اسی منصب جلیلہ پر سرفراز رہے۔ قصبہ نوشہرہ جو اٹاوہ کے قریب واقع ہے موصوف ہی کا بسایا ہوا ہے۔

(۳) نواب سید نجم الدین۔ آپ کو شہنشاہ اکبر ثانی نے خلعت و دیگر اعزاز سے سرفراز فرمایا تھا۔

(۴) نواب سید حسن عسکری۔ دہلی میں بخشی فوج تھے۔

عہد مغلیہ کے بعد بھی حضرت آثر کے بہت سے بزرگ حکومت برطانیہ میں ممتاز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے ہیں، مثلاً خان بہادر نواب میر مرادن علی بمقام بھبھوا ضلع شاہ آباد بعہدۂ عامل مامور رہے۔ علاوہ ان کے موصوف کے بزرگوں میں خان بہادر سیر سلامت علی خاں، میر راحت علی خاں، سید فریدالدین وغیرہ بزمانۂ حکومت ملکہ وکٹوریہ آنجہانی مناصب جلیلہ پر ضلع مونگیر میں فائز ہوئے۔ حضرت آثر کے دادا میر امداد علی خاں بھی اسی زمانہ میں ضلع مونگیر میں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ آپ کے والد ماجد خان بہادر شمس العلما سید و حیدالدین مرحوم ابن میر امداد علی خاں اولاً مجسٹریٹی اور بعدۂ بعہدۂ جج فائز ہوئے تھے۔ محتشم و جلیل القدر بزرگوں کے علاوہ بہتیرے ذی علم، اوصاف منتخبہ و اخلاق حمیدہ سے متصف

---

[۱] حجاج بن یوسف ثقفی نے دجلہ سے پچیس چھبیس میل کے فاصلے پر شط العمی کے کنارے ۸۳ھ ہجری میں شہر واسط کی بنا ڈالی جسکی تعمیر میں نوے لاکھ درہم صرف ہوئے تھے چار سال کی مسلسل کوشش سے ۸۶ھ ہجری میں اسکی تکمیل ہوئی اور چونکہ یہ مقام بصرہ، اہواز اور بغداد تینوں شہروں کے سولہ سولہ فرسخ کے مساوی فاصلے پر واقع ہے اس لئے اس کا نام واسط رکھا گیا۔ یہ شہر اپنے بے چھت کے قید خانہ کی وجہ سے جس میں حجاج بن یوسف کے تیس ہزار سیاسی قیدی رہا کرتے تھے بہت مشہور ہے۔ شہر ابتک موجود ہے مگر اب نہ وہ رونق ہے اور نہ اتنی آبادی۔

[۲] آپ نے عاملان مدینہ کے ظلم و جور سے مدینہ کی سکونت کو خیرباد کہا اور واسط میں آکر آباد ہو گئے، جہاں آپ خوشحالی، فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ ممدوح بہت بڑی فہم و فراست کے مالک اور سیاست میں شہرۂ آفاق تھے۔ کچھ دن بعد امیر کوفہ اور رئیس بصرہ سے بگاڑ ہو گیا تو آپ مع چار فرزندوں کے غزنی چلے گئے۔ مگر یہاں کی آب و ہوا کی ناموافقت سے مجبور ہو کر اپنے چھوٹے صاحبزادے مسمّی معزالدین کے ہمراہ پھر واسط کی جانب مراجعت فرمائی۔ آپ کے بقیہ تین صاحبزادوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور بعہد محمود غزنوی وارد ہند ہو کر یہیں سکونت اختیار کر لی اور اس وقت جتنے بھی زیدیہ حضرات ہندوستان میں موجود ہیں وہ سب انھیں تینوں بھائیوں کی نسل سے ہیں۔

حضرات بھی آپ کے خاندان میں ایسے گزرے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ناگزیر ہے۔ مثلاً مولوی سید فرزند علی و مولوی سید عبدالوہاب وغیرہ۔ یہ مغتنم ہستیاں انسانیت، علمیت، دانشمندی، فرزانگی، ذہانت سخاوت و شجاعت میں یکتائے روزگار گذری ہیں۔

حضرت اثر نے سولہ سال کی عمر سے اشعار کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے کسی بزرگ کی فرمائش پر پہلے پہل مندرجہ ذیل دو شعر موزوں کئے تھے ؎

کیا شب ظلم کو ہے صبح مکافات نہیں — آخر اے شمع یہ پروانے بھی جاں رکھتے ہیں

دہر میں کہتا ہے ناقوس آ وازِ بلند — سنگدل ہیں جو نہیں عشق بتاں رکھتے ہیں

حضرت اثر مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کو ریاضی معدنیات، علم حیوانات، مناظرہ فلسفۂ جدیدہ و قدیمہ میں بڑا شغف تھا جس کے ثبوت میں آپ کی عالمانہ تصنیف مرآۃ الحکما اب تک موجود ہے۔ مگر ہمارے قدر ناشناس ملک نے اس کی قدر نہ کی، حالانکہ یورپ میں اس کی اتنی ہی قدر افزائی ہوئی کہ شاہ سوڈن اور ناروے نے اس کے تراجم اپنی زبانوں میں کرا کے کرچھپا اور اسٹاکھولم کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کرلئے۔

نواب صاحب مرحوم کثیر المذاق بزرگ تھے۔ بالخصوص فنِ طبابت میں بڑی مہارت رکھتے تھے نصف صدی تک اس فن کے ذریعہ خلق خدا کی خدمت انجام دیتے رہے۔ علاوہ بریں آپ نہ صرف اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے بلکہ اکثر آپ نے انگریزی اشعار بھی نظم کئے۔ چنانچہ آپ کی تصنیف کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن آپ کی حیرت انگیز شاعرانہ قابلیت کی روشن دلیل ہے۔ متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں اردو۔ فارسی۔ عربی۔ چینی۔ جاپانی۔ مصری۔ یونانی۔ لاطینی۔ جرمن۔ انگریزی۔ سنسکرت اور بھاشا کی شاعری پر عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ حضرت اثر کی شاعری کا ایک خاص رنگ تھا۔ فطری جذبات، محققانہ مسائل، عاشقانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں بیان کرنا آپ کا حصہ تھا۔ اسی کے ساتھ آپ بلند پروازی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، مگر غزل سرائی میں احاطۂ غزل گوئی سے کبھی باہر قدم نہ رکھتے تھے۔ آپ کا ہر شعر جذبات کا آئینہ دار ہے۔ میر ذوق۔ غالب۔ مومن۔ انشا۔ ناسخ۔ آتش وغیرہ ہر استاد کے رنگ میں غزلیں لکھ دیتے تھے اور وہی ترکیبیں، وہی بندش، وہی اندازِ بیان، وہی نشست الفاظ، وہی جذبات گویا سب کچھ وہی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر بعض اساتذہ کے رنگ کے اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) میر کا رنگ: یہاں تک بتوں نے ستایا ہمیں — کہ آخر خدا یاد آیا ہمیں

مسلماں کا مُردہ جلاتے نہیں
گر تو نے زندہ جلایا ہمیں

اثر شکل اپنی ہوئی میر کی
رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں

(۲) غالب کا رنگ ؎

جفا پرور سے اُمید وفا کیا
عدو کے جور کا مجھ سے گلہ کیا

سیاہ بن طالع نیکو چہ معنی
شکایت ہائے بخت نارسا کیا

اثر موہوم ہے مضمونِ ہستی
نہیں معلوم ہے کیا اور تھا کیا

(۳) مومن کا رنگ ؎

نالے! کس منہ سے تو دعوائے اثر کرتا ہے
وہ تو ہنس ہنس کے سوئے غیر نظر کرتا ہے

دل شکن باز بھی آ فکرِ شکستِ دل سے
کس کا جلوہ دلِ عاشق میں گذر کرتا ہے

کس کا آزار کشیدہ ہے کہ راتوں کو اثر
نالے کرتا ہے تو سو ٹکڑے جگر کرتا ہے

(۴) سودا کا رنگ ؎

جادوئے چشم سے ہمیں دیوانہ کر دیا
اس میں قصوروار ہے تو فتنہ گر کہ ہم

کوئی گل دیدہ ہے گلزار میں کہ تو
فریاد کش ہے بلبلِ شوریدہ سر کہ ہم

کہتے نہ تھے کہ دل کا لگانا عذاب ہے
اب بے قرار ہجر میں تم ہو اثر کہ ہم

(۵) ناسخ کا رنگ ؎

نظر آئے گی تجھ کو حق پرستی مے پرستی میں
کسی دن دیکھ لے زاہد تماشا بزم رنداں کا

کسی کی دید پر موقوف اپنی زیست ہے ناصح
مرا تارِ نظر انداز رکھتا ہے رگِ جاں کا

نشانِ نقشِ قدم کا بھی نہ پایا تا دمِ آخر
عبث ہم نے کیا پیچھا اثر عمرِ گریزاں کا

(۶) انشا کا رنگ ؎

لبِ بام آ کے دکھلا دو تماشا طور کا تم بھی
بڑے عرصہ سے در پر طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

اثر کیوں کر نہ جانوں اس کے در کو قبلۂ عالم
اسی جانب کئے رخ کافر و دیندار بیٹھے ہیں

(۷) مصحفی کا رنگ ؎

آنکھوں میں جو ہے عکس تری جلوہ گری کا
آئینہ ہے رو کش مری حیراں نظری کا

دل پر جو گذرتی ہے اثر کیوں نہیں کہتے
آخر کوئی باعث تو ہے آنکھوں کی تری کا

(۸) آتش کا رنگ ؎

شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب اثر

۱۷–اگست سنہ ۱۸۴۹ع — ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ع

چاہِ بابل میں ابھی تک دو فرشتے ہیں اسیر
واقعی کیا ہی بلا ہے حسن آدم زاد کا
مبتلائے غم بہت تھا مر گیا شاید اثر
شور ہے اغیار کے گھر میں مبارکباد کا

(۹) وحید الہ آبادی کا رنگ سے

تمھیں مبارک ہو شیخ صاحب بڑھاپے میں یوں جوان بننا
ہائے چہرے پہ جھریاں ہیں، خضاب ہم نے کے کیا کریں گے
خدا کی بخشی ہوئی ہے وقعت اثر نہیں کوئی ایسی نعمت
ملی ہے جب عزتِ سیادت خطاب ہم لے کے کیا کریں گے

(۱۰) ذوق کا رنگ سے

خدا کہہ کر پکاریں بے خودی میں
تو ہم نے تمھیں اتنا نہ پایا
بہت ہشیار سنتے تھے اثر کو
مگر ہم نے اسے دیوانہ پایا

(۱۱) جلال لکھنوی کا رنگ سے

تماشا ہم جو دکھلائیں بہارِ غم کا اے گلرو
لہو بیشم غنادل سے چمن میں چار سُو ٹپکے
اثر یوں تو رہے خاموش ہم آنکھیں کیے نیچے
مگر آنسو کے قطرے سن کے اُن کی گفتگو ٹپکے

(۱۲) آزردہ دہلوی کا رنگ سے

مرغانِ قفس مرگئے دم بھر میں پھڑک کر
کیا لائی صبا جا کے چمن سے خبر ایسی
ہے تیر کے انداز کو خستہ جگری شرط
ہاں پائی ہے اک تم نے طبیعت اثر ایسی

(۱۳) نصیر دہلوی کا رنگ سے

مرغ جاں تن کے قفس سے مائلِ پرواز ہو
ٹوٹ جائیں جس گھڑی تارِ نفس کی تیلیاں
ہے تمنا کس قدر مجھ کو اسیری کی اثر
چھینتا ہوں آپ ہی اپنے قفس کی تیلیاں

(۱۴) رند کا رنگ سے

جب قلق بڑھتا ہے اپنے دل کو یہ کہتا ہوں میں
سیر گلشن کے لئے آتا نہ اے ناداں ترس
ہے اسیری میں اثر وردِ زباں یہ قول رند
دل گرفتہ ہوں مجھے یکساں ہے گلزار و قفس

اِس میں شک نہیں کہ حضرت اثر کی شاعری پر متعدد شعراء کے طرز کلام کا اثر پڑا ہے جو نمایاں طور پر متذکرہ بالا مثالوں سے عیاں ہے، نیز خود ممدوح کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقریباً کل اساتذہ کی قابلیت کے معترف اور قدر داں تھے جس کے ثبوت میں آپ کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں سے

دشمن نہ ذوق کا ہوں نہ ناسخ کا دوست ہوں
عادت نہیں کہ چھیڑ نکالوں کوئی طرح

غالب کو مانتا ہوں کہ استاد دہر تھا
کافر ہوں اسمیں ہو جو مجھے شک کسی طرح

لیکن اثر جو دیدہ حق بیں سے دیکھئے
کوئی غزل سرا نہ ہوا میر کی طرح

لیکن اگر سچ پوچھئے تو اثر کے کلام میں شدت کے ساتھ میر کا اثر پایا جاتا ہے، جس کی تصدیق خود ان کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

جان کر میر کا کلام اثر
لوگ تیرا کلام لیتے ہیں

اثر کا ایک اور شعر ہے جس میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کا مزاج حضرت آتش کی طرح ہے، یعنی

جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھا اور لڑکوں میں لڑکا،

بہرحال حضرت اثر مرحوم صرف شاعر ہی نہیں بلکہ شاعری کے حکیم تھے، جس کی تصدیق حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے قول سے ہوتی ہے۔ حضرت اکبر کا قول تھا کہ "نواب صاحب کا شمار شعرا میں نہیں کیا جا سکتا ممدوح شاعری کے حکیم ہیں،" واقعی حضرت اکبر کا قول اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ حضرت اثر کی شاعری خزانۂ حکمت کا حکم رکھتی ہے۔ آپ اپنے اشعار میں بڑی آسانی کے ساتھ مشکل علمی مسائل کو بیان کر دیا کرتے تھے۔ آپ کی سخن سنجی ایک غیر معمولی انداز رکھتی تھی، سادگی کے ساتھ فصاحت کلامی ہمیشہ سے مخصوص رہی۔ غزل سرائی کے سے نازک فن میں فطری جذبات، محققانہ مسائل، عاشقانہ واردات قلبیہ کو جس بے ساختہ پن کے ساتھ آپ نے ادا کیا ہے اس کو کسی اہل دل سے پوچھئے ہر حالت حجابیہ کو جذبات مقناطیسی کی طرح حقیقت کی طرف کھینچ لینا، آپ کی طبیعت میں داخل تھا۔ آپ کی غزل سرائی واقعی قابل توجہ ہے۔ سوز و گداز اور نشتریت کی کیفیتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ بلند پروازی جو غزل سرائی کی جان ہے آپ کی شاعری سے کہیں جدا ہوتی نظر نہیں آتی۔ دنیا کی بے ثباتی، عاشقوں کی فریاد، معشوقوں کی بے مہری، رندوں کی زندہ دلی، زاہدوں کے نصائح، مردانِ خدا کی پابندیٔ تسلیم و رضا وغیرہ، الغرض ہر قسم کے خیالات آپ کے کلام میں اس درجہ بصیرت افروز ہیں کہ اگر مختلف اساتذہ کے دواوین کی ورق گردانی کی جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ آپ کا سارا دیوان بلند پایہ مضامین سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی شعر پایۂ تہذیب سے گرتا یا پست خیالی کی طرف بھی رخ کرتا نظر نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ آپ کا کلام ایسے لوگوں کے لئے یقیناً جاذب توجہ ہے جو حکیمانہ مذاق کے ساتھ وارداتِ قلبی سے بھی باخبر ہیں۔ خود فرماتے ہیں

جہاں کو دیکھتا ہوں اک نظر سے
جو بیگانہ ہے وہ بھی آشنا ہے

اب حضرت اثر کی بدیہہ گوئی کے متعلق بھی چند سطریں حوالۂ قلم کرنا بیجا نہ ہوگا، کیونکہ اس سے موصوف کی ذہانت اور طبع رسا کا حال منکشف ہوگا۔

بارش کا موسم اور شام کا جھٹ پٹا وقت تھا، حضرت اثر کے ساتھ اُن کے چند نکتہ سنج احباب بھی بیٹھے تھے۔ شفق کی سُرخی فلکِ دوّار پر نمایاں تھی اور چاند بھی دُور سے نظر آ رہا تھا کہ حاضرین میں سے کسی نے آتش کا یہ مطلع پڑھا ؎

پاؤں زنداں سے نہ نکلا ترے سودائی کا | داغ دل ہی میں رہا لالۂ صحرائی کا

سارا مجمع پھڑک اُٹھا، حضرت اثر نے چند منٹ کے سکوت کے بعد مندرجہ ذیل مطلع موزوں کرکے پڑھا جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ؎

داغِ دل اشک سے چمکا ترے سودائی کا | رنگ بارش سے کھلا لالۂ صحرائی کا

ایک دفعہ اثر کے سامنے کسی نے میر کا یہ مطلع پڑھا ؎

ہوشیارانہ عجب دیوانوں نے تدبیر کی | اُسکے کانوں تک صدا پہونچا ہی دی زنجیر کی

آپ اس مطلع کو سُنکر بے چین ہوگئے اور چند دقیقوں کے بعد فی البدیہہ یہ مطلع موزوں کرکے پڑھا ؎

پائے مجنوں نے زبانِ حال سے تقریر کی | ہل گیا لیلےٰ کا دل سُنکر صدا زنجیر کی

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں پر آپ کی آخری عمر کا ایک قطعہ بھی درج کر دیا جائے جس کی خوبیاں احاطۂ بیان سے باہر ہیں، اور جو بہر طور میر کی یاد تازہ کر دیتا ہے، ملاحظہ ہو ؎

وہ چمن اب خزاں رسیدہ ہے | بُلبلوں کا جہاں ترانہ تھا
سنتے ہیں وہ شجر بھی سوکھ گیا | جس پہ صیّاد آشیانہ تھا

قبل اس کے کہ حضرت اثر کی شاعری کے بیان کو ختم کیا جائے ناظرین کی آگاہی و تفننِ طبع کے خیال سے موصوف کے دو قطعے جو خوبیٔ مزاج و ناہمواریٔ مزاج کے متعلق ہیں، نیز چند متفرق اشعار ذیل میں درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

کیونکر نہ ایسے یار پہ جاں کیجئے نثار | کیا دل ہے کیا دماغ ہے پایا ہے کیا مزاج
دارین میں مفید ہے خوبی مزاج کی | اچھا وہی رہا جسے اچھا ملا مزاج

دنیا ہی میں عذاب کا رہتا ہے سامنا | انساں کے واسطے ہے جہنم بُرا مزاج
یہ ضد، یہ ہٹ، یہ چھیڑ، الٰہی تری پناہ | جیسا کہ اب ہے آپ کا ایسا نہ تھا مزاج

عین وقتِ دید مجنوں کو ہوا کیا اضطراب
اشتیاقِ روئے لیلےٰ پردۂ محمل ہوا

میں حصولِ رزق میں قائل نہیں تدبیر کا
سامنے آ ہی گیا لکھا میری تقدیر کا

ہے دلیلِ مرگ انساں کو سفیدی بال کی
اے اخترؔ معلوم ہے انجام جوئے شیر کا

چشمِ بیمار کسی کی جو اخترؔ یاد آئی
ہم عیادت کو گئے نرگسِ بیمار کے پاس

اپنے مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی
قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلےٰ ہو کر

جنگل جنگل، صحرا صحرا، مارے مارے پھرتے ہیں
آہوئے وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

سُن کے نیند آئی نہ تھی جسکو اخترؔ ساری رات
تم نے پھر چھیڑ دیا آج اُسی افسانے کو

ہے پیامِ مرگ میں مضمر نویدِ زندگی
تا بقا کی شکل پیدا ہو فنا ہو جائیے

علاوہ شاعری کے حضرت اخترؔ اعلیٰ درجے کے نثرنگار اور انشا پرداز بھی تھے، چنانچہ اس کے ثبوت میں آپ کی چند تصانیف کا ذکر درج ذیل کیا جاتا ہے :-

کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن۔ یہ کتاب اصنافِ سخن کے متعلق ... ایسی لکھی ہے جو متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور جس کا حوالہ جا بجا شعر الہند میں بھی دیا گیا ہے

معیار الحق۔ علم کلام کی کتاب ہے۔

مرأۃ الحکما۔ فلسفہ و حکمت سے متعلق ہے، یہ وہی کتاب ہے جو یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر سویڈن اور ناروے کی یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے۔

کیمیائے زراعت۔ فنِ زراعت سے متعلق ہے۔

مصباح الظلم
مناظر المصائب } یہ دونوں کتابیں علم مناظرہ میں ہیں اور ممدوح کی مذہبی معلومات ...

رسالۂ طاعون۔ فنِ طب سے متعلق ہے۔
کتاب الاثمار۔ فنِ باغبانی کی کتاب ہے۔
فسانۂ ہمت۔ یہ ایک تاریخی فسانہ ہے جو سولھویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔
سوانح مخدوم الملک بہاری۔ بزبانِ انگریزی، تاریخ و سیرت سے متعلق ہے۔
علاج الفیل۔ اس میں فنِ فیلبانی کا بیان ہے۔
ہدیۂ قیصریہ و دیوان اثر وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔
غرض آپ نے مختلف علوم پر کتابیں تصنیف کرکے اپنی ہمہ دانی اور کثیر المذاقی کا ثبوت دیا ہے۔
بہرصورت آپ اردو اور فارسی میں فاضل متبحر اور زبان انگریزی پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیف سیرت حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین بہاری" آپ کی انگریزی دانی کا قابل قدر ثبوت ہے آپ علم روحانیات و علم فلکیات میں بھی مہارت تامہ اور عربی و لاطینی میں قابل قدر دستگاہ رکھتے تھے بزید برآں فنون شکار و باغبانی میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ چنانچہ بمقام نگینہ ضلع گیا دو باغ خاص آپ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے موجود ہیں۔ آپ اعلیٰ درجہ کے شکاری اور ایک بہترین نشانہ باز تھے۔
آپ صد درجہ خوش طبع واقع ہوئے تھے، اور سیر چشمی و قناعت کے اوصاف سے بھی بدرجۂ اتم متصف تھے تازندگی کسب حلال سے حصولِ رزق کے پابند رہے۔ آپ کو شہرت طلبی کی طرف مطلق میلان نہ تھا بلکہ گمنامی اور گوشہ نشینی مرغوب تھی۔ افزائش جاہ و ثروت کی بھی تمنا نہ تھی۔ اور صابر و شاکر رہنا آپ کا مخصوص شیوہ تھا۔
باوجود انتہائی قابلیت و قادر الکلامی کے اپنے کو شاعر نہ سمجھتے تھے۔ اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے اور شاعری سے کیا مطلب۔ کبھی دادطلبی کے خواہاں نہیں ہوئے، جیسا کہ آپ مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

ہے نہ پروائے ستایش نہ غمِ نفریں ہے　　نغمہ سنجی سے خیالِ طلب داد نہیں

آپ کے والد ماجد خان بہادر شمس العلماء سید وحید الدین صاحب مرحوم عقائد تفضیلیہ کے پابند تھے جیسا کہ اُن کی کتاب "قد تحقیق" سے ظاہر ہوتا ہے، مگر حضرت اثر کا مسلک شیعہ اثنا عشری تھا اور تازندگی اُسی مسلک پر قائم رہے، چنانچہ آپ کی تصانیف "مصباح الظلم" اور "مناظر المصائب" وغیرہ آپ کے مذہبی عقائد کی مستند دلیل ہیں۔
آپ کی علمی قابلیت اور خاندانی وقار کی بدولت گورنمنٹ نے پہلے شمس العلماء اور بعد کو نواب کے خطاب

سے سرفراز فرمایا تھا۔ مگر نواب صاحب مرحوم نے گورنمنٹ کے ان اعزازوں کو اظہارِ افتخار کا ذریعہ نہ بنایا۔

آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی عنفوانِ شباب میں جسٹس شرف الدین کی بڑی بہن سے ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے ایک لڑکی (جو مولوی سید عبدالمجید صاحب مرحوم وکیل سے بیاہی گئی تھیں) ہنوز بحالتِ بیوگی [illegible] میں موجود ہیں، اور دو لڑکے نہایت لائق اور عہدہ ہائے عالی و مناصب جلیلہ پر فائز ہو، مگر افسوس انھوں نے یکے بعد دیگرے آپ کی زندگی ہی میں انتقال کیا۔

فرزند اکبر مسٹر سید علی امام[1] بار ایٹ لا ایک نیک نام و کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ بہ حیثیت مشیر قانون حضور وائسرائے ہند فائز رہے اور دولت آصفیہ کی وزارت عظمیٰ پر بھی سرفراز ہوئے۔

فرزند اصغر مسٹر سید حسن امام[2] کچھ دنوں کلکتہ ہائیکورٹ کی ججی پر فائز رہے، بعدہٗ اپنے وقت کے ممتاز ترین ماہر قانون تھے، اور تمام زندگی ایک نہایت کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے پٹنہ ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے رہے۔ آپ قومی کاموں میں بھی نہایت دلچسپی لیا کرتے تھے، اور سنہ ۱۹۱۸ء کے خاص اجلاس کانگریس کی صدارت کا فخر بھی آپ کو نصیب ہوا۔

حضرت اخترؔ نے دوسری شادی بہ عمر ساٹھ سال ضلع گیا کے ایک پرانے رئیس خاندان میں کی تھی جن کے بطن سے چار لڑکے حسین امام، کاظم امام، عابد امام، صادق امام، اور چار لڑکیاں ہوئیں جن میں سے حسین امام و کاظم امام اور دو لڑکیوں نے آپ کی زندگی ہی میں انتقال کیا۔

اگرچہ حضرت اخترؔ ایک خوشحال خاندان کے بزرگ تھے مگر آپ ہمیشہ دنیا کو اصلی معنوں میں دارالحزن سمجھتے رہے۔ چنانچہ حسین امام[3] کی قبل از وقت موت سے آپ کی دلی گرم جوشی مبدّل بہ غم و رنج ہوگئی تھی۔ آپ پر اس فرزند کی موت کا اس قدر اثر ہوا کہ اکثر مندرجہ ذیل شعر آپ کے وردِ زبان رہا کرتا تھا؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے　　ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

---

[1] آپ کی پیدائش ۱۱۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو ضلع پٹنہ کی مردم خیز بستی نیورا میں ہوئی تھی۔ موصوف نے سنہ ۱۹۳۲ء میں بوقت صبح رانچی میں انتقال کیا۔ اور اپنی وصیت کے مطابق وہیں اپنی کوٹھی کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔

[2] آپ نے ۱۹۔ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء کو صبح کے وقت پٹنہ میں انتقال کیا اور اپنی وصیت کے مطابق اپنی زمینداری موضع دیوری میں جپلا حسین آباد سے تقریباً ڈیڑھ میل دور جپلا سیمنٹ فیکٹری کے قریب مدفون ہوئے، جہاں آپ کے مزار کا گنبد دنیا کی بے ثباتی کا مرثیہ اپنے زبان حال سے پڑھتا ہوا دور سے نظر آتا ہے۔

[3] اس لڑکے نے ساڑھے نو سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اتنی ہی قلیل عمر میں اس نے بعید علمی ترقی حاصل کرلی تھی، خصوصاً علم فلکیات میں تو اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ حضرت اخترؔ کے یوروپین احباب اسے "اسٹرانومر" کہا کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت اثر مختلف النوع خوبیوں کے بزرگ تھے۔ آپ ایک شیوہ بیان اور سحر فن شاعر، ایک جادو طراز ادیب، ایک حاذق طبیب، ایک بالغ نگاہ نقاد اور ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ کی ذات پر صوبۂ بہار کے ادبی حلقوں کو ناز تھا اور آپ کی موت سے صرف صوبۂ بہار ہی کو نہیں بلکہ ساری اردو دنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔

فروغ شمع جواب ہے، رہے گا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

رسالہ "بھوگول" کا "بال سنسار نمبر"

خاص خاص علمی موضوع کے متعلق ہندی میں کئی مفید رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ "بھوگول" الہ آباد بھی اسی قسم کا دلچسپ رسالہ ہے، جسمیں جغرافیہ اور سیر و تفریح کے متعلق محققانہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حال میں اس مفید رسالہ نے اپنی چودھویں سالگرہ کے موقع پر بال سنسار کے نام سے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جسمیں اکیس یا گیارہ ممالک کے باشندوں کے حالات دلچسپ پیرایہ میں دیے گئے ہیں۔ ہر ملک کا ایک فرضی لڑکا نے لیا گیا ہے اور پیدائش سے لیکر جوانی بلکہ بڑھاپے تک کے حالات درج کر دیے گئے ہیں۔ اس طریقہ سے ہر ملک کی معمولی معاشرت روزمرہ زندگی کے حالات بھی دلکش ہو گئے ہیں۔ اس پرچہ میں ہندوستان، حیدرآباد کے حیدری، ٹرکی کے مصطفےٰ، انگلینڈ کے جان کے متعلق جو حالات درج کئے گئے ہیں وہ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں۔ مضامین کے ساتھ ساتھ صدہا تصویریں بھی دیدی گئی ہیں جنکی بدولت اس پرچے کی خوبی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ضخیم نمبر پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ اسکے خوشنما ٹائیٹل پر مختلف ممالک کے بچوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ شروع سے آخر تک یہ رسالہ بہت دلچسپ و قابل قدر ہے۔ قیمت صرف ۱۲؍ شائقین منیجر صاحب بھوگول کاریالیہ ای۔ سی۔ کالج الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

سلسلۂ وقت سوال

مشہور کتب فروش فرم میکملن اینڈ کمپنی کلکتہ نے بچوں کیلئے چھوٹی چھوٹی درسی کتابوں کا ایک سلسلہ مندرجہ بالا عنوان سے شائع کیا ہے۔ جنمیں مختلف درجوں کے لڑکے لڑکیوں کے لئے سلیس اردو و ہندی زبان میں روزمرہ کی چیزوں کے متعلق تمام ضروری معلومات (دو بچوں اور اُن کے دادا کے مکالمے کی صورت میں) بہم پہونچائی گئی ہیں۔ پہلے گریڈ کے لئے "دیا سلائی" "سوتی کپڑے" "کوئلہ اور گیس" اور "کاغذ" پر سولہ سولہ صفحوں کی دلچسپ و دلکش کتابیں لکھی گئی ہیں، اُنکا مطالعہ بچوں کے لئے ضرور مفید ہوگا۔ اور چونکہ ان کتابوں میں جگہ جگہ مناسب حال تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ اور اُن کا سرورق بہت خوبصورت اور دلکش چھاپا گیا ہے۔ اس لئے بچے ان کتابوں کو بہت پسند کریں گے۔ ہم بھی بچوں سے اُن کے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ہر حصہ کی قیمت دو آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ میکملن اینڈ کمپنی کلکتہ

نہ بود نقشِ دو عالم کہ رنگِ الفت بود
زمانہ طرحِ محبت نہ ایں زماں انداخت
(جامی)

(از مسٹر جگن ناتھ آزاد، بی۔ اے۔ سیکریٹری انجمن اُردو، راولپنڈی)

اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا
جس وقت نہ دُنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا

جس وقت ابھی کُن کا اشارہ نہ ہوا تھا
ہنگامۂ دُنیا نہ ابھی جلوہ نما تھا

جس وقت نہ سورج تھا نہ مہتاب نہ تارے
معدوم تھے پانی کی روانی کے نظارے

جس وقت نہ گرمی تھی نہ سردی تھی نہ برسات
ظاہر تھے نہ جب شام و سحر اور نہ دن رات

جس وقت نہ موجیں تھیں نہ موجوں کا تلاطم
تھی ابرِ بہاراں کے گرجنے کی صدا گُم

خاموش تھا جب محفلِ فطرت کا ہر اِک ساز
اُٹھتی نہ تھی جس وقت کسی چیز سے آواز

جس وقت نہ بجلی تھی نہ بادل نہ بخارات
نے معدنیات اور نہ آثارِ نباتات

جس وقت نہ جنگل تھے نہ صحرا نہ بیاباں
نے رفعتِ کہسار تھی، نے وسعتِ میداں

جس وقت نہ گھر گھر کے کبھی آتی تھیں گھٹائیں
ہر وقت تھیں اِک حال پہ خاموش فضائیں

جس وقت نہ تارے تھے نہ تاروں کے اشارے
معدوم تھے جب چاندنی راتوں کے نظارے

جس وقت نہ بلبل تھی نہ گل تھا نہ گلستاں
اِک حال پہ رہنے سے فضائیں تھیں پریشاں

جب صفحۂ ہستی پہ مکیں تھے نہ مکاں تھا
ہنگامہ یہ سب پردۂ غیبی میں نہاں تھا

جس وقت نہ دُنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا

رُباعی

اپنوں کی حمایت کا طلبگار نہ ہو
غیروں کی طبیعت پہ کبھی بار نہ ہو
پھولوں کی مثال ہو عزیزِ خاطر
کانٹوں کی طرح درپئے آزار نہ ہو

جگن بیلوی

قلعۂ چتوڑ راجپوتانہ اور قلعۂ گنور بھوپال

(از رائے زادہ منشی گوبند پرشاد آفتاب بی۔ اے۔)

چتوڑ کا قلعہ ہندوستان کی تاریخ میں خون بھرے نقشوں سے مصوّر ہے، اور چند فیصلہ کن نصیب آزما جنگ ہائے عظیم کا تاریخی میدان رہا ہے۔ جن میں سلطان علاؤالدین خلجی کا معرکۂ رستخیز حسن و عشق کی ریشمی ڈوریوں سے بندھا ہوا خون شہیداں کی جھلک لئے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اور پدماوت کے منظوم قصّہ کا جاں آفریں۔ لیکن آخری محشرستانِ مجادلہ شہنشاہ جلال الدین اکبر تاج گورگانیہ کے چمکتے ہوئے نور کا کارنامۂ قیامت آج تک اپنے وسعتِ خیال اور پروازِ تصوّر کو چکرا دیتا ہے۔

چتوڑ اسٹیشن سے اس مہتم بالشان قلعہ کے خوبصورت مکانات اور سر بفلک دیواریں مسلسل تسلسل میں فضائے اُفق میں معلق نظر آتی ہیں۔ اور اس تسلسل کی خوشنما لڑی شمال کی طرف شکستہ ہو کر نگاہ کے سامنے دو گوہرِ غلطاں کے درمیان صراحیانہ اُتار چڑھاؤ کا منظر پیش کرتی ہے۔ اور یہاں وسیع و رفیع شان و شوکت کے ساتھ اشرفی ٹیکری کا آسمان کا رگنبد مسطح زمین کے سبز پوش فرش پر سینۂ ارض کے شباب کی طرح اوبھرتا ہوا فضائے بہار کی نیلگونیوں میں بلند ہوتا ہے، یہاں تک کہ حصارِ قلعہ کے زینۂ فلکی کے سر بسر مساوی الرفعت جگہ حاصل کر کے قیام دلنشیں حاصل کر لیتا ہے۔ تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ اسی نظر فریب بلندی سے مغلیہ فوج نے جنگ عظیم کے قیامت خیز معرکوں کی خونبار ہیبت ناکیوں کے دوران میں یہ حیرت انگیز سباط تعمیر کرائی تھی جو زمانۂ حال کے بہترین انجنیروں کی جدت طراز خرد و دانش سے بنے ہوئے دنیا کے عظیم الشان پلوں سے کہیں زیادہ دراز و سطبر ہے۔ اور اسی شارع آسمانی پر شاہنشاہ اکبر کا بھاری بھرکم سامان جنگ اور عساکر پُر جلال کا ثقل الارض گزرتا ہوا راناکی اژدہا دہاں اور صاعقہ فگن توپوں کی برستی ہوئی آگ میں دیوارہائے سنگین کو فیلانِ کوہ پیکر کی سر زنیوں اور دلیرانِ لشکر کی سینہ زوریوں سے توڑتا ہوا چتوڑ کے گردوں سیر قلعہ میں مداخلت بیجا کا مرتکب ہوا تھا۔ یہیں راجپوتی معرکہ ہائے جدال و قتال نے خون کی وہ ندیاں بہائی تھیں جن کا ذکر مشہور بھاٹوں کے جرأت انگیز گیتوں میں اب تک رگ مردمی میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔

ذرا تخیل کی جولانیوں پر تازیانہ لگا کر دیکھیے، فی ٹوکری ایک اشرفی کے حساب سے اس پہاڑی (اشرفی ٹیکری) کی وسعت کا اندازہ کیجئے جو اکبری خزانہ کی رہین منت ہے، اور پھر ان اعداد گراں کا خیال کیجئے جو آتش فشاں توپوں کی گولہ باریوں کو جھیلتے ہوئے نبرد آزمائیوں کی قیامت میں دست جلالیہ سے بخشی ہوئی ایک اشرفی کی طمع وعزت کے مشترک جذبات سے متاثر ہو کر اس کوہ سازی میں مصروف تعمیر تھے۔

یہ ہے قلعۂ چتوڑ کے جلال وہیبت کی وہ دلنشیں تصویر جس کا خاکہ گونڈوں کی صحرائی حکمرانیوں کے مرکز خصوصی قلعۂ گنور میں خون بھری تلواروں اور دلدوز تیروں سے کھینچا گیا ہے۔ یہی ہے گونڈوانہ کا وہ دیدۂ خونبار جس میں چتوڑ کی مجادلہ ومقاتلہ کے سیل ہائے فنا اور کارنامۂ مردانگی پر وہ تصور مردم کش بنکر عکس پذیر ہیں۔ یہی ہے صحرائی بہادریوں کا وہ آئینۂ حیرت جس میں چتوڑ کی کربلائے شہادت کی طولانی داستان، قتل وخونریزی کے گہرے زخم تماشائے دلگیر دکھاتا ہے۔

حصار چتوڑ کی طرح گنور کا قلعہ بھی ایک مثلث پیکر ہے اور قلعۂ چتوڑ کے مانند اس حصار گونڈوانہ کے ہر سہ جانب پھیلی ہوئی پہاڑیاں بھی دست قدرت کی تراشی ہوئی دیواریں ہیں اور ان دونوں نقشہ ہائے تاریخ کی مشابہت طبقات الارض کے راہ سلوک کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ یعنی جس طرح سنگ آہک کی طبق درطبق دیواریں بن بن کر تودۂ کوہ چتوڑ بن گیا، اسی طرح یہاں کی سرزمین سے برآمد کیا ہوا پتھر تاریخی تعمیرات مثل روضۂ تاج آگرہ وغیرہ کی زیب وزینت کا باعث ہو رہا ہے۔ قلعۂ گنور کے زیر پا سنگ آہک کے تہہ بہ تہہ انبار سے سلسلۂ کوہ کا سبزپوش حصہ بھی چرخ زمردیں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہاں کا سنگ سبز بھی اپنی چمک دمک کی بدولت ہندوستان کی تاریخ تعمیر کا ایک سنہرا ورق بننے کا مستحق ہے۔

قدیم تہذیب وتمدن کے انتخاب مرکز ہائے جنگ کا حسن تو ادھورا نامکمل رہ جاتا اگر ان دونوں آسمانی میدانوں پر ٹھنڈے پانی کے چشموں کی آب نہ ہوتی۔ چنانچہ اس طرح بہادروں کی تلواروں کا تمام پانی زمانہ خوف ودہشت سے آب آب ہو کر چتوڑ کے حوضوں میں جمع ہو گیا ہے، اُسی طرح دلیروں کی بہی ہوئی خون کی ندیوں کا آب زلال گنور کے ٹینکوں کی پیاس بجھانے کے لئے اکٹھا ہو گیا ہے۔

البتہ راجپوتانہ کے بلند ہمت بہادروں کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آسمان پر چڑھنے کا راستہ محض قلعۂ چتوڑ کی رفعت کی سیڑھیوں سے گزرتا ہے۔ کیونکہ قلعۂ گنور کے راستہ سے بھی دوسری قوموں کے نبرد آزما شہیدان وفا نے اپنے جذبۂ وطن کی اونچائیوں کے سہارے آسمان پر پہونچکر تاریخ کے درخشاں ستارے جڑ دیئے ہیں۔

اگر راجپوتانہ کی عالمگیر بہادریوں کی فضا میں قلعۂ چتوڑ کی مہارانیوں نے اپنے ناز پروردہ حسن وجمال کو

جذبۂ وطنیت و خیال بے پردگی کے زیر اثر "جوہر" کی برق فشاں آتش کے نذر کر دیا ہے تو ایک دوسرے ماحول کے زیر اثر قلعہ گنور میں صحرا کی تازگی بخش ہواؤں سے نشو و نما پائی ہوئی غنچہ دہنوں نے مشہور و معروف رانی کملا پتی کی سرکردگی میں خوفِ پردہ دری کے ماتحت باروو بچھا کر اپنی نزاکت آفریں دلفریبیوں کو وطن و حرمتِ وطن پر قربان کیا ہے۔

زوالِ سلطنت گورگانیہ کے زمانہ میں یہاں بھی شاہانِ مغلیہ کے عروج اور راجپوتی بہادری کے شباب کی داستانیں اپنے کمال بر قباری اور انتہائی خوں فشانی کے ساتھ دہرائی گئی ہیں۔ اور اگر سرتاج شاہانِ تعمیر پسند شہنشاہ شاہجہاں کے لشکر ظفر پیکر کی توپوں کے گولے قلعۂ گنور کے ٹیکوں میں گر کر ان گونعارے کی طرح خالی از آب کر گئے تھے اور اُن کی بے آبی نے بہادر محصورین کو مغلوب کر دیا تھا تو دوسرے انقلابی ماحول میں جب نواب بھوپال کی فوج ظفر موج نے قلعۂ گنور کو مختصر سا معرکہ ہائے جدال و قتال کے بعد تسخیر کیا تو گونڈوں کی پُر آب آنکھوں میں فلاکت و دہشت ناکی کی بھی تصویریں دوبارہ جلوہ فگن ہوئیں۔

آج بھی گونڈوں کی وسیع المملکت فرمانفرمائیوں کا یہ ٹوٹا ہوا دل قلعۂ گنور کی منہدم دیواروں کے گرتے ہوئے پتھروں پر اپنے داغوں کو منقوش کئے ہوئے ہے۔ آج بھی قدیم شاہانِ صحرا کے بھاٹ (جو اوجھا کہلاتے ہیں) اپنے درد انگیز گیتوں میں قلعۂ گنور کی شکست عظیم کے دل دہلا دینے والے واقعات گاتے ہوئے ملتے ہیں۔ اور جن کی گونج نظارگیانِ قلعۂ گنور کو بھوت بازار کی ویرانی میں سر بفلک قلعہ کی فصیلوں سے ٹکرا کر فضائے صحرا میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"زمانہ" تیس سال پہلے

جنوری ۱۹۱۹ء کا رسالہ "زمانہ" نامور محبِ وطن لالہ لاجپت رائے صاحب مرحوم و مغفور کے مضمون "حبِ وطن کی منزل" سے شروع ہوا تھا اس مضمون کے آخر میں لالہ صاحب نے لکھا تھا کہ "قومی خدمت کا راستہ آسان گذار نہیں ہے

عشق بازی کار بازی نیست اے دل سر بباز   زانکہ گوئے عشق نتواں زد بچوگان ہوس

جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں انکو ہر قسم کے جبر و ظلم کیلئے تیار رہنا چاہئیے... جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پیشتر دیگر گورنمنٹیں کرتی چلی آئی ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہم سے پہلے دیگر محبانِ وطن کے ساتھ ہو چکا ہے اور ہوتا رہا ہے پس عقلمندی اور دانائی اسمیں ہے کہ بغیر کسی غصہ اور ناراضگی کے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کام کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس منزل میں جو تکلیفیں دنیا میں دوسرے انسانوں کو ہوئی ہیں وہ ہمیں بھی ہونگی انکے بغیر راہگذاری ناممکن ہے۔ خواہ مخواہ شکوہ شکایات میں وقت ضائع کرنے اور اپنی قوتوں کے بیجا استعمال اور تصرف سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس راستہ میں نہ شکوہ شکایت کی گنجائش ہے اور نہ شخصی نفع و نقصان کے حساب کو دخل ہے"۔

خواہی کہ روشنت شود احوالِ سرِ عشق   از شمع پرس قصہ ز بادِ صبا مپرس

در دفترِ طبیبِ خرد بابِ عشق نیست   اے دل بدرد خو کن و نامِ دوا مپرس

تمنائے دلی

(ادیب فاضل و کامل منشی ہری کرشن ایم - اے - سی علی)

نہ ابتدا ہے نہ کچھ انتہا زمانے کی — تحیرات سے سرخی ہے اس فسانے کی
تھا گرد لوث سے جب پاک دامن تجرید — ہے یاد بھولی سی کچھ ہم کو اس زمانے کی
نسیم خلد ہی جب تھی نہ نار دوزخ تھی — بنا قفس کی نہ بنیاد آشیانے کی
مگر خودی نے دکھایا وہ سبز باغ کہ اب — تمیز ہے نہ قفس کی نہ آشیانے کی
سرور عین تھا جب تھا خرد سے بیگانہ — خرد سے سر پہ بلا آئی آب و دانے کی
سنا جو غور سے تو کعبہ و کلیسا کی — ہوا یہ آئی صدا اپنے ہی ترانے کی
جو دیکھا غور سے ہر برگ لالہ و گل پر — لکھی تھیں سرخیاں کچھ اپنے ہی فسانے کی
نہ کیوں ہو پھر دل بیتاب میں یہی خواہش — کہ آئے پھر وہی مستی سرور جانے کی
فضائے حسن کا طائر ہوں راز مستی میں — قفس کی مجھکو خبر ہے نہ آشیانے کی

جذبات ہادی

(از مولانا ہادی مچھلی شہری)

اضطراب شوق کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ — رنگ لائی ہے جو میری ناشکیبائی نہ پوچھ
ہو گئی پائے طلب کو اب تو تجھ سے رسم و راہ — میری منزل ہے کہاں اے شوق صحرائی نہ پوچھ
حسن کو رونق دئیے جاتا یہ حد تمکنت — میرے دل کا حال اے رسم خود آرائی نہ پوچھ
کب ٹھہر سکتا تھا اس رو میں بھلا پائے ثبات — پہلے تھا میں کس جگہ اے چشم دریائی نہ پوچھ
صبر آتا ہے نہ قابو ہے دل بیتاب پر — آج کس مشکل میں ہے تیرا تمنائی نہ پوچھ
کون لمحہ اسکا تھا ہنگامۂ محشر سے کم — واقعات اضطراب شام تنہائی نہ پوچھ
کرنے اندازہ خود اپنے دیدہ ہائے مست سے — مجھ سے ساقی میرا ذوق بادہ پیمائی نہ پوچھ
اب نہیں تیرے تصور کو بھی کچھ مجھ سے لگاؤ — جس کی دنیا ہو اندھیری اسکی تنہائی نہ پوچھ
ہے عجب پر لطف حسن و عشق کا یہ معرکہ — کس قدر دلکش ہے ہادی شان رسوائی نہ پوچھ

سر جگدیش چندر بوس

از مولانا محمد یعقوب کلام بی۔ اے

قدیم یونانی روایات میں اسقلیبوس کو طب کا دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ جنگل کی تمام جڑی بوٹیاں اس سے باتیں کیا کرتی تھیں، یہ تو خیر بہت پرانی باتیں ہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے، کہ جنگل کی جڑی بوٹیاں انسان سے اپنے دکھ درد یا مسرت کا اسی طرح اظہار کرتی ہیں جیسے ہم اور آپ۔ اور یہ تمام راز ہائے نہفتہ مادر ہند کے اس فرزند رشید نے دنیا کے سامنے کھول کر رکھدیئے تھے جس کا نام جگدیش چندر بوس تھا۔ اور جو افسوس حال ہی میں ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔

ممدوح ۳۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے اور ۲۳ر نومبر ۱۹۳۷ء کو اناسی سال کی عمر میں عالم فانی سے راہی عالم جاودانی ہوگئے۔ مگر جب تک دنیا قائم ہے، ان کا نام ایک اعلیٰ سائنسداں کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آپ کے والد مسٹر بھگوان چندر بوس ایک قابل اور متمول آدمی تھے۔ اسلئے انھوں نے اپنے فرزند کے لئے بہترین تعلیم کا بندوبست کیا۔ اور نوجوان جگدیش کو پادری لافونٹ صاحب کے سپرد کردیا۔ جو اس زمانہ میں فن تعلیم کے بہترین ماہر شمار کئے جاتے تھے۔ بہرحال جگدیش چندر، سینٹ زیویر کالج کلکتہ سے ۱۸۸۰ء میں ڈگری لے کر پادری لافونٹ کے ساتھ انگلستان کو روانہ ہو گئے، جہاں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے بی ایس سی اور کیمبرج یونیورسٹی سے ٹرائپاس (سائنس وریاضی میں فضیلت اعلیٰ) کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میں نوجوان جگدیش پر لارڈ ریلے کی خاص توجہات رہیں۔ یہ انھیں کی صحبت اور تربیت کا اثر تھا کہ بوس کے دل میں معاملات کی تحقیق وتدقیق اور عمیق تفتیش کا شوق پیدا ہوگیا۔ بہرحال ۱۸۸۴ء میں جب جگدیش چندر ہندوستان واپس آئے تو پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں فزکس کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ اس ملازمت کا سلسلہ آخردم تک جاری رہا۔

نئے پرجوش پروفیسر کو یہ بات دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی کہ کالج کی لیبوریٹری میں سائنس کے تجربات دکھانے کا بہت ہی کم سامان ہے۔ بہرحال وہ معمولی آلات ہی کے ذریعہ یونیورسٹی کا مقرر کردہ نصاب پڑھاتے رہے۔ اور اسی کے ساتھ اپنے شاگردوں کو وہ جدید انکشافات بھی بتاتے رہے، جو دنیا کے دیگر حصوں میں ہوتے رہتے تھے۔ پروفیسر بوس کو سائنس کے تمام شعبوں میں سب سے زیادہ

شوق برقیات سے تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں وہ برقی لہروں پر پروفیسر ہرٹز کے تجربوں کی مشق کیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے سائنس کے مختلف معاملات میں اپنی ذاتی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اور نئے نئے تجربات کے لئے نئے نئے آلات ایجاد کرتے رہے۔ نومبر ۱۸۹۵ء کی ایک شام کو وہ پریسیڈنسی کالج میں لکچر دے رہے تھے۔ اور ایک تجربہ دکھانے کے لئے ایک پستول بھر کر رکھا تھا جسے اُنھوں نے لاسلکی برقی لہروں کے ذریعہ سے داغ دیا۔ نومبر ۱۸۹۵ء میں جرمن ماہر سائنس رونٹجن نے عالم برقیات کے متعلق ایک نیا انکشاف کیا۔ پروفیسر جگدیش نے دوسرے ہی مہینے رونٹجن کے تمام تجربے کلکتہ میں دہرا دیے۔

اس اثناء میں ان کی ذاتی تفتیش و تحقیق کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اور اکثر اوقات ان کی محنت و جانفشانی بارآور ہوتی رہی۔ اُنھوں نے بعض خاص برقی تجربات کے سلسلے میں ایک خاص آلہ ایجاد کیا۔ اور مئی ۱۸۹۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے روبرو برقیات کے متعلق ایک مضمون پیش کیا جس کا عنوان تھا۔

On Polarisation of Electric Rays by Double Refracting Crystals.

"دوہرے شعاع ریز بلور پاروں کے ذریعہ برقی شعاعوں میں منفی و مثبت قطب پیدا کرنا"

اسی دن سے گویا ہندوستان میں پروفیسر جگدیش چندر بوس کی سائنٹفک سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے بعد پروفیسر بوس نے دو اور مضمون لکھے جو رسالہ "الکٹریشین" میں شائع ہوکر مقبول عام ہوئے۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا۔

On a new Electro Polariscope.

اور دوسرے کا عنوان مثبت و منفی قطب پیدا کرنے کا جدید برقی آلہ

On Double Refraction of the Electric Ray by a Strained Dielectric.

اسی سال رائل سوسائٹی کی روئداد کے ساتھ پروفیسر جگدیش کا تیسرا مضمون بہ عنوان

On the Determination of the Index of Refraction of Sulphur for the Electric Ray.

شائع ہوا۔ اس کے بعد پروفیسر بوس کے سات برس ایسے گذرے جبکہ اُنھوں نے رائل سوسائٹی

کی روئیدادوں کے ساتھ نہ صرف چند بیش قیمت مضامین شائع کئے۔ بلکہ جو کچھ لکھا اور جو نظریے قائم کئے۔ ان کے متعلق انھوں نے دنیا کی علمی مجلسوں اور مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں کے سامنے علمی مظاہرہ کیا۔ غرض پروفیسر بوس کے علمی کارناموں سے دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان حیران و ششدر رہ گئے حتیٰ کہ لارڈ کیلون (Lord Kelvin.) نے تو اپنی حیرت و استعجاب کا ایک خط میں اس طرح اظہار کیا۔ کہ

"جن مشکل مسائل پر آپ نے اس قدر کامیابی کے ساتھ حملہ کیا ہے اسے دیکھ کر میرا دل حیرت و استعجاب اور تحسین و داد سے معمور ہوگیا"

فرانس کی "سائنس اکیڈمی" کے پریسیڈنٹ موسیو کارنو نے تو پروفیسر جگدیش کی تعریف میں قلم توڑ دیئے۔ انھوں نے لکھا۔

"آپ کے انکشافات سے سائنس کے کام کو بیحد ترقی ہوئی ہے۔ آپ کو لازم ہے کہ آپ اپنی قوم کی شاندار روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ ہی کی قوم نے آج سے دو ہزار برس پہلے علوم و فنون کی مشعل نور بلند کر رکھی تھی اور آپ ہی کی قوم تہذیب و تمدن میں دنیا بھر کی رہنمائی کی۔ ہم فرانس والے بآواز بلند آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں"

پروفیسر بوس نے انھی ایام میں اور بھی بہت سے "سائنٹفک مضامین لکھے۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان اور انگلستان کے مختلف علمی پرچوں میں شائع ہوئے۔ ان تمام مضامین کا مجموعہ ایک کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ جس کا مقدمہ اس زمانہ کے مشہور و معروف ماہر طبعیات سر جے۔ جے۔ طامس نے لکھا ہے۔ یہ مضامین کس پایہ کے ہیں۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو موصوف نے اپنے مقدمہ میں تحریر فرمائے ہیں۔ برقی لہروں کے ان تجربات کے بارہ میں جو پروفیسر ہرٹز نے کئے تھے وہ لکھتے ہیں:

"اس مضمون کا مطالعہ مسٹر بوس کے جاری کردہ طریقہ سے اور بھی سہل ہوگیا ہے، کیونکہ انھوں نے معمول سے زیادہ چھوٹی برقی لہروں کے پیدا کرنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اور اس طریقہ کے ذریعہ سے انھوں نے (Polarisa tion, Refraction) کی گردش کے مسائل میں نہایت اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان مضامین کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر علوم طبعیات میں تحقیق و تدقیق کا شوق از سر نو پیدا کر دیا ہے۔ بہرحال گذشتہ تیس سال سے اس میدان میں جو کچھ دلچسپی یا سرگرمی نظر آتی ہے وہ زیادہ تر سر جگدیش چندر بوس کے کام کا اثر اور نتیجہ ہے"

جس زمانہ میں سر جگدیش برقی لہروں پر تجربات کر رہے تھے اس وقت بہت سے لوگ ایسے بھی تھے ...

جو ان کی تحقیق و تدقیق کو استفادی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ کئی کاروباری اداروں کے نمائندوں نے اس بارہ میں آپ سے گفتگو کی۔ اور کہا کہ امریکہ کے موجد اڈیسن کی طرح آپ بھی اپنی ایجاد کردہ چیزیں بازار میں لانا پسند کریں تو ہم سرمایہ لگانے کو تیار ہیں۔ لیکن سر جگدیش نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔

سر جگدیش بوس نے جو پیچیدہ اور نازک آلات ایجاد کئے ہیں۔ ان کو بھی دنیا سے خراج تحسین مل چکا ہے چنانچہ آپ کے ایجاد کردہ ایک آلہ کے بارہ میں "الکٹریشین" نے ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا۔

"برقی مقناطیسی لہروں کا انتشار معلوم کرنے کے لئے جو نہایت حساس ڈٹکٹر (Detector.) پروفیسر بوس نے ایجاد کیا ہے۔ اس کی وجہ سے لاسلکی ٹیلیگرافی کے موجودہ طریقوں میں انقلاب عظیم برپا ہوجانا چاہئے"

اسی طرح ۱۸۹۷ء فروری کے "الکٹرک انجینیر" نے لکھا کہ:۔

"ان استقرائی طریقوں سے کام لے کر مسٹر بوس نے اپنا ریسیور ایجاد کیا ہے جن وجوہ سے اس ریسیور کو دیگر ریسیوروں پر فوقیت حاصل ہے، وہ بہت ہی دلچسپ ہیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر بوس نے اپنے ریسیور کے متعلق کوئی بات پردہ راز میں نہیں رکھی، بلکہ دنیا میں جس کسی کا جی چاہے وہ اس آلہ کو دیکھے اس سے کام لے اور اگر چاہے تو اسے بنا کر دولت بھی کمائے"

برطانیہ اور امریکہ کی گورنمنٹوں نے پروفیسر بوس کو اپنے ایجادات کو پیٹنٹ کرانے کے حقوق بھی عطا کر دئے تھے۔ لیکن سر جگدیش نے اپنے ایجادات سے ذاتی فائدہ اٹھانے کی کبھی خواہش نہیں کی مگر پیٹنٹ مل جانے سے یہ فائدہ ضرور ہوا۔ کہ ان کی ایجادات کی اولیت تسلیم کر لی گئی۔ بہرحال پروفیسر بوس کی تمام سائنٹفک تحقیقات اور ایجادات دنیا بھر کے فائدہ اور رفاہِ عام کے غرض سے تھیں اور انھوں نے تمام عمر کبھی اپنے مالی فائدہ کے خیال سے کوئی کام نہیں کیا۔

جس زمانہ میں سر جگدیش چندر بوس علم طبعیات کو اپنی ریسرچ اور اپنی اختراعات سے مالا مال کر رہے تھے، اس وقت وہ اپنے تجربات کی رو میں غیر محسوس طور پر ایک دوسری سمت بہے چلے جا رہے تھے۔ اور وہ تجربات کرتے کرتے بالآخر اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ ذی روح اور غیر ذی روح دونوں قسم کی چیزوں پر برقی محرکات کا اثر یکساں پڑتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں سائنس کانگرس پیرس میں میکانکی و برقی محرکات پر اشیاء غیر ذی روح کے اظہار احساس کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے انھوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ "غیر ذی روح چیزیں بھی زہروں سے ہلاک ہوتی ہیں"

پروفیسر بوس کے اس نظریہ پر ہر طرف سے ایک طوفانِ مخالفت برپا ہوگیا اور بڑے بڑے ماہرینِ طبعیات ان کے خلاف ہوگئے۔ مگر انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ بلکہ اس کے ...

وہ ہمیشہ یہی دکھاتے رہے کہ انسانی علم کی مختلف شاخوں میں مثلاً عالم نباتات وحیوانات کے درمیان اور ذی روح وغیر ذی روح کے بیچ میں کوئی نمایاں حد فاصل نہیں ہے۔ ذی روح وغیر ذی روح نباتات وحیوانات، کی نوعیت و ماہیت پر جو پردہ اسرار پڑا ہوا ہے اسے اٹھانے کے لئے دنیا کے تمام سائنسوں کو متفق و متحدہ کوشش کرنی چاہئے۔ پروفیسر بوس کے نزدیک دنیا کی تمام چیزوں میں ایک شئے قدر مشترک حیثیت سے ہے جس کے انکشاف کرنے کی کوشش کرنا ہر سائنس کا لازمی فرض ہے۔

اس مسئلہ پر باوقات مختلف پروفیسر بوس کے بہت سے گرانقدر مضامین شائع ہوئے جن کا لب لباب ۱۹۰۲ء میں ان کی ایک کتاب میں جس کا نام "ذی روح وغیر ذی روح کا احساس" ہے[1]۔ شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب جس میں پروفیسر بوس نے اپنی تحقیقات کے تمام نتائج دلچسپ پیرایہ میں بیان کردئے ہیں۔ اس قدر مقبول عوام ہوئی کہ نہ صرف انگریزی زبان میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں بلکہ جرمن، فرانسیسی اور دنیا کی بہت سی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ پروفیسر بوس کی تحقیقات کے جو نتائج اس کتاب میں درج ہیں وہ سب ناقابل تردید اور مسلمہ ہیں۔ اور انھوں نے اس میں یہ بات بخوبی ثابت کردی ہے کہ مختلف قسم کی تحریکات کے زیر اثر حیوانات، نباتات اور جمادات سب کو یکساں احساس ہوتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں پروفیسر بوس نے اپنی دوسری کتاب شائع کی جس کا موضوع "عالم نباتات کا احساس"[2] ہے۔ یہ بات واضح دلائل سے ثابت کی گئی ہے کہ جو قوت احساس مختلف قسم کے حیواناتی ریشوں میں پائی جاتی وہی پودوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ بھدی سے بھدی قسم کے پودے جن کی نسبت بظاہر یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں کوئی قوت احساس ہوگی، مختلف محرکات کے زیر اثر احساس کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر جگدیش چندر بوس نے حیوان اور پودا دونوں میں ایک ہی درجہ کی برقی رو دوڑائی۔ دونوں نے اسکا یکساں اثر محسوس کیا۔

اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں اس نظریہ کی مزید وضاحت کے لئے سر جگدیش نے ایک اور کتاب (Comparative Electro Physiology.) نامی لکھی جس میں انھوں نے یہ رائے بھی قائم کی ہے کہ عضویات حیوانی کے بہت سے پیچیدہ مسائل عالم نباتات کے عمیق

---

[1] Response in the Living & Non Living

[2] Plant Response.

مطالعہ سے حل ہو سکتے ہیں۔

عالم نباتات کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا جس میں سر جگدیش نے تفتیش نہ کی ہو۔ لیکن تجربات کرتے وقت جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے آلات ناقص اور کافی طور پر حساس نہیں ہیں۔ تو ۱۹۱۳ء میں انھوں نے "پودوں کی ذکی الحسی" (Irritability of Plants.) کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے ایجاد کردہ آلات کا جو انھوں نے اپنی زیر نگرانی اپنے کارخانہ میں بنوائے تھے، حال لکھا۔ یہ آلات صحیح اور نازک تھے۔ وہ اپنے تجربات زیادہ تر ایک خاص پودے پر کیا کرتے تھے جسے بنگلہ زبان "بن چرل" کہتے ہیں۔ مختلف قسم کے محرکات کے زیر اثر اس پودے کی جو نبضیں چلتی ہیں اور منشیات یا بیہوشی آور چیزوں کا جو اثر اس پر ہوتا ہے، وہ سر جگدیش چندر بوس کا ایجاد کردہ آلہ پوری طرح سے نوٹ کرلیتا ہے۔ اور بال برابر بھی غلطی ہونے نہیں پاتی۔ اس عجیب و غریب ریکارڈ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے تک کو پوری صحت کے ساتھ نوٹ کرلیتا ہے اور اسی کے ساتھ پودوں کے ریشوں میں جو اشتعال پیدا ہوتا ہے اس کی رفتار کو پوری طرح سے بتا دیتا ہے۔ پروفیسر جگدیش چندر بوس نے "بن چرل" کے علاوہ اُس پودے پر بھی بہت سے تجربے کئے جسے عرف عام میں "لاجونتی" یا "چھوئی موئی" کہتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک سیر حاصل مضمون روائل سوسایٹی کے لئے لکھا بھی تھا جس کا عنوان یہ تھا۔

On an Automatic Method for the Investigation of the Velocity of Transmission of Excitation in Mimosa

پروفیسر جگدیش نے یہ تمام تجربات پریسیڈنسی کالج کی لیبوریٹری میں کئے۔ اپنی تحقیق و تدقیق سے انھوں نے یہ نظریہ قایم کیا کہ تمام موجودات میں خواہ وہ حیوانات ہوں، یا نباتات یا جمادات ایک اُصول یا علت مشترک موجود ہے۔ وہ اس اُصول کی چھان بین کے لئے ایک جداگانہ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مدت دراز کی کوششوں کے بعد انھوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو "بوس انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے اس مقصد کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا۔ اہل علم کے نزدیک یہی انسٹی ٹیوٹ ان کا سب سے گرانقدر ترکہ ہے جو انھوں نے دنیا کے لئے چھوڑا ہے۔

دراصل سر جگدیش چندر بوس نے سائنس کے مختلف شعبوں کی درمیانی حد فاصل توڑ کر رکھدی۔ اور ایک سائنس کو دوسرے سے وابستہ کردیا۔ چنانچہ آج علم حیاتیات کے طالب علم کا مطالعہ عضویات ہی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اسے علم کیمیا اور علم نفسیات پر بھی عبور حاصل کرنا پڑیگا۔ چنانچہ بوس

ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اسی اصول کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سر جگدیش نے ایک نہایت عجیب و غریب آلہ اور ایجاد کیا جس کا نام (High Magnification Crescograph.) ہے اور جو اس اثر کی پیمائش کر لیتا ہے جو پودوں کے نشو و نما پر روشنی، حرارت اور دیگر مختلف ذرائع سے پڑتا ہے۔ بہرحال چند سال کی تحقیق و تدقیق کے بعد بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں[1]۔

ان کتابوں میں سر جگدیش چندر بوس نے یہی ثابت کیا ہے، کہ نبض کی ضربات، اعصاب کی قوت ایصال اور مختلف اثرات کے ماتحت ریشوں کا پھیلنا یا سکڑنا، جیسا حیوانات میں پایا جاتا ہے ویسا ہی نباتات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ آپ کی رائے کے مطابق علم الاجسام اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل علم نباتات کے مطالعہ سے حل ہوسکتے ہیں۔ اور سر جگدیش کی اس تحقیق کا سکہ ان کے کٹر مخالفین کو بھی ماننا پڑا۔ سر ممدوح کی تصانیف فرانسیسی، جرمن اور بہت سی دیگر مغربی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان سر جگدیش چندر بوس کی رایوں کو بطور سند پیش کرنا فخر سمجھتے ہیں۔

نئی تحقیقات کو لوگ ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب سر جگدیش چندر بوس نے آلہ (Crescograph.) ایجاد کیا تو بہت سے لوگوں کو اس کی نسبت شکوک پیدا ہوئے

"لیکن جب ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو یونیورسٹی کالج لندن میں اس آلہ کی خصوصیات کا مظاہرہ کیا گیا تو لارڈ ریلے، پروفیسر بلیس، پروفیسر بیلکین، پروفیسر ایف جی۔ ڈونان اور دیگر حضرات نے قائل ہوکر ہر مئی کے لندن ٹائمس میں حسب ذیل الفاظ شائع کرائے:۔ "ہمیں کامل اطمینان ہوگیا ہے کہ یہ آلہ پودوں کی نشو و نما کو پوری صحت کے ساتھ نوٹ کرتا ہے۔ اور ایک سے دس لاکھ بلکہ ایک کروڑ گنا کرکے دکھاتا ہے۔"

سر جگدیش ہر وقت کسی نہ کسی امر کی تحقیق و تفتیش میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے "مچھلیوں کے زہر" کے متعلق ایک نہایت قابل قدر مضمون لکھا۔

سائنس کے علاوہ بنگالی لٹریچر سے بھی آپ کو بہت شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے بہت قابل قدر

---

[1] Photosynthesis 1924 (2)
The Ascent of Sap, 1923
Motor Mechanism of Plants. 1928 (4)
Nervous Mechanism of Plants, 1926 (3)
(5) Growth & Tropic Movements 1929

مضامین مختلف بنگالی اخباروں اور رسالوں کے لئے لکھے گئے تھے۔ اور ۱۹۲۱ء میں بنگالی لٹریری کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ ایک عرصہ دراز تک بنگ ساہتیہ پرلشیڈ یعنی بنگالی لٹریری اکیڈیمی کے پریسیڈنٹ بھی رہے۔

سر جگدیش کو فنون لطیفہ سے بھی بہت شوق تھا۔ جس کا ثبوت ان کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی آرائش و زیبائش سے بخوبی ملتا ہے۔ درحقیقت ان کا دل ہر وقت جذبات کی دنیا میں کھیلتا رہتا تھا۔ ان کی طبیعت بہت صفائی پسند تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہت سادہ اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اور اسی سادگی اور کفایت شعاری کی بدولت وہ خیراتی اور علمی کاموں کے لئے لکھو کھا روپیہ وقف کر سکے۔

مذہبی حیثیت سے سر جگدیش چندر بوس برہمو تھے انکا عقیدہ تھا کہ روح اعلیٰ سے محض نیکی یعنی کے بدولت وصل حاصل ہو سکتا ہے اس کے لئے اگر انسان سچائی پر قائم رہے۔ جمالیات سے لطف اندوز ہو۔ اپنے تمام افعال ظلم و خود غرضی کی کثافت سے پاک رکھے تو انسان منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔ ان عقائد میں سر جگدیش چندر بوس اور ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور ایک دوسرے کے بہت کچھ ہم خیال ہیں۔ البتہ سر جگدیش چندر بوس کے جمالیاتی مسلک کو عیش پرستی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز کو اس آیتہ کی روشنی میں دیکھتے تھے جس میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے۔ کہ "خدا جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے"۔ ان کے نزدیک مجاز ہی نردبان حقیقت ہے۔

سر جگدیش چندر بوس بڑے قوم پرست اور سچے محب وطن اور ہندوستانی تہذیب و شائستگی کے دلدادہ تھے۔ ان کو دیہاتیوں سے بڑی محبت تھی اور ان کی زندگی سے بڑی دلچسپی لیتے تھے دیہاتی کھانا بھی وہ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ سفر لندن سے واپس آئے تو ان کے سامنے رس گلے وغیرہ بنگالی مٹھائیاں ناشتہ کے لئے رکھی گئیں۔ لیکن انھوں نے مرمرے اور ہری مرچیں طلب کیں۔ اور جب یہ چیزیں لا کر دی گئیں تو انھوں نے بڑے شوق سے کھائیں۔

غرض سر جگدیش چندر بوس کی وفات سے مادر وطن کا ایک ایسا فرزند رشید [illegible] شہرت کا مالک تھا، اور جس کی جگہ پر ہونا بہت محال ہے۔

شمع

(مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل)

لیلائے نور بزم میں جلوہ فروش ہے — آتش بجام مغبچۂ بادہ نوش ہے
پروانے بیقرار ہیں۔ محفل خموش ہے — یارب یہ کون رہزنِ تمکین و ہوش ہے!
حسنِ ازل کی مُہر بیاضِ جبیں پہ ہے
کوئی سفیرِ عالمِ بالا زمیں پہ ہے

نکلی ہے رتی[1] کے قلب سے آہِ شرر فشاں — یا کام[2]۔ شو کے قہر سے جلتا ہے شعلہ ساں
کوئی ستی[3] ہے آتشِ سوزاں کے درمیاں — کس کی یہ پاکبازی کا ہوتا ہے امتحاں
بجلی گری ہے خرمنِ صبر و قرار پر
یا شمع کا کمال ہے دلِ داغدار پر

اے شمع تجھکو شاعرِ بیچارہ کیا کہے — مینائے زرنگارِ شرابِ ضیا کہے
یا جلوہ زارِ تابشِ حسن و صفا کہے — قائم مقامِ نیّرِ ظلمت رُبا کہے
محفل کو تو نے مطلعِ انوار کر دیا
دل کی چمک کو خواب سے بیدار کر دیا

فانوس کے حجاب میں تو کوئی حور ہے — روزِ ازل سے زینتِ آغوشِ نور ہے
شہرہ ترے جمال کا نزدیک و دور ہے — تیری ثنا کروں۔ یہ مجھے کب شعور ہے
پروانہ غش ہو کیوں نہ تری جلوہ گاہ میں
پوشیدہ برقِ طور ہے تیری نگاہ میں

---

[1] رتی ہندو اتہاس میں عشق کے دیوتا کام دیو کی بیوی کا نام ہے۔ کام دیو کے بھسم ہونے پر اس نے بڑا ماتم کیا اور سوگ منایا تھا۔

[2] کام دیو (عشق کے دیوتا) نے شیوجی کی ریاضت میں خلل ڈالنے کے خیال سے انھیں سمادھی (مراقبہ) سے بیدار کرنا چاہا۔ اس لئے طرح طرح کی دلکش ترکیبوں کے بعد اس نے کیلاش پربت پر بسنت (موسم بہار) کا سماں پیدا کر دیا پہاڑ کا چپہ چپہ گلزار بن گیا۔ ہر جگہ پھول ہی پھول نظر آنے لگے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو گئی۔ شیوجی کی سمادھی بھی قائم نہ رہ سکی مگر وہ اس خلل اندازی سے بہت برہم ہوئے اور کام دیو کو ایسی نگاہ قہر سے دیکھا کہ وہ جل کر بھسم ہو گیا۔

[3] [illegible] ہے شیوجی مہاراج کی اہلیہ محترمہ کا جو کسی بات پر شوہر سے ناخوش ہو کر اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ لیکن جیسے ناخواندہ مہمان کی کوئی تو [illegible]

صورت ہے تیری خوب تو سیرت ہے خوب تر دل میں ترے گدازِ محبت ہے کس قدر
روتی ہے تو مزارِ غریباں پہ رات بھر شبہائے غم میں مونس و ہمدم ہے تا سحر
تیرا وجود مایۂ صبر و قرار ہے
نوعِ بشر کی دہر میں تو غمگسار ہے

تیری طرح زمانہ میں کم ہوں گے نیک خو احباب تجھ سے خوش ہیں تو دلشاد ہیں عدو
شہرہ ہے تیری ہمّتِ عالی کا چار سو جلتی ہے دوسروں کے لئے انجمن میں تو
پروانہ غش ہو تابشِ رخسار دیکھکر
بیخود ہیں اہلِ دل ترا ایثار دیکھکر

مضمر ترے جمال میں الفت کا راز ہے محفل میں تیرا جلوہ بصارت نواز ہے
تو نقشِ ناز ہو کے سراپا نیاز ہے کتنی حریصِ لذّتِ سوز و گداز ہے
کہتی ہے تو یہ رو کے خدایا سحر نہ ہو
کافورِ صبح دافعِ سوزِ جگر نہ ہو

رکھتا ہے غم جو دہر میں آتش بجاں تجھے کہتے ہیں اہلِ بزم تجلّی نشاں تجھے
سرمایۂ حیات ہے سوزِ نہاں تجھے ہاں۔ مل گئی یہ نعمتِ عظمیٰ کہاں تجھے
انسان ہو کے سوز سے ناآشنا ہوں میں
حسرت سے انجمن میں تجھے دیکھتا ہوں میں

جگدیش تجھکو رشک جو آتا ہے شمع پر افسوس تو ہے اپنی حقیقت سے بیخبر
ورنہ تری ضیا سے منوّر ہیں بحر و بر تیرا وجود۔ حسن و محبّت ہے سر بسر
نظارہ سوزِ طور پہ تیرا جمال تھا
موسیٰ کی التجا نہ تھی۔ تیرا سوال تھا

رباعی

پھولوں کے خمیر سے ہے فطرت میری نکہت سے لطیف ہے طبیعت میری
پروانہ شمعِ بزمِ دل ہے میرا ویرانہ نصیب ہے یہ قسمت میری

جان کی قربانی

از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

بکرم پور کے زمیندار اوتار سنگھ اپنے مندر کے کوئیں پر بیٹھے دتون کر رہے تھے۔ اور ایک آدمی سے جو اُن کے سامنے کھڑا تھا باتیں کرتے جاتے تھے۔ ایک آدمی جو زمیندار صاحب کا خادم معلوم ہوتا تھا، پانی کا طشت سامنے رکھے اور ہاتھ میں لوٹا لئے کھڑا تھا۔ وہ آدمی جو زمیندار صاحب سے باتیں کر رہا تھا یہ کہہ رہا تھا۔ کہ "پھلواری تو اب کی آپ نے بہت اچھی لگوائی ہے۔"

زمیندار صاحب کوئیں کے چاروں طرف لگی ہوئی پھلواری پر ایک سرسری نظر ڈال کر بولے۔ "ہاں اب کی دفعہ شہر سے پودے منگوائے تھے، پانی نہیں پڑا، نہیں تو اب تک اچھا خاصہ چمن ہو جاتا۔"

"ہاں سرکار، پانی کی تو اس دفعہ بڑی کمی ہے۔ یہ سمبت بڑا خراب بتایا جاتا ہے۔ دیکھئے کال نہ پڑ جائے۔"

"کون ٹھیک ہے؟" زمیندار صاحب نے جواب دیا۔ "سمبت ۹۴ ابھی بہت خراب رہا تھا۔ پنڈت کہتے ہیں کہ یہ سمبت ۹۴ سے بھی زیادہ خراب ہے۔ پتروں میں بھی پانی کم لکھا ہے۔"

"صاحب کیا ۹۴ اور کیا ۹۵۔ ہمیں کچھ اچھا دکھائی نہیں دیتا، دن دن بگڑتا ہی جاتا ہے۔"

زمیندار صاحب دتون چیرتے ہوئے بولے۔ "ہاں دکھائی تو کچھ ایسا ہی دیتا ہے۔"

اس پر آدمی بولا کہ "پانچ چھ برس سے کھیتی خراب ہو رہی ہے۔ کبھی پالا مار گیا، کبھی ہوا بیار لے گئی۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ، یہی خرابیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کسان بے چارے اُبھرنے نہیں پاتے۔"

زمیندار صاحب کلی کر کے انگوچھے سے منہ پونچھتے ہوئے بولے۔ "بھائی! جیسی نیت ویسی برکت! جب سے کسانوں کی یہ نیت ہوئی کہ زمیندار کو پیسہ نہ دو تب ہی سے کھیتی خراب ہونے لگی۔"

وہ آدمی سر ہلا کے رہ گیا۔ مگر زمیندار صاحب کا یہ قول اُسے کچھ جنچا نہیں پھر بھی زمیندار صاحب اس خیال پر زور دیکر بولے۔ "غور کرو، آخر پہلے بھی قحط پڑتا تھا یا نہیں؟ لیکن کسان خوش حال تھے۔ زمیندار کو بھی پورا لگان ملتا تھا، مہاجن اور سرکار کے مطالبے بھی وصول ہوتے تھے۔ جب سے کانگرس کی ہوا چلی ہے اور کسان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ زمیندار کوئی چیز نہیں ہے۔ اُسی گھڑی سے پیداوار کو بھی چھوت لگ گئی ادھر کسان کی نیت خراب ہوئی اُدھر اُپج کا خاتمہ ہو گیا۔ بھگوان بڑے منصف ہیں۔ جب تم دوسرے کا نہ دو گے تو

تمھیں بھی نہیں ملے گا، لیکھا جو کہا برابر! یاد رکھو آدمی کو جو کچھ ملتا ہے وہ محض اسکی تقدیر سے نہیں ملتا، نہ معلوم کتنوں کا حصہ شامل رہتا ہے۔ کھیتی میں بھی کچھ زمیندار کا مقسوم ہوتا ہے کچھ مہاجن کی تقدیر ہوتی ہے کچھ کسانوں کا نصیبہ رہتا ہے۔ جب کہیں پیداوار ہوتی ہے۔ اب کسان یہی چاہتے ہیں کہ سب ہمیں سمیٹ کے رکھ لیں، نہ زمیندار کو دیں اور نہ مہاجن کو، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اسی نیت کا پھل ہے کہ ہر سال فصل خراب ہو جاتی ہے۔"

"مگر زمیندار اور مہاجن تو اب بھی وصول کر لیتے ہیں۔" اُس آدمی نے کہا۔

"کیا وصول کر لیتے ہیں؟" زمیندار صاحب بولے۔ ہزاروں روپیہ باقی پڑا ہوا ہے۔ پہلے ایک پیسہ باقی نہیں رہتا تھا۔ خیر! ہم وصول بھی کریں تو کیا؟ کسانوں کی نیت تو بگڑ گئی ہے! پھل تو نیت ہی کا ملا کرتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے ہی۔ مگر نیت آج کل ساری دنیا کی بگڑ گئی ہے۔"

اُسی وقت ایک اٹھارہ اُنیس سال کا نوجوان ہاتھ میں گٹھری لٹکائے اُدھر سے نکلا۔ زمیندار صاحب کو دیکھ کر سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے زمیندار صاحب بولے "کیوں للّو! شہر سے آرہے ہو کیا؟ —

— ہاں، آج تو اتوار ہے۔ کالج میں تعطیل ہو گی، کل بھی چھٹی ہو گی۔

زمیندار صاحب کو نوجوان کی طرف متوجہ پاکے وہ آدمی وہاں سے کھسک گیا اور زمیندار صاحب کا ملازم بھی طشت و آفتابہ لے کر چلا گیا۔

"شہر کا کیا حال چال ہے؟"

نوجوان نے زمیندار صاحب کو جواب دیتے ہوئے کہا "سب اچھا حال چال ہے" تھوڑی دیر سکوت کے بعد نوجوان نے پھر کہا۔ "آج نوٹس نکل گیا، اُس کے رو سے نالش، قرقی، ڈگری، بیدخلی وغیرہ سب موقوف [illegible]

اس خبر نے زمیندار صاحب کے چہرے کا رنگ فق کر دیا۔ انھوں نے گھبرا کر دریافت کیا "اچھا تو جوا نواہ [illegible]

"وہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا" نوجوان نے جواب دیا۔ "اب کانگرس کا زمانہ ہے"

"یہ کانگرس تو سب چوپٹ کر کے [illegible] نے گی۔ زمیندار صاحب نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "تم نے [illegible]

"اخبار میں پڑھی ہے۔" نوجوان بولا "میں نے اسٹیشن پر اخبار خریدا تھا۔ اُسی میں یہ نوٹس [illegible] اتنا کہنے کے بعد نوجوان نے ایک روزانہ اخبار جیب سے نکال کر زمیندار صاحب کی طرف [illegible]

زمیندار صاحب اخبار لے کر ورق گردانی کرتے ہوئے بولے "ہمارے یہاں تو ہفتہ وار اخبار [illegible] تم نے بہت اچھا کیا جو اسے لیتے آئے۔ وہ نوٹس کہاں ہے؟

"پہلے ہی صفحے پر ہے" نوجوان نے جواب دیا۔

زمیندار صاحب نے نوٹس کو شروع سے آخر تک پڑھ لینے کے بعد کہا "ہاں سب کچھ [illegible]

"اخبار رکھیئے گا؟" نوجوان نے دریافت کیا۔

" ہاں۔ زمیندار صاحب نے جواب دیا۔ پڑھ کے بھجوادوں گا۔"
نوجوان سلام کرکے آگے بڑھا۔ زمیندار صاحب پھر اُس سے متوجہ کرکے بولے۔" ذرا سنو۔"
نوجوان واپس ہوکر زمیندار صاحب کے سامنے آکھڑا ہوا۔ زمیندار صاحب نے کہا: ذرا ادھر آجاؤ' اکیلے ہیں؟ "

اتنا کہہ کر زمیندار صاحب، نوجوان کو پھلواری میں لے گئے اور وہاں پہونچ کر بولے " بیٹا: تم گھر کے لڑکے ہو، تم پر ہمیں بڑا بھروسہ ہے۔ ہم تو تمھیں اپنا لڑکا ہی سمجھتے ہیں تم بیا ہے جو سمجھو"
نوجوان نے کہا۔ کہ" میں بھی آپ کو والد ہی کے بجائے مانتا ہوں۔ میرے متعلق جو خدمت ہو بے تکلف ارشاد کیجئے"
" بات یہ ہے بیٹا!" زمیندار صاحب نے سرگوشی کے طور پر کہا۔ اگر یہ خبر گاؤں میں مشہور ہوجائے گی کہ قرقی ڈگری بند ہوگئی تو ہمارا بڑا نقصان ہوجائے گا۔ اس لئے تم گاؤں میں ابھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا ـــــ اپنے گھر والوں سے بھی نہیں؟ "
نوجوان:" لیکن یہ بہ زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہے گی۔ گاؤں کے ادمی نہ آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ قرب و جوار کے گاؤں والے بھی آیا جایا کرتے ہیں۔ اُن سے سُن گُن مل جائے گی۔"
زمیندار:۔ ابھی دو چار دن پتہ نہیں لگے گا ایسی افواہیں تو بہت دنوں سے مشتہر ہورہی ہیں کہ قرقی ڈگری سب بند ہونے والی ہیں۔ ان خبروں سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اگر دو چار دن یہ خبر گاؤں والوں کو نہ ہوئی تو اس بیچ میں ہم بہت کچھ کرلیں گے۔ اس واسطے بیٹا! تم اپنی زبان سے نہ کہنا، دوسرے خبر لگتے آگے کرے بچھ گئے؛ اتنی بات ہماری رکھ لو۔ پرماتما تمھیں بنائے رکھیں۔"
نوجوان نے وعدہ کیا کہ" اچھی بات ہے۔ میں کسی سے نہ کہوں گا۔"
" زمیندار صاحب نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا بس، ہم یہی چاہتے ہیں اور یہ اخبار تو تم پڑھ چکے ہوگے؟"
" ہاں، نوجوان نے جواب دیا۔ میں تو سب پڑھ چکا ہوں۔"
" اسے ہم ہی رکھ لیں۔ ہمارے کام آئے گا۔"
" ہاں، ہاں۔ میں پڑھ چکا ہوں۔"
اتنا کہہ کر نوجوان رخصت ہوگیا۔

ادھر زمیندار صاحب بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے مکان میں، جہاں تحصیل وصول کیا کرتے تھے آبیٹھے اور گر تیوں ... لمبا ذرا جلد ... بلدیو آہیر، کریم پوٹریہ، آدھین مہراج۔ ان تینوں کو بلا لاؤ اور ادھر سے لنگو کو بھیدیا کہنا کہ جلدی چلو۔"

گرد بیتوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد گنگو آگیا۔ اُس سے زمیندار صاحب نے کہا:"ذرا کھاتہ تو نکالو"

گنگو نے صندوق کھول کے کھاتہ نکالا۔ زمیندار صاحب نے پوچھا:"بلدیو، کریم اور ادھین مہراج کی کون کون تاریخیں ہیں؟"

"گنگو نے بتایا۔ بلدیو کے آٹھ دن باقی ہیں۔ کریم کی تاریخ بھی اُسی دن ہے۔ اَدھین مہراج کی تاریخ اُس کے چار دن بعد پڑے گی"

تھوڑی دیر گزرنے پر گرد بیت تینوں آسامیوں کو ساتھ لئے آپہنچا۔ زمیندار صاحب نے اُن لوگوں کو بٹھایا۔ چند منٹ کے بعد فرمایا

"دیکھو بھائی! تم لوگوں کی بے دخلی کی تاریخیں بالکل قریب ہیں۔ انھیں پندرہ دنوں کے اندر اندر تم سب کی تاریخیں پڑیں گی۔ اب بتاؤ کیا کہتے ہو، روپیہ دو گے یا بے دخل ہو گے؟"

کریم ذرا بات چیت کا پکا تھا، وہ بول اُٹھا:"مالک! جیسی آپ کی مرضی ہوگی ویسا ہوگا۔ آپ ہمارے ماں باپ ہیں! آپ کے جیائے جیئیں گے"

زمیندار صاحب نے جواب دیا:"جیانے کی بات تو یہ ہے۔ کہ ہمارا روپیہ دیدو۔ بس! مزے سے زمین جوتو، ہم تمھاری زمین تو چھیننا چاہتے نہیں، صرف اپنا روپیہ مانگتے ہیں۔ تم جانو ہمیں بھی تو سرکاری خزانہ ادا کرنا ہے۔ خریف کی تمام مالگذاری ہم نے اپنے پاس سے ادا کی۔ ربیع کی مالگذاری آدھی دے چکے ہیں اور آدھی باقی ہے۔ تم لوگ دو تو وہ بھی جمع کر دیجائے، نہیں تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ تم ہی بے دخل ہو جاؤ گے"

"ابھی آٹھ دس دن ہیں۔ کریم نے کہا۔ جب تک کچھ انتظام کریں گے"

ہمیں کل مالگذاری داخل کرنا ہے۔ زمیندار صاحب نے نشیب فراز سمجھایا۔"اس لئے ابھی دیدو پانچ روپے کم لے لیں گے۔ جو کچھ بقایا رہ جاوے گا وہ تم سبیتے سے دیدینا۔ تمھیں رسید کاٹ دیں گے اور تحصیل میں درخواست دیدیں گے کہ ہمارا روپیہ وصول ہوگیا۔ بس! سب جھگڑا بکھیڑا ختم ہو جائے گا۔ تم بھی پریشانی سے بچو گے۔ تاریخ کے دن تحصیل جاؤ گے، کام کا حرج ہوگا۔ دن بھر پریشانی اُٹھاؤ گے، اِس سے اچھا ہے کہ آج ہمیں روپیہ دیدو"

"آسامیوں نے دریافت کیا۔ کتنا روپیہ ہے مالک"

زمیندار صاحب نے گنگو سے کہا:"بتاؤ جی"

گنگو نے کھاتا دیکھ کر بتایا:"بہتر آٹھ آنے اَدھین مہاراج خرچہ سمیت۔ ... کے علاوہ ہیں"

کریم نے لجاجت سے کہا:"مالک! خرچہ چھوڑ دو"

زمیندار صاحب نے بھویں سکیڑ کے کہا:"خرچہ ..."

کریم بولا "ارے! آپ راجہ آدمی ہیں۔ آپ کو دس بیس روپے کی سردی گرمی نہیں ہے۔ ہم غریب آدمی مرجائیں گے۔"

زمیندار صاحب نے کریمانہ لہجے میں کہا خیر سب تو نہیں کچھ کم کر دیں گے۔ اب تو خوش ہو؟"

کریم نے سوال کیا۔ کتنا چھوڑ دوگے مالک؟

"پانچ پانچ روپے:" زمیندار صاحب نے جواب دیا۔

تینوں آسامی ایک دوسرے کی صورت تاکنے لگے۔ نظروں ہی نظروں میں انھوں نے اس معاملے پر سوال و جواب کئے کہ اب کیا ارادہ ہے؟

زمیندار صاحب نے موقعہ و محل کا لحاظ کرتے ہوئے ایک تیر اور چھوڑا "پانچ روپے خرچ میں گھٹا دیں گے اور دس پانچ بقایا رکھ لیں گے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو؟"

گنگو نے آسامیوں کو ان کا فائدہ بتاتے ہوئے کہا "دیکھو! تم لوگوں پر مالک کی کتنی مہربانی ہے؟ بے دخل ہو جانے والی زمین تمھیں پھیرے دیتے ہیں! اب ایسا موقع نہ کھونا چاہیئے۔ تحصیل جاؤگے تو وہاں پورا روپیہ لیا جائے گا۔ چاہو ایک پائی چھڑوا لو تو وہ بھی نہیں چھوٹے گی۔ کچھ آنا کانی کروگے تو بے دخل کر دیئے جاؤگے"

کریم نے سوچ بچار کر کہا "چالیس روپے تو جمع کر دیں۔ کہیں سے کام دھام کر لائیں گے"

"صرف چالیس ہی! زمیندار صاحب نے حیرت سے کہا۔ تم اندھیر ہی کرتے ہو"

اندھیر وندھیر کچھ نہیں مالک! اب کی ایسا ہی رکھو۔۔۔

زمیندار صاحب بولے "اب تم نے دیکھا نا کہ زمیندار صاحب کو ضرورت ہے۔ تو لگے دبانے! مگر اس بھول میں بھی نہ رہنا تحصیل میں تو ہمیں پورے کا پورا ملے گا۔ پھر ہم اپنی چوٹ کیوں کھائیں؟ آج نہ ملے گا تو دس روز بعد تو مل ہی جاوے گا"

کریم نے کہا "ارے توبہ توبہ مالک۔ بھلا ہم آپ کو دبائیں گے؟ ہم تو آپ کے پاؤں کی جوتی ہیں! آپ کی روٹی کماتے ہیں۔ ہم تو آپ کی مہربانی چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے دیا کی تو ہم بھی پار لگ جائیں گے"

"اچھا پچاس دیدو۔ زمیندار صاحب نے اور کم کیا۔ اس سے کم نہ لیں گے۔ پانچ روپے چھوڑ کے سترہ روپے جو باقی رہیں گے وہ تم کاتک کی فصل میں دیدینا"

کریم نے دو چار بار پھر منت سماجت کی لیکن زمیندار صاحب رضامند نہ ہوئے۔ آخر میں وہ پچاس روپے پر راضی ہو گیا۔ زمیندار صاحب بولے "اچھا جاؤ روپے لے آؤ"۔ اف! ۔۔۔۔ ہاں بلدیاوراد ھین مہراج! ... ... "

ادھین مہراج نے کہا۔ تیس روپیہ ہم بھی دیدیں گے۔"

"تیس نہیں پینتیس۔ زمیندار صاحب نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ جاؤ، تم بھی انتظام کرو ـــــ تم بولو بلدیو؟"

"پچیس روپے لے لو۔ بلدیو نے کہا۔ تو ہم بھی انتظام کریں؟"

"خیر! تیس روپے لیں گے۔ زمیندار صاحب نے کہا۔ جاؤ تم لوگوں کو تباہ کرنا نہیں چاہتے اس وجہ سے اتنی رعایت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ رعایت آج دوپہر تک کے واسطے ہے۔ دوپہر گذرنے کے بعد لین یا نہ لیں یہ ہماری مرضی رہے۔"

اس کے بعد زمیندار صاحب نے مختلف لوگوں کو طلب کیا۔ اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جن پر دعوے دائر کر رکھے تھے۔ لیکن ہنوز بے دخلی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کریم، ادھین مہراج اور بلدیو کی مثالیں سامنے رکھ کے زمیندار صاحب نے اُن کے معاملے سر کئے، جو دے سکتے تھے، راضی ہو گئے جنھیں وعدہ چکانے کا مقدور نہ تھا وہ اپنی بےبسی کے باعث منھ دیکھ کے رہ گئے۔"

زمیندار صاحب بھی تحصیل وصول میں ایسا پھنسے کہ نہ نہا سکے اور نہ دن بھر کچھ کھایا پیا۔ شام ہوتے ہوتے انھوں نے چار پانچ سو روپیہ گھسیٹ لیا۔ غریب کسانوں کے واسطے یہی بہت تھا کہ فی الحال انھیں دس بیس روپے کم دینا پڑے۔ اسی وجہ سے یہ بھولی بھالی مخلوق لالچ کے جال میں پھنس کے جس طرح بنا قرض لے کر، گہنا گرو کرکے یا فصل رہن رکھ کر زمیندار صاحب کا مطالبہ ادا کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اُسی دن بندوبست نہ کر سکنے کی وجہ سے دوسرے دن دینے کا وعدہ کر لیا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن گاؤں میں یہ اطلاع آگئی کہ قرقی ڈگری وغیرہ بند کر دی گئی ہے۔ اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی سارے گاؤں میں ہلچل پڑ گئی۔ جو آسامی روپیہ دے چکے تھے وہ ہائے ہائے کرنے لگے۔ کچھ لوگ جمع ہو کر مکھیا کے پاس گئے اور اُس سے کہا۔ "دیکھو! زمیندار صاحب نے کیسی دغا دی؟"

مکھیا نے جواب دیا۔ اس میں دغا کی کیا بات ہے۔ اُن کا روپیہ تھا انھوں نے وصول کر لیا۔ تم نہ دیا دیتے تو کیسے لیتے؟"

ایک آسامی ذرا تیز ہو کے بولا۔ "جب سرکار نے معاف کر دیا تو وہ لینے والے کون ہوتے ہیں؟ اُنھیں کل ہی معلوم ہو گیا تھا۔ جب ہی تو اتنی پھرتی کی۔"

دوسرے نے کہا۔ "میں نے اسی لئے کل روپیہ نہیں دیا۔ زمیندار صاحب نے بہت کچھ پٹی پڑھائی لیکن میں سمجھ گیا کہ اس مہربانی میں کچھ بھید ضرور ہے۔ اسی لئے میں نے آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بھاگ سیدھا تھا اس لئے بچ گیا، نہیں تو زمیندار نے تو گلا کاٹنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔"

اتنا کہہ کر وہ بڑی زور سے ہنس پڑا۔ اُسے ہنستے دیکھ کر ایک کسان کے آگ لگ گئی۔ اُس نے لال پیلی آنکھیں کرتے ہوئے کہا:
کیوں دانت نکالتے ہو؟ تم بچ گئے مگر اتنے آدمیوں کے گلے کٹ گئے تو کچھ نہیں فقط تمہارے نہ جانے سے دنیا تر گئی ــــ بے شرم کہیں کا! جان پڑتا ہے تمھیں معلوم ہو گیا تھا لیکن تم نے ہم لوگوں کو نہیں بتایا؟"
نہیں بھیا! وہ کسان سہم کر بولا۔ میں بالک کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا۔ ہاں سندیہہ ضرور تھا"
دوسرے نے بگڑ کے کہا: تو تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟"
تیسرا بول اٹھا تو خالی سندیہہ ہی بتایا ہوتا!"
"زمیندار صاحب کے ڈر سے نہیں بولا۔ اُس نے کہا۔ اُنھیں خبر لگ گئی تو کہیں گے" لوگوں کو بھڑکاتا ہے بھیا! یہ ساری خرابی کریم کے کارن ہوئی۔ سب سے پہلے روپیہ دینے پر وہی راضی ہوا"
کریم"۔ ادھیں مہاج اور بلدیو بھی وہیں کھڑے تھے۔ جب وہ راضی ہو گیا تو ہمیں بھی قبول کرنا پڑا"
بگڑے دل کسان متفق اللفظ ہو کے بولے" تو چلو، اُسے مارتے لاٹھیوں سے ٹھیک کر دیں،..... جے لٹوا دیا!
" اب مار پیٹ سے کچھ فائدہ نہیں۔ مکھیا نے سمجھایا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ روپیہ دے دیا تو کچھ بے جا نہیں ہوا۔ وہ تو دینا ہی پڑتا۔ اب نہ دینا پڑتا تو پھر دینا پڑتا"
کسانوں نے تردید کی: "سرکار نے معاف کر دیا ہے اور آپ کہتے ہیں دینا پڑتا!"
" ایک کسان بولا" معافی نہیں، ملتوی ہوئی ہے"
دوسرے نے کہا: ابھی ملتوی ہوئی ہے پھر معافی ہو جائے گی"
"خیر ایسا ہی سہی! اُس نے جواب دیا۔ مگر اب تم کیا کر سکتے ہو؟ جاؤ چپ چاپ گھر میں بیٹھو، شورش کرو گے تو زمیندار صاحب سب کو بند کروا کے بھجوا دیں گے"
" اچھی بات ہے! وہ کسان بولا۔ لیکن زمیندار صاحب اگلے سال کا لگان وصول کریں گے تو دیکھیں گے بھلا! دیکھیں تو کیسے وصول کر لیتے ہیں؟"
یہ لوگ مکھیا سے بات چیت کرنے کے بعد ایک جگہ جمع ہوئے۔ ایک شخص بولا" یہ تو دریافت کرنا چاہئے کہ زمیندار صاحب کو یہ خبر معلوم کیونکر ہوئی؟ وہ خود تو شہر گئے نہیں، نہ اُن کا کوئی آدمی گیا۔ شہر سے کل کوئی آیا بھی تو نہیں؟"
دوسرے نے کہا: ارے ہاں! خوب یاد آیا۔ کل شہر سے رگھوناتھ کا لڑکا للو آیا تھا۔ سویرے کی جو

گاڑی آتی ہے اُسی سے یہاں پہنچا ہے۔"

ایک دوسرے کسان نے سوچتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں! اُس وقت میں وہیں موجود تھا اور زمیندار صاحب سے باتیں کر رہا تھا، میرے سامنے ہی تو وہ آیا تھا۔ زمیندار صاحب اُس سے باتیں کرنے لگے تو میں وہاں سے چلا آیا۔ چلتے چلتے ایک دفعہ مڑ کے دیکھا تھا۔ للّو نے اُسی وقت کوئی لپٹا ہوا کاغذ اپنی جیب سے نکال کے زمیندار صاحب کو دے دیا تھا۔"

"ارے، تو بس اُسی نے بتایا ہوگا۔ اُس جماعت میں سے ایک بول اُٹھا۔ اب ٹھیک پتہ چل گیا۔" چلو اُس سے پوچھیں، یہ اُسی.... نے بس بُریا ہے اور ہم لوگوں کو نہیں بتایا۔"

سب لوگ رگھوناتھ اور للّو کی سات پیڑھی کو بنتے ہوئے چل کھڑے ہوئے۔ جب رگھوناتھ کے دروازے پر پہنچے۔ اُس وقت رگھوناتھ چوپال میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجمع میں سے ایک آدمی نے پکار کے کہا کیوں ٹھاکر! تم نے بھی ہمارے ساتھ دغا کی! گاؤں بھر کا گلا کٹوا دیا۔"

رگھوناتھ نے گھبرا کے جواب دیا: "کیا ہوا بھیّا؟ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

ایک دوسرا کسان آگے بڑھ کے بولا: "کل جب ہم لوگ اپنے گھر کا گنا تمہارے یہاں رکھنے لائے تھے اور روپیے گئے تھے۔ اُس وقت بھی تم نے نہیں بتایا! جب تمہارے لڑکے کو معلوم تھا تو تمہیں بھی ضرور ہی معلوم ہو گیا ہو گا! ایسی دغابازی؟ ویسے جینے مرنے میں ہم ساتھی اور اِس وقت زمیندار سے مل گئے؟ — کیوں؟ یہ وشواس گھات؟"

رگھوناتھ نے حیران ہو کے کہا: "بھیّا؟ تم سب پنچ پرمیشور ہو، تم لوگوں سے جھوٹ نہیں بولوں گا —— بھگوان جانیں مجھے کچھ نہیں معلوم؟"

ایک کسان تیز ہو کے بولا: "اپنے اُس سپوت کو تو بلاؤ، کہاں ہے؟ انگریزی پڑھ کے کیا اُس نے یہی سیکھا ہے کہ غریبوں کے گلے کٹوا دے؟"

"میں ابھی بلواتا ہوں۔ رگھوناتھ بولے۔ مجھے معلوم ہوتا تو بھلا چھپاتا۔ رام! رام!"

رگھوناتھ نے للّو کو آواز دی۔ وہ گھر کے اندر تھا۔ باہر آکے اُس نے پوچھا: "کیا ہے؟"

"کل جب تم شہر سے آئے ہو۔ رگھوناتھ نے دریافت کیا۔ اُس وقت تمہیں معلوم تھا کہ قرقی ڈگری سب بند ہو گئی ہے؟"

للّو کا چہرہ سفید ہو گیا۔ وہ گھبرا کے بولا: "نہیں تو —— کیوں؟"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ رگھوناتھ نے کڑے تیور سے کہا۔ جھوٹ بولے تو یاد رکھنا، جان کی خیر نہیں۔"

للّو باپ کے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ نظر نیچی کر کے بولا: "ہاں معلوم تھا؟"

"کیوں کر معلوم ہوا تھا؟"

للّو نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ زمیندار صاحب سے جو جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی کہہ دیں۔

رگھو ناتھ نے دانت پیستے ہوئے کہا: "تو تم نے ہم سے کپٹ کی ـــــ اُوں؟"

"زمیندار صاحب نے منع کر دیا تھا۔" للّو نے سہمے ہوئے جواب دیا۔ "اُنھوں نے تاکید کر دی تھی کہ اپنے گھر والوں سے بھی نہ کہنا۔ میں نے انھیں زبان دے دی تھی۔ اسی لئے نہیں کہا۔"

رگھو ناتھ نے بھیڑ کی طرف دیکھ کے کہا: "اب تو آپ لوگوں کو یقین آیا کہ میں اس معاملے میں بے قصور ہوں۔ اب رہا یہ نالائق! تو آپ لوگوں کے سامنے حاضر ہے۔ اسے لے جائیے اور جو جی چاہے وہ کیجئے میں کان تک نہیں ہلاؤں گا۔ کہئے تو میں اپنے ہاتھ سے اِس کا سر کاٹ کے آپ لوگوں کو دے دوں؟"

مجمع میں سے ایک آدمی نے کہا: "کام تو اس نے سر کاٹ لینے ہی کا کیا ہے مگر خیر! لڑکا ہے اِس لئے معاف کئے دیتے ہیں ـــــ اچھا، چلو انھیں زمیندار صاحب کو ختم کر دیں۔ پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا! دو چار پھانسی چڑھ جائیں گے۔ بس! اور کیا ہوگا۔"

"بھائیو! رگھو ناتھ نے کہا۔ یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ اس سے تمہارا گیا ہوا روپیہ واپس نہیں مل سکتا۔ اُلٹے اور مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

کسانوں نے کہا۔ کہ "اُس نے بڑی دغا کی ہے۔ ہمارا کلیجہ جل رہا ہے؟"

رگھو ناتھ نے کہا۔ کہ "دغا وغا کچھ نہیں۔ دنیا اپنا فائدہ دیکھتی ہے۔ اُس کا فائدہ اسی میں تھا۔ اس لئے یہ کیا۔ اصل میں دغا اس نے کی ہے (للّو کو بتا کے) اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ صرف زمیندار صاحب کو خوش کرنے کے لئے اس نے ایسا کیا۔ اگر تمہیں کسی سے بدلا لینا ہے تو اِس نالائق سے لو۔ زمیندار کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ساری خطا اِس کی ہے (للّو سے) ہٹ جا میرے سامنے سے، نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا؟"

اتنا کہہ کر رگھو ناتھ دانت پیستے ہوئے پاگل کی طرح للّو کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کے دو تین آدمی لپکے اور اُنھیں پکڑ لیا اور سمجھانے کے طور پر بولے: "جانے دو بھیا! لڑکا ہے۔ غلطی ہو گئی۔"

رگھو ناتھ غصے سے چیخ کر بولے: "لڑکا نہیں۔ ایف۔ اے، میں پڑھتا ہے۔ ہم تم سب سے زیادہ پڑھا ہے۔ پھر بھی اس کی یہ حالت ہے! اس پڑھے لکھے سے تو ہم بے پڑھے لکھے اچھے ہیں! ارے میں ایسا جانتا تو کبھی نہ پڑھواتا۔ اس نے تو آج میری ناک کٹوا دی! مجھ سے ! ـــــ اپنے باپ سے!

کپٹ کیا ہے؟ کل کو یہ زمیندار صاحب کے کہنے سے میرا سر کاٹ دے گا! اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔"
یہ کہہ کر رگھوناتھ بچوں کی طرح رونے لگے۔ تو چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔ لوگوں نے سمجھا بجھا کر رگھو کو نرم کیا۔

مجمع رگھوناتھ کو سمجھا بجھا کے واپس ہونے لگا۔ یکایک رگھوناتھ نے کہا: "ٹھہر جاؤ بھائیو! میرے لڑکے کی وجہ سے آپ لوگوں کا نقصان ہوا ہے۔ یہ نقصان میں اپنے پاس سے بھروں گا۔ بتائیے، آپ لوگوں نے کتنا کتنا روپیہ دیا ہے؟"

ایک آدمی نے جواب دیا: "ارے نہیں بھیا! تم کیوں دو گے؟ جو ہونا تھا ہو گیا! ہم سمجھیں گے دینا تو تھا ہی دیدیا۔ تم ڈنڈ کیوں سہو؟"

رگھوناتھ نے کہا۔ کہ "نہیں جب تک میں روپیہ نہیں دے دونگا میری آتما شانت نہ ہوگی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا ٹھاکر!" کسانوں نے کہا۔ جیسے تمہارا لڑکا ویسے ہمارا۔ ہم لوگ لاکھ غریب سہی لیکن ایسا نیچ کرم نہیں کرسکتے کہ تم سے ڈنڈ لیں۔ ہم لوگ ہمیشہ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے رہتے ہیں۔ روز مرتے ہیں، روز جیتے ہیں۔ ہمارا پورا بھگوان کے دیئے پڑیگا۔ تم سے ڈنڈ لینے سے پورا نہیں پڑسکتا۔ اب کانگرس کا راج ہوا ہے ——— اب کیا فکر ہے؟ بھگوان چاہیں گے تو سال چھ مہینے میں ہمارا بھی اودّھار ہو گا۔"

"رگھوناتھ بولے "بھیا! میرے اوپر کلنک تو ہو گیا؟"

"کلنک ولنک کچھ نہیں۔ کسانوں نے کہا۔ اب کوئی اِس کا نام تک نہ لے گا۔ تم بالکل نچنت رہو۔"

رگھوناتھ بولے کہ "بھیا! تکلیف نہ اُٹھانا۔ جب کوئی ضرورت پڑے چلے آنا۔ میرے گھر میں جو کچھ ہے، سب تم ہی لوگوں کا ہے۔"

"یہ تو ہم کو بھروسہ ہی ہے۔ تمھاری دعا سے مست رہتے ہیں۔ چاہے کھانے کو ایک ہی وقت ملے ——— لڑکے کو اب کچھ نہ کہنا ٹھاکر! ہم سنیں گے تو بڑا رنج ہو گا، سمجھے؟ اتنا کہہ کر اُس نے آواز لگائی۔ بول مہاتما گاندھی کی جے!"

دو گھنٹے بعد رگھوناتھ کے چھوٹے لڑکے نے جس کی عمر سات برس کی ہوگی۔ اپنے باپ کے پاس آکے ایک رقعہ دیا۔ رگھوناتھ نے پوچھا: "یہ رقعہ کس نے دیا ہے؟"
"بڑے بھیا نے۔" جواب دے کر لڑکا واپس گیا۔

رگھوناتھ سے لپٹا ہوا رقعہ کھول کے پڑھا۔

"پوجنیہ پتا جی ، چرنوں میں ہمیشہ پرنام۔

"آپ کی اور تمام کسان بھائیوں کی باتیں سُن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے خواب میں بھی یہ گمان نہیں تھا کہ جس کو میں معمولی بات سمجھ رہا ہوں وہ اتنی اہم اور نقصان رساں نکلے گی؟ میں نے بغیر سوچے سمجھے زمیندار صاحب کو قول دے دیا تھا۔ رہ رہ کر اسی کا دھیان آ رہا ہے۔ کہ مجھے اس طرح کا قول دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ جن بھائیوں کے فائدے کے لئے ہمارے دیس بھگت سماج تن، من، دھن سے کوشش کر رہی ہے۔ جن کی بھلائی پر ہمارے دیس کا کلیان ہے اُنھیں کے ساتھ میں نے وشواس گھات کیا؟ اس سے زیادہ اور کون سا پاپ ہو سکتا ہے؟ اور آپ کے سامنے سر اُٹھا کے چلنے کے لائق نہیں رہا! اس لئے میرا مر جانا ہی بہتر ہے! پتا جی! آپ اپنے گنہگار بیٹے کا قصور معاف کر کے بھول جائیے۔"

آپکا نالائق بیٹا "للّو"

رگھوناتھ اس رقعہ کو پڑھنے کے بعد ہی پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے للّو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ مگر اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ ہائے بیٹا! کا نعرہ لگا کے بے ہوش ہو گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا پاس پڑوس کے لوگ دوڑ آئے۔ گاؤں کے بڑھئی نے آ کر کمرے کے دروازے چیرے۔ دروازہ کھلنے پر لوگوں نے دیکھا کہ زمین پر ایک مونڈھا اُلٹا پڑا ہے اور چھت کی کڑی میں لگے ہوئے ہُک سے للّو کا بیجان پیکر لٹکا ہوا حسرت و عبرت کا مرقع پیش کر رہا ہے۔ افسوس

"حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

(ترجمہ)

جذباتِ گشتہ

(از۔ ڈی۔ پی۔ بھٹناگر گشتہ)

رموزِ قلزم و ساحل سے آشنا ہوں میں — اُمید میرا سفینہ ہے۔ ناخدا ہوں میں
بساط کیا مری ہستی کی چیز کیا ہوں میں — جو ٹوٹ جائے نظر سے وہ آئینہ ہوں میں
بساطِ دہر میں ہرچند خود نما ہوں میں — نظر سے دیکھ لیں اہلِ نظر کہ کیا ہوں میں
کسی پہ اپنی حقیقت کا راز کیا کھولوں — جو ابتدا نہیں رکھتی وہ انتہا ہوں میں
فریب دے نہ مجھے گردِ کاروانِ حیات — نشان سامنے منزل کا دیکھتا ہوں میں
خیال جنبشِ دامن کی کیا ضرورت ہے — چراغ صبح ہوں۔ لو۔ خود ہی بجھ رہا ہوں میں
دھواں بھی میرے نشیمن سے اب نہیں اُٹھتا — کہ تنکے تنکے کو چُن چُن کر جلا چکا ہوں میں
جو غم سما نہ سکا وسعتِ دو عالم میں — وہ ایک گوشۂ دل میں چھپا رہا ہوں میں
طریق اپنا زمانہ سے ہے جدا گشتہ — خدا پرست [illegible]

گاؤں

(از حضرت شاد عارفی)

سرزمینِ شعر کے اجزاء ابھی تھے دور دور
طبع موزوں کو نہ تھا اپنے ارادوں پر عبور

گلستانِ فکر میں سبزہ ابھی لہکا نہ تھا
پتہ پتہ گلبنِ الفاظ کا مہکا نہ تھا

محفلِ احباب میں شمعِ سخن تھی گُل ابھی
نزہتِ معنیٰ سے کوسوں دور تھی بلبل ابھی

بزم پروین میں گُلِ بے خار کی آمد نہ تھی
کہکشاں کی راہ سے اشعار کی آمد نہ تھی

لیکن اک شاعر کے پنجہ میں وہ دل ہو یا دماغ
ایک ساعت بھی نہیں پاتا کبھی امن و فراغ

گدگدایا دل کا پہلو شوخیٔ الہام نے
رقص میں آئے مضامین حافظہ کے سامنے

"سہ پہر" کا شام نے گیسو میں اپنے بل دیا
گھر سے میں تفریح کی خاطر نکل کر چل دیا

چلدیا تہذیبِ موجودہ کے ہنگاموں سے دور
ناگوارِ سامعہ تھا شہر کا شور و نشور

دیکھتا جاتا تھا ہر شے کو نگاہِ غور سے
محو نفسیات تھا میں ناقدانہ طور سے

چلتے چلتے آخرش پہونچا میں ایسے گاؤں میں
آدمی چوپال میں۔ چوپال بڑ کی چھاؤں میں

کس مپرسی میں اپاہج تھی ہر اک دہقان کی عقل
جیسے بن مانس "کوئی۔ کرتا ہو انسانوں کی نقل

کر چکے تھے اُن کے اعضا اپنی عریانی پہ صبر
انکی بدحالی کو تھا سر در گریبانی پہ صبر

دل کی رگ رگ پر مسلط بھوت نادانی کا تھا
نبض کے اندر دھما کا زشت سامانی کا تھا

تھا غلاظت پر مکانوں کا یہاں نظم و نسق
جنکی بنیادیں سڑی مچھلی کے اوپر منطبق

صحن میں سوکھی ہوئی سُٹھی پہ کتے گامزن
برتنوں پر رال ٹپکاتے ہوئے جن کے دہن

کنج میں ٹوٹے ہوئے ہل۔ الگنی پر گدڑیاں
جم رہا تھا جنپہ چولھوں اور حقوں کا دھواں

کوٹھری میں ایک چکی۔ چار باسن دو پلنگ
عافیت کا قافیہ اس قبر انسانی میں تنگ

چھپروں کے قلب شق۔ تارے نظر آتے ہوئے
بانغ پر چگا دڑوں کے غول منڈلاتے ہوئے

گھر کی دیواروں پہ جالے سو بہ سو لپٹے ہوئے
خشک بیلوں کی اُداسی میں کدو لپٹے ہوئے

دکی بدبو ہوا میں دانت چمکاتی ہوئی
ڈانتوں کی طرح مغز زندگی کھاتی ہوئی
ول پر ہڈیوں کے ڈھانچ - مردہ جانور
جن سے گھل مل کر ہواؤں میں عفونت اوج پر
لعفن گاؤں کے نزدیک گندی جھیل میں
جیسے گیدڑ گر کے سڑ جاتا ہے بگڑے نیل میں
ر.گوبر - مینگنی - میٹھے کنویں کے آس پاس
جن سے جر ثوموں کی افزائش میں ہر قطرہ کا ناس
غ اہل صفا سے دور ان کی ہندگی
انکی صحت پر اثر انداز گھر کی گندگی
ں میں بوڑھے شعلۂ غم کی لپٹ کھائے ہوئے
نوجوان بیگار کے جھونکوں سے مرجھائے ہوئے
ریاں انکی جوانی میں بڑھاپے کا شکار
اس چمن میں آئی تھی گویا خزاں لیکر بہار
ھندلا دھندلا انکی دوشیزاؤں کا حسن ملول
جیسے آخوری نجاست کے قرین لالے کے پھول
کا حسن دلنشیں یوں میلی پوشاک میں
جیسے "رانی رات کی" روندی گئی ہو خاک میں
یلی پھیکی انکھڑیوں میں یوں نگاہِ سحر فن
جیسے مایوسی کے عالم میں غزالانِ ختن
نک رخساروں پہ زردی کی کچھ ایسی ریل پیل
سرخ پھولوں کو چھپالے جسطرح "آکاش بیل"
ں کے سادہ لوح بچوں پر غلاظت کا یہ ڈھنگ
چاندنی راتوں میں جیسے چاند پر کہرے کا زنگ
یلے کھانے میں دورانِ سے نفاست کے قیود
جیسے کیچڑ میں بطوں کا جوشش شرب الیہود
ذنٹ - گھوڑے - بھیڑ - سور گھر میں رہتے ہوں جہاں
یہ سرو سامان اور تازہ ہوائیں - الامان
تروں کو جیسے بدبو سے نہیں خوف گزند
ہند کے دہقان کو دنیا ہی جہنم ہے پسند

حالت مذموم کا کچھ ان کو اندازہ نہیں
ساغر "بدگل" کی تہ میں کوئی خمیازہ نہیں

رباعیاتِ جوش

ہر ذرہ آفتاب ہے میرے آگے
ہر برگ ہے اک کتاب میرے آگے
وو چشم بشر ہے جس کے جلووں کا حجاب
وہ حسن ہے بے نقاب میرے آگے

(۲)

خم تحقیق دل پہ کھائے ہوئے آؤ
نور مطلق سے لو لگائے ہوئے آؤ
رمر کے میں ہر بار نہیں دیکھوں گا
اے شمس و قمر قدم بڑھائے ہوئے آؤ

(کلیم) جوش ملیح آبادی

تنقید کتب

آرین میڈیکل سائنس[1]

قدیم متمدن دنیا کی تقریباً ہر قوم نے ہر علم یا فن کی ایجاد کو کسی دیوتا سے منسوب کیا ہے۔ یہی حال علم طب کا ہے۔ قدیم یونانیوں میں علم طب کا موجد اسقلیبوس تھا، جو اپالو دیوتا اور کورونیس دیوی کا فرزند سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح قدیم ہندوؤں میں علم طب کو جسے سنسکرت زبان میں "آیور وید" کہتے ہیں (آیو = زندگی + وید=علم= زندگی کا علم) برہما جی سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسے الہامی سمجھا جاتا ہے۔ برہما جی نے ایور وید کو سَو ادھیاؤں یعنی بابوں میں مرتب کیا۔ ہر باب میں سَو سَو اشلوک درج کئے۔ اس میں علم الحیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اور وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنی زندگی کو گھٹا بڑھا سکتا ہے۔ کتاب میں تمام بیماریوں کی نوعیت ان کے اسباب اور معالجہ کی صراحت کی گئی ہے۔ کل ایور وید کے آٹھ حصے ہیں:- (۱) پہلا حصہ جراحی سے تعلق رکھتا ہے (۲) دوسرے حصہ میں اعضائے ظاہری: مثلاً منھ، آنکھ، ناک، کان وغیرہ کے امراض کی تشخیص اور علاج درج ہیں (۳) تیسرے حصہ میں اندرونی امراض کی تشخیص اور علاج درج ہیں۔ (۴) چوتھا حصہ بھوت ودیا سے متعلق ہے جس میں آسیب، سایہ، بھوت پریت، دعا، اُن، صدقوں اور نذر بھینٹ وغیرہ کا ذکر ہے۔ (۵) پانچویں حصہ میں بچوں کی بیماریاں اور ان کے علاج ہیں (۶) چھٹے حصہ میں زہر و فادِ زہر کا ذکر ہے (۷) ساتواں حصہ رسائن سے متعلق ہے جس میں کشتہ جات کا ذکر ہے (۸) آٹھویں حصہ میں تجدید شباب کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے برہما جی نے آیور وید کی تعلیم دکش پرجاپتی کو دی۔ اور پرجاپتی نے سوریہ نارائن کے توام لڑکوں اسونی کماروں کو یہ علم سکھایا جنھوں نے ادویات اور جراحی کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اسونی کماروں سے یہ علم اندر نے سیکھا۔ اندر نے اپنی طرف سے ایترے رشی کو سکھایا اور اس

[1] ملنے کا پتہ:- ڈاکٹر راج کشور وید ریاست گونڈل۔ رادھا سوامی دواگھر ڈاکخانہ رادھا سوامی دھام ضلع مرزاپور قیمت دو روپیہ حجم ۲۲۸ صفحات

نے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے زیادہ مستند اتریے سنہتا سمجھی جاتی ہے۔ اتریے رشی سے علم و فن طب کو اگنی ویش، بھید، جیتوکرن، پاراشر، کرشن پانی اور ہرت نے سیکھا۔ اگنی ویش کی تصنیف ندان انجن اور ہرت کی ہرت سنہتا مشہور و مستند کتابیں ہیں۔

آیورویدکے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ ہمالیہ پر بہت سے بڑے بڑے رشی منی جمع ہوئے اس زمانہ میں بیماریوں کا زور تھا، اس لئے سب رشیوں نے بھردواج کو آیوروید سیکھنے اندر کے پاس بھیجا۔ چنانچہ وہ اندر لوک سے آیوروید سیکھ کر آئے اور لوگوں کو امراض سے نجات بخشی۔

تیسری روایت یہ ہے کہ جب دیوتاؤں نے سمندر منتھن کیا تو دھنونتری بھی پیدا ہوئے ان کے ایک ایک ہاتھ میں آیوروید اور دوسرے ہاتھ میں امرت یعنی آب حیات کا جام تھا۔ دھنونتری دیوتاؤں کے طبیب تھے اور قدیم ہندوستان میں ان کو وہی رتبہ حاصل تھا جو قدیم یونان میں اسقلیبوس کا تھا۔ ہندوستان میں دھنونتری ہی کے فیض سے علم طب کی تعلیم عام ہوئی۔ ویدک زمانہ کے سب سے زیادہ مشہور طبیب وشدھ منی کے بیٹے چرک تھے۔ لیکن فن جراحی میں سب سے بڑا سوشرت کو تسلیم کیا جاتا ہے جو سری رامچندر کے ہمعصر وسوامتر کے بیٹے تھے۔ چرک اور سوشرت اس وقت بھی علم طب اور جراحی کی بہت بلند پایہ کتابیں ہیں۔

ایک قدیم کہاوت کا ترجمہ ہے۔ کہ مادھو تشخیص امراض میں، واگ بھٹ علاج و تجویز نسخہ جات میں، سوشرت جراحی میں اور چرک چکتسا میں بے نظیر تھے۔

قدیم ہندوستانی علم طب کی یہ مختصر ریویو ملا ہے۔ جو صاحب اس کی مفصل اور مدلل تاریخ دیکھنا چاہیں وہ ہز ہائینس مہاراجہ شری بھگوت سنگھ جی بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای فرمانروائے ریاست گونڈل کی کتاب "آرین میڈیکل سائنس" یا اس کا ترجمہ جو ڈاکٹر رام کشور سنگھ صاحب راج وید نے کیا ہے ملاحظہ فرمائیں

یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں ہندوؤں کی قدیم تہذیب کا ذکر ہے دوسرے باب میں ہندو طب کے قدیم مصنفین۔ تیسرے میں آفرنیش عالم کے متعلق ہندوؤں کے خیالات، چوتھے میں عورتوں کے ایام ماہواری کا بیان ہے۔ پانچویں میں حفظان صحت اور صفائی کے اصول درج ہیں چھٹے میں آیورویدک اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ساتویں میں علم الادویہ کا ذکر ہے۔ آٹھویں میں امراض کی تشخیص و علاج۔ نویں میں ویدوں کی قابلیت و تشخیص کی لیاقت کا ذکر ہے۔ دسویں میں جراحی کا بیان۔ گیارہویں میں ہندوستانی طب و جراحی میں انقلابات، بارہویں میں آخری ریمارک۔ غرض اس طرح اس کتاب میں طب کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آخری باب میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو ڈاکٹری علاج کے مقابلہ میں

اپنے دیش کی جڑی بوٹیوں کے علاج کو کیوں ترجیح دینا چاہیئے۔

اس کتاب میں دوا سازی کے قدیم طریقوں اور اُن کے ظروف نیز قدیم آلات جراحی کے نقشے بھی دئے گئے ہیں جس سے کتاب کے مضامین اور بھی واضح ہو گئے ہیں۔ عوام کی سہولت کے لئے قدیم کتابوں میں دواؤں کے جو وزن درج کئے گئے ہیں ان کی تشریح بھی ایک عام فہم نقشہ میں کر دی گئی ہے۔

بھوت پریت کے اثر زائل کرنے کے لئے قدیم زمانہ میں جس قسم کے تعویذوں یا جنتروں سے کام لیا جاتا تھا ان کے متعلق اس کتاب میں چار نقشے دے دیئے گئے ہیں۔ غرض اس چھوٹی سی کتاب میں لائق مصنف نے انگریزی، سنسکرت، عربی و فارسی کتابوں کا عطر نکال کر بھر دیا ہے۔ جس کے لئے ہم اس کے مصنف مہاراجہ صاحب کی قابلیت کی کافی تعریف نہیں کر سکتے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جو شخص اس کتاب کا بغور مطالعہ کرے گا وہ ہندوستان کی اکثر جڑی بوٹیوں کی ماہیت اور ان کے خواص سے واقف ہو جائیگا۔

ڈاکٹر رام کشور سنگھ نے اصل کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب گونڈل کی مختصر سوانح عمری بھی دیدی ہے۔ جو واقعی ایک ضروری اضافہ ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے مہاراجہ کا جو قصیدہ درج کیا ہے وہ ہمارے خیال میں قطعی غیر ضروری تھا۔ خصوصاً اسلئے کہ اس میں زبان اور فن کی بیشمار غلطیاں ہیں۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جس میں ایورویدک کی چند مشہور اور مستند تصانیف کی فہرست معہ ان کے مصنفین کے نام کے درج ہے۔ زمانہ حال کی کتابوں کا سنِ تصنیف بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اور ہر کتاب کے مضامین کا مختصر ذکر کر دیا گیا ہے۔

فینائل سازی[1]

آجکل بیکاری و بے روزگاری کے زمانہ میں جبکہ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کو سخت پریشانی کا سامنا ہو رہا ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر مفید ثابت ہونا چاہیئے۔ پروفیسر ایف سی۔ ترپتن پروفیسر انڈسٹریل کیمسٹری نے یہ کتاب اسی غرض سے لکھی ہے کہ ملک کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ تھوڑے سے سرمایہ کے ساتھ صنعت و حرفت کی طرف مائل ہو اور فینائل اور دیگر جراثیم کش چیزیں تیار کر کے نفع کمائے۔ پروفیسر صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں مختلف قسم کے جراثیم کش مرکبات بنانے کے نسخے اور طریقے وغیرہ عام فہم اور سلیس زبان میں درج کرنے ہیں۔ آخر میں ان کارخانوں کے پتے بھی لکھ دیئے ہیں جہاں سے ضروری اجزا مل سکتے ہیں۔

یادگار ماجد[1]

سید ماجد علی مرحوم ایڈووکیٹ و گورنمنٹ پلیڈر الہ آباد کی طرحی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جسے

[1] مجلد لکھائی چھپائی معمولی۔ کاغذ اچھا۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ جو بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ ہندوستان [illegible]
[illegible]

رفتار زمانہ

ہماری یونیورسٹیاں

صوبہ متحدہ کی یونیورسٹیاں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کیلئے تمام ملک میں مشہور ہیں۔ اس صوبہ میں اسوقت پانچ یونیورسٹیاں قائم ہیں جنمیں بنارس، علیگڈھ یونیورسٹیاں آل انڈیا حیثیت رکھتی ہیں، مگر الہ آباد یونیورسٹی ان سب میں پرانی اور اپنے طرز کی بہترین یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے۔ یہ ۱۸۸۷ء میں سر الفریڈ لائل لفٹننٹ گورنر کے عہد حکومت میں قائم ہوئی تھی اور اب اس کو قائم ہوئے پچاس سال ہوگئے چنانچہ [illegible] دسمبر ۱۹۳۷ء کو اس کی گولڈن جوبلی بڑے دھوم دھام سے الہ آباد میں منائی گئی۔ یوں تو موجودہ طریقہ تعلیم کے جو نقائص اور کمزوریاں ہیں وہ الہ آباد یونیورسٹی میں بھی نظر آتی ہیں تاہم اس یونیورسٹی نے گذشتہ پچاس سال کے دور میں صوبہ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اور اسوقت صوبہ میں جو پبلک لائف نظر آتی ہے وہ بہت کچھ اسی یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ارباب وطن کی کارگذاری ہے۔

جشن جوبلی کے اعزاز میں کامل ایک ہفتہ تک بیسیوں علمی و ادبی جلسے ہوئے۔ ملک کے بڑے بڑے قابل علماء کے لکچر ہوئے۔ معمولی کنووکیشن کے علاوہ جوبلی کے سلسلے میں ایک خاص کنووکیشن ہوا جسمیں ہندوستان اور غیر ممالک کی یونیورسٹیوں کے قائمقام شریک ہوئے اور جن مقامات سے قائمقام نہیں آسکے وہاں سے خاص پیغامات مبارکباد موصول ہوئے۔

اس سلسلے میں یونیورسٹی نے کئی قابل اصحاب کو اعزازی ڈگریاں دیں۔ اور مقام شکر ہے کہ اردو و ہندی ادیبوں کے حقوق کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ چنانچہ ہمارے مکرم مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اور مشہور ہندی ادیب راؤ راجہ پنڈت شیام بہاری مصر کی علمی فضیلت اور ادبی خدمات کی قدردانی میں ڈاکٹر کی فاضلانہ ڈگریاں عطا کیں۔

ہمارے مخدوم پنڈت اقبال نرائن گرٹو نے جو آج چھ سال سے اس یونیورسٹی کے ناظم اعلیٰ یعنی وائس چانسلر ہیں۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر یونیورسٹی کے مقاصد کی توسیع و ترقی کی غرض سے ایک جوبلی فنڈ قائم کیا، جسمیں اسوقت تک ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع ہوچکا ہے۔ اس فنڈ میں سب سے بڑی رقم پچاس ہزار روپیہ کی مہاراجہ صاحب دربھنگہ نے دی ہے اس کے بعد نواب صاحب بھوپال کا پچیس ۲۵ ہزار روپیہ کا قابل قدر عطیہ ہے۔ دیگر رقمیں یونیورسٹی کے قدردانوں اور سابق طلباء نے دی ہیں۔ غرض اسطرح گرٹو صاحب کی کوشش سے اس جوبلی کی کئی مستقل یادگاریں یونیورسٹی میں قائم ہوجائیں گی۔

طلباء کی عام خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے امسال سالانہ ایڈریس پڑھنے کیلئے پنڈت مدن موہن مالوی سے

درخواست کی گئی جو خود بھی اِسی یونیورسٹی کے پُرانے گریجویٹ ہیں اور جنکی ملکی و تعلیمی خدمات مسلمہ ہیں۔ آپ نے اپنا ایڈریس زبانی ارشاد فرمایا اور انگریزی کے بجائے ہندی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں اِس سے پہلے صرف پچھلے سال ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کلکتہ یونیورسٹی میں اپنا ایڈریس بنگلہ زبان میں پڑھا تھا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ الٰہ آباد میں ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ چانسلر یونیورسٹی کی صدارت میں انگریزی پر دیسی زبان کو ترجیح دی گئی۔

پنڈت مالوی نے جاپان کی موجودہ ترقی کا اِس پسماندہ مُلک کی پست حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۶۵ء تک جاپان کی حالت کسی طرح ہندوستان سے بہتر نہ تھی لیکن پچھلے پچاس سال کے عرصہ میں اُسنے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دُنیا میں بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ کرنے کو مستعد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اِس غیر معمولی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ جاپان نے مُلک کے ہر بچّے کو تعلیم دینا اپنا فرض سمجھا۔ دوسرے ہر جاپانی کو اپنے وطن سے محبت کرنے اور اسکی خدمت میں خلوص و ایثار سے کام لینے کی تلقین کیگئی چنانچہ آج وہاں کے سپاہی۔ فوجی سردار، علماء اور فضلا سبھی حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جاپان میں ابتدائی تعلیم کی طرح فوجی تعلیم بھی جبری ہے۔ اور مُلک کا اقتصادی نظام ایسا دُرست کر دیا گیا ہے کہ ہر شخص خوشحال اور فارغ البال ہے۔ ہندوستان کی کیفیت بالکل برعکس ہے اور پچیس پچیس سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی یہاں کے ہزارہا ایم۔اے، بی۔اے، اور دیگر اعلیٰ ڈگری یافتہ نوجوان بیکار رہتے ہوئے نانِ شبینہ کو محتاج ہو رہے ہیں۔ یہ افسوسناک حالت اس وجہ سے ہے کہ [illegible] خام پیداوار اور قدرتی دولت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ اور اب اُس مرض کا یہی علاج ہے کہ [illegible] کے ذریعے ملک کے قدرتی ذرائع کو ترقی دیں۔ آپ نے نئے گریجویٹوں سے اپیل کی کہ وہ موجودہ [illegible] کو سمجھیں۔ مقتضائے وقت کا لحاظ رکھیں۔ ہمیشہ سچ بولیں اور اپنے ایمان اور دھرم کے مطابق [illegible] میدان عمل کے بہادر سپاہی بنیں اور جس کام کو ہاتھ میں لیں اور سرگرمی و [illegible] عقل مزاجی سے [illegible] تعلیم یافتہ اشخاص سے اِس بات کی بھی درخواست کی کہ وہ کم از کم تین ماہ اپنے ناخواندہ بھائیوں کی خدمت رضاکارانہ طور پر اپنے ذمہ لے کر عوام سے جہالت کا نقص دور کرنے کوشش [illegible]

عرصہ ہوا جاپان کے معزز ترین طبقہ نے خود اپنی مرضی سے اپنے خاص حقوق [illegible] اچھوت ذات کے لوگوں کو مساوی حقوق دیدیے تھے جس کے بعد نہ صرف ملکی ترقی کا [illegible] تفریق ذات کا بھی جھگڑا باقی نہ رہا۔ کیا ہمارے معزز ترین [illegible] لیڈران قوم [illegible] باب میں اِسی قسم کی فراخ حوصلگی سے کام لینے [illegible] تیار ہیں؟

ETA.

پٹنہ یونیورسٹی | اس سے چند ہی دن پہلے پٹنہ یونیورسٹی کے کانوکیشن ایڈریس میں مسٹر شیام پرشاد مکرجی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے ایک قابل قدر ایڈریس پڑھا جسمیں آپ نے قدیم ہندوستان کی علمی تہذیب و اخلاق کا ذکر کرنیکے بعد ہندوستان کے زوال کے اسباب پر ایک غائر نظر ڈالی۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں سستی اور نااتفاقی کے قدرتی اسباب موجود ہیں مگر مسٹر مکرجی نے ان تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر پُرانی تہذیب کی عالمگیر ہمدردی اور وسیع الخیالی میں مُلکی زوال کے جراثیم چھپے ہوتے یا اسکا روحانی نقطۂ خیال ملکی آزادی کیلئے مضر ہوتا تو ہمارے بزرگوں میں صلح پسندی کے باوجود چندر گپت، پرتاپ سنگھ، شیواجی اور رنجیت سنگھ جیسے اولوالعزم اور بہادر محبِ وطن کیسے پیدا ہو سکتے؟ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قدیم زمانہ میں یہاں کے لوگ بھی غیر ممالک سے تجارت کرتے تھے اور دوسرے مُلکوں میں جاکر اپنی تہذیب کی تلقین و توسیع کرتے رہتے تھے۔ اور عام عقائد کے بموجب روحانی نجات کا دروازہ صرف بہادروں ہی کیلئے کُھلا ہوا تھا۔ مسٹر موصوف نے اُن حضرات کی پُرزور تردید کی جو ہندوستان کی سستی و کاہلی کی ذمہ داری یہاں کی آب و ہوا پر ڈالتے ہیں۔ اب اس کے قائل نہیں ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل دُرست ہے کہ اگر ہماری آب و ہوا میں کوئی ایسا نقص ہوتا تو مرہٹے، روہیلے جاٹ اور سکھ کیسے اُبھر سکتے؟ راجپوت اِس قدر بہادری و جانبازی کیسے دکھا سکتے؟ اور میسور کے حیدر علی مرہٹوں اور انگریزوں دونوں کا کسطرح مقابلہ کر سکتے؟ ان دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ یہاں کی آب و ہوا میں کوئی نقص ہے اور نہ ہماری تہذیب ہی کا کوئی قصور ہے۔ بلکہ ہمارے زوال اور ہماری غلامی اور بے بسی کی اصلی وجہ ہماری باہمی نااتفاقی اور تمدّنی بدنظمی ہے۔ انھیں کی بدولت ضرورت اور مصیبت کیوقت ہندوستانی کبھی اتفاق و یکجہتی سے کام نہ لے سکے۔ اور انھیں دو باتوں سے ہندوستان کا سیاسی انحطاط ہوگیا۔ چنانچہ اگرچہ ہم نے اپنی ہمسایہ قوموں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن ہماری تمامتر دلچپی ہمیشہ اندرونی مناقشات اور باہمی [illegible] تک [illegible] رہی۔

[illegible] میں آپ نے اِسبات پر زور دیا کہ گو زمانہ حال میں بعض قومی ضروریات پورا کرنے کی انتہائی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن جبتک ہندوستان کو دُنیا کے آزاد ملکوں کی صف میں جگہ نہ مل جائے گی، علم و عمل کے کسی میدان میں ہم کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکیں گے۔ بیشک دُنیا کے بڑے سے بڑے مادّی فوائد بھی آزادی کی محرومی کا [illegible] نہیں ہو سکتے۔

[illegible] کے بعد آپ نے آزادی کی تعریف میں ایک برٹش مدبر کی رائے پیش کی۔ جس نے اپنی ایک [illegible] سوال پر اظہار خیالات کیا ہے کہ ایک روشن خیال آدمی کی زندگی کا کیا معراج یا منزل مقصود [illegible] مباحثہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ قوم کو غیر مُلکی لوگوں کے تسلط سے قطعی آزاد

ہونا چاہیے بلکہ اُسکا فتویٰ یہ ہے کہ کسی فرد و بشر کو آزادی سے محروم نہ ہونا چاہیے یعنی ہر شخص کو اپنی رائے اور مرضی کے مطابق خیال، عمل، قول و فعل اور پرستش کی پوری آزادی حاصل رہنا چاہیے۔ بشرطیکہ اس سے دوسروں کے حقوق میں کوئی مداخلت بیجا نہ ہوتی ہو۔ اسطرح ہر شخص کو انصاف و مساوات کے ماتحت اپنے جائز مشاغل میں مصروف رہنے کی پوری آزادی رہنا چاہیے۔ مدبر موصوف کی رائے ہے کہ پیدائش سے لے کر وفات تک ہر شخص کو اُن جکڑبندیوں سے آزاد رہنا چاہیے جو ماتحتی، افلاس، کثرتِ کار اور دیگر پریشان کُن حالات کی بدولت اسکی ترقی میں سدِ راہ ہوتی رہتی ہیں۔

بقول مسٹر مُکرجی آزادی کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ ہماری ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو بلکہ ہم کو ترقی کے ہر ممکن موقعے اور دیگر سہولتیں حاصل ہوں۔ حُریت کا تخئیل محض ذاتی آزادی سے مکمل نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس کے ضروری ارکان قومی، سیاسی، ذاتی اور اقتصادی ضروریات کا پورا ہونا ہے۔ مدبر موصوف نے "آزاد شخص" کی تعریف یہ کی ہے کہ اُس کا مُلک خود مختار ہو اور وہ ایسی سلطنت کی رعایا ہو جو جمہوری ہو۔ ایسی سوسائٹی کا رکن ہو جہاں سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہو اور عوام پر کم سے کم پابندیاں عائد کی جاتی ہوں۔ وہ ایسے اقتصادی نظام کا ماتحت ہو جس سے قومی فوائد پورے طور سے محفوظ ہوں۔ آزاد مُلک کے ہر باشندہ کو ذریعہ معاش پیدا کرنیکی سہولت اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور ذاتی قابلیت سے ترقی کرنے کا پورا موقعہ حاصل ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آج اس قسم کی آزادی جس کا نقشہ سطور بالا میں اس شرح و بسط کے ساتھ کھینچا گیا ہے ہم کو اپنے ملک میں حاصل نہیں ہے۔ اور جب تک یہ آزادی ہم کو نصیب نہ ہوگی بقول مسٹر مُکرجی ہم کو نہ وہ عظمت ہی حاصل ہوگی اور نہ مُسرت ہی نصیب ہوگی جو اس کے قدیم عروج و تہذیب کی نمایاں ...

اناملی یونیورسٹی اناملی یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں رائٹ آنریبل سری واسر شاستری نے طلبہ کو یہ تلقین کی کہ خواہ وہ کسی پارٹی کے ممبر ہوں لیکن اپنی جماعت کے ساتھ وفاداری سے ... مُلک کے مجموعی مفاد کو سب باتوں پر مقدم سمجھیں۔

اس کے بعد آپ نے اس بات کی تلقین کی کہ دوسری پارٹیوں کو خواہ مخواہ اپنا اور ... جماعت کا ... جن سے ہر وقت بچے رہنا لازمی اور جنھیں ملعون و مردود سمجھنا اور نقصان پہونچانا فرض ہو ... اور معیوب ہے۔ آپ نے کہا کہ مختلف خیالات و عقائد کے لوگ بھی آپ کے ہم سفر ہیں اور ایک ہی منزل کو دوسرے راستوں سے پہونچنا چاہتے ہیں۔ شخصی آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے جسکی ... سب کا یکساں فرض ہے لیکن ... اپنا دائرہ عمل و خیال محدود نہ کر دینا چاہیے تاکہ ...

یکجائی برتنے میں ہم کو دقت نہ ہو۔ بہرحال اہلِ ملک کے سامنے یہ معراج پیشِ نظر ہونا چاہیئے کہ فکر، قول اور عمل سب میں یگانگت و ہم آہنگی قائم ہوسکے۔

ناگپور یونیورسٹی | ہمارے مخدوم مسٹر سچدانند سنہا، ایکس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے جن کو الہ آباد یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کرکے خود اپنی عزت افزائی کی ہے۔ اس سال ناگپور یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ آجکل بعض حلقوں میں یونیورسٹی تعلیم کی مخالفت میں بہت کچھ زور صرف ہو رہا ہے۔ ایسے [illegible] آپ نے اپنے فاضلانہ ایڈریس میں ان بیش بہا خدمات کا مفصل ذکر کیا جو ہماری موجودہ یونیورسٹیوں نے ملک کی انجام دی ہیں۔ واقعی یونیورسٹی تعلیم کی یہ حمایت بہت ہی مناسب وقت ہے اور آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ یہ ہندوستان کی تمام موجودہ ترقی جو زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوئی ہے۔ انھیں یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یونیورسٹی طالب علموں ہی نے ہندوستان کو اس درجہ ترقی تک پہونچایا۔ [illegible] اس قدیم ملک میں نئی جان ڈالی ہے۔ اس طرح گو بھی غیر یافتہ لوگوں نے یکسر حصہ نہیں لیا تاہم اس رائے کی تردید ناممکن ہے کہ یونیورسٹی تعلیم کی امداد کے بغیر یہ ترقی ممکن نہ ہوتی

آپ کی یہ رائے اور خواہش بھی بیجا نہیں ہے کہ ملک کی آئندہ قسمت بھی انھیں لوگوں کے ہاتھ میں رہے جو آج ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یونیورسٹی تعلیم کی حوصلہ شکنی ملک کے ساتھ انتہائی زیادتی ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی | کے جلسہ تقسیم اسناد میں مسٹر ہیکار نے بھی آزادی و آزاد خیالی کے اہم مسئلہ پر اظہار خیالات فرمایا:-

"آپ نے کہا کہ اگر یونیورسٹی تعلیم سے نوجوانوں کو حصولِ معاش میں مدد ملتی ہے تو یہ اس تعلیم کا ایک ضمنی نفع ہے۔ با اثر شہریت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اہل ملک اپنی تعلیم و تربیت کی بدولت پبلک معاملات اور ملکی ضروریات کو اپنے ذاتی کاروبار کا ایک ضروری جزو سمجھیں اور ان کے سمجھنے اور حل کرنے میں [illegible] احتیاط و توجہ اور قابلیت و دیانت سے کام لیں جو وہ اپنے ذاتی مشاغل میں ضروری سمجھتے ہیں"۔

دنیا کے موجودہ سیاسی حالات پر نظر کرتے ہوئے مسٹر ہیکار نے جمہوری طرز سلطنت اور مطلق العنان ڈکٹیٹرشپ کا مقابلہ کیا، اور فرمایا کہ انسانی عقل کا آزادانہ استعمال ہی جمہوری حکومت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ کی تعلیمی معیار میں زمین آسمان کا فرق ہے، ڈکٹیٹرشپ کو کورانہ تقلید اور بلاعذر اطاعت کی ضرورت ہے مگر جمہوریت کیلئے آزادی رائے لازمی ہے۔ جمہوری حکومت کو خیال اور عمل دونوں میں باغیانہ اولوالعزمی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے [illegible] جمہوریت اپنے نوجوانوں کے سامنے جو معیار زندگی پیش کرتی ہے اُسمیں کسی بات کو آنکھ بند کرکے تسلیم کرنا داخل نہیں ہوتا بلکہ

اسکی تلقین ہوتی ہے کہ ہر بات کو سوچ سمجھکر رائے قائم کیجائے اور ہر معاملے کے متعلق تمام شکوک رفع کرکے اور تمام سوالات حل کرکے سچائی کی تلاش و تحقیق کی جائے۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کی رائے میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ کالجوں کے احاطوں میں آزادی کی روح کو ہر طرح برقرار رکھا جائے۔ تاکہ عقلِ انسانی کو تکمیل کا درجہ حاصل ہو سکے۔ اور ہمارے تعلیمی مدرسے اور دارالعلوم صحیح معنوں میں زمانہ مستقبل کے شہریوں کی تربیت گاہیں بن جائیں ہماری تعلیم گاہوں میں نوجوانوں کو اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق کام لینے اور اُن کی مدد سے رائے قائم کرنے اور اپنی اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق ذہنی ترقی کرنے کے ذرائع اختیار کرنے کا پورا موقعہ حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اسمیں تنظیم باہمی اور جماعتی مفاد کے اصولوں کے علاوہ اور کسی طرح کی کوئی مداخلت یا پابندی نہ ہونا چاہیئے۔

مسٹر ممدوح نے اس سلسلے میں موجودہ کانگریسی وزارتوں کے رویہ پر بھی علمی نقطۂ خیال سے نکتہ چینی کی مگر یہاں اس پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے اس لئے ہم اس جزو کو نظر انداز کرکے اُن کے ایڈریس کا لب لباب پیش کر دیا ہے

اطلاعِ ضروری

جن صاحبون کی خریداری ، سالِ جنوری ۱۹۳۶ء یا اس سے قبل سے شروع ہوتی ہے وہ سب پریم چند نمبر مفت پانیکے حقدار ہین، مگر چونکہ معمولی ڈاک سے اس ضخیم نمبر کے کھو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اُن معززین سے استدعا ہے کہ براہِ کرم چار آنہ کے ٹکٹ بھیجکر اس پرچہ کو بذریعہ رجسٹری طلب فرمالیں۔

جو صاحب جنوری ۱۹۳۷ء سے زمانہ کے خریدار ہونے ہین اُن کو بھی ہم جون ۱۹۳۶ء کے زمانہ کی جگہ پریم چند نمبر بلا کسی مزید مطالبہ کے حاضر کریں گے۔ اس لئے یہ حضرات بھی رجسٹری کے چار آنہ کے ٹکٹ بھیجدین

جولائی ۱۹۳۶ء یا اس کے بعد کے خریدار صاحبان کو پریم چند نمبر صرف ایکروپیہ قیمت پر مع محصول ملیگا۔ یہ رقم خواہ بذریعہ منی آرڈر ، پوسٹل آرڈر یا ٹکٹ ڈاک بھیجدی جائے۔ خریداران رسالہ کے علاوہ اور سب کے لئے یادگار پریم چند کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ مقرر ہے ۔ مصارف ڈاک اس کے علاوہ ہیں۔ خواہ رسالہ بذریعہ قیمت طلب پیکٹ طلب کیا جائے یا قیمت بذریعہ منی آرڈر

منیجر زمانہ

اطلاعنامہ بغرض اعلان و اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء)

بعدالت جناب پنڈت برج ناتھ زتشی اسپیشل جج صاحب بہادر ضلع کھیری درجہ دوم مقام لکھیم پور

مقدمہ نمبری ۱۵۹ سنہ ۱۹۳۶ء انکمبرڈ اسٹیٹ تاریخ پیشی ۲۶ فروری ۱۹۳۸ء

میوا رام ولد پرم سکھ قوم برہمن ساکن چوگانپور پرگنہ اورنگ آباد ضلع کھیری ——— سائل قرضدار

لعل جی، ہرپرشاد } پسران کیدار ناتھ قوم برہمن ساکن موضع برمہولی پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور
چھوٹے لال ولد بلبھدر پرشاد قوم برہمن ساکن موضع برمہولی پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور
بیج رام ولد امراد لعل قوم برہمن ساکن موضع برمہولی پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور
لالتا بخش سنگھ ولد نرائن سنگھ قوم ٹھاکر ساکن موضع کہمیرہ پرگنہ اورنگ آباد ضلع کھیری
مولچند ولد کنجہاری لعل ساکن موضع کنیرپور پڈروا ڈاکخانہ پہانی ضلع ہردوئی
——— قرضخواہان

چونکہ میوا رام ولد پرم سکھ قوم برہمن ساکن چوگانپور پرگنہ اورنگ آباد ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جنکی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ سائل مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے۔
اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعویٰ رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء جاری ہوا۔

(مہر عدالت) دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

تنبیہ:- فہرست ہائے (الف) و (ب) اودھ جوڈیشل فارم نمبری ۹۲ پارٹ ۱ (الف) پر اس اطلاعنامہ کے ساتھ بھیجی جاتی ہیں۔
اوقات حاضری عدالت ۱۰ بجے دن سے ۴ بجے شام تک۔

فہرست ہائے جائداد پیش کردہ قرضدار حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۸ و پیش کردہ قرضخواہ حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۱۰ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

فہرست (الف) ——— قرضدار کے حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی

نمبر	ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست محال	درخواست دہندہ کی مستقل قابل وراثت و قابل انتقال حقیت کی تصریح	وسعت حقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	[illegible]
۱	کھیری	کھیوٹ حق اعلے	چوگانپور پرگنہ اورنگ آباد محال رامپور	قابل وراثت و قابل انتقال	ایک بسوہ ۲ بسوانسہ ۱۴ کچوانسہ منجملہ مسلم محال رامپور یعنی بقدر ۱۳ ایکڑ ۱۷ ڈسمل	۱۰ روپیہ ۸ آنہ ۹ پائی مع ابواب	
۲	کھیری	کھیوٹ حق اعلے	چوگانپور پرگنہ اورنگ آباد محال بیناڑپور	قابل وراثت و قابل انتقال	۱۶ بسوانسہ ۱۳ کچوانسہ یعنی بقدر ۱۱ ایکڑ ۸۰ ڈسمل	۱۱ روپیہ ۵ آنہ ۹ پائی مالگذاری مع ابواب	
۳	ہردوئی	کھیوٹ حق اعلے نمبر تعدادی	گوریہ پرگنہ پڈروا	قابل وراثت و قابل انتقال	۱۶ بسوانسہ حصہ خود جو کر مولچند کے پاس رہن دخلی ہے [illegible]	۱۲ روپیہ مالگذاری مع ابواب	

نمبر سلسلہ	ضلع	تحصیل	موضع مع نمبر بندوبست محال	درخواست دہندہ کی مستقل قابل وراثت و قابل انتقال حقیقت کی تصریح	وسعت حقیقت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیقت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	کیفیت
۴	کھیری	[illegible]	ڑ ہواری ادوہو محال ام غلام پرگنہ بسگوان	قابل وراثت و قابل انتقال	منجملہ سلم محال کے ... بقدر ... ایکڑ ۹ ڈسمل	... مالگذاری معہ ابواب	[illegible]
۵	کھیری	[illegible]	کھمرہ محال گنگا سنگھ ... پرگنہ اورنگ آباد	قابل وراثت و قابل انتقال	منجملہ سلم محال کے ... یعنی بقدر ... ایکڑ ... ڈسمل	مالگذاری ... معہ ابواب	
۶	کھیری	[illegible]	بہرہ نعل محال مہراج سنگھ پرگنہ اورنگ آباد	قابل وراثت و قابل انتقال	منجملہ سلم محال کے ایک بسوہ ... ۹ بسوانسہ کا ... یعنی بقدر ... ایکڑ ... ڈسمل رقبہ	مالگذاری ... معہ ابواب	
۷	کھیری	[illegible]	گ ... محال مہراج سنگھ پرگنہ اورنگ آباد	قابل وراثت و قابل انتقال	منجملہ سلم محال ... بسوانسہ کا نصف یعنی رقبہ بقدر ... ایکڑ ... ڈسمل	مالگذاری ... معہ ابواب	
۸	کھیری	[illegible]	موضع سرو ... محال گجراج سنگھ پرگنہ اورنگ آباد	قابل وراثت و قابل انتقال	منجملہ سلم محال کے ایک بسوہ ... ۹ بسوانسہ کا ... یعنی بقدر ... ایکڑ رقبہ ۱۴ ڈسمل رقبہ	... مالگذاری معہ ابواب	

فہرست (ب)

قرضدار کی جائداد جو براستثنار حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیقت درخواست دہندہ	کیفیت

تفصیل جائداد منقولہ (۱) ایک منزل گاڑی قیمتی تخمیناً ؏۵ (۲) گائیں ڈو راس قیمتی تخمیناً ؏۵

دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

جرمن پستول

دیکھنے میں بڑا خوفناک ہتھیار ہے۔ اس کی آواز اتنی زوردار ہے، جسے سُنکر بڑا بھاری بدمعاش بھی رولفرزاتا ہے۔ بایںہمہ اس کیلئے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں ہے۔ اصلی ریوالور کی طرح بڑی زوردار آواز دیتا ہے۔ اسکے خزانہ میں دس (۱۰) فیر آتے ہیں جو یکے بعد دیگرے چلائے جاسکتے ہیں۔ قیمت فی پستول مع گولیوں کے صرف تین روپیہ (۳) محصولڈاک علاوہ۔ فاضل گولیاں ایک روپیہ سیکڑہ

ملنے کا پتہ:- **گلوب ٹریڈنگ کمپنی ۱۱۹ فورٹ اسٹریٹ فورٹ بمبئی**

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید مشغل کتابیں

محمد بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی بی اے۔ اِس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں، جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ قیمت عہ

کمال داغ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی مرتبہ مولانا حامد حسن قادری۔ اُردو غزل گوئی پر جدید زاویہ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت فی جلد عہ

یادگار حالی مشہور رسالہ زمانہ کا حالی نمبر جو شمس العلماء مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کی یاد میں شائع ہوا تھا بعد میں کتابی صورت میں خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں مولانا کے سوانحی حالات اور تنقیدی مضامین کے علاوہ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ مُلک کے مشہور شعراء اور انشا پردازوں نے بہترین مضامین لکھے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

شعلہ و شبنم حضرت جوش ملیح آبادی کی پُرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ آپ کو بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لُطف اندوز ہونے کا موقع دیگا۔ شاعر لافانی کا یہ شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصّع ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت صرف تین روپیہ (سے)

نقش و نگار شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت عا ر

فکر و نشاط حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ عمدہ لکھائی چھپائی۔ بہترین جلد۔ غیر مطبوعہ نظمیں۔ قیمت مجلد کتاب۔ عہ ر

انتخاب حسرت مولانا حسرت موہانی کے دسوں دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اس پر حضرت جلیل احمد قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ (عہ)

نقش و نگار مسٹر جلیل قدوائی کی دلاویز اور پُرلطف نظموں کا مجموعہ جو مُلک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ قیمت۔ عہ

راماین مسدس مصنفہ جناب منشی رامجی مل کپور مصنف نے سری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازی تخئیل قابل تحسین ہے۔ قیمت مجلد باتصویر عا، مجلد بلاتصویر عا۔ غیر مجلد بلاتصویر عہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

سرمایۂ تسلین حضرت تسکین سہارنپوری کے کلام کا دلکش مجموعہ جو عام طور پر قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ قیمت عمہ

حدیث حسن جوان سال ادیب حضرت شمیم احمد صاحب فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے قیمت مجلد صرف عمہ

شری بھاگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر المعروف بہ غذائے روح با تصویر مترجمہ پنڈت پربھو دیال امر عاشق لکھنوی۔ قیمت عمہ

آرٹ و مضمون نویسی مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی۔ اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے قیمت صرف ۸

مثنوی سحر یعنی شکنتلا اور دشنیت کا اردو ترجمہ حضرت سحر تیکانی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز دوسرا ایڈیشن جسکی مصنف نے نظر ثانی کی ہے۔ قیمت ۸

مرقع ادب حصہ اول و دوم، مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعراء کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں، جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت حصہ اول ڈیڑھ روپیہ عہ حصہ دوم ۱۲

حسن بن صباح ملک کے شہرہ آفاق مصنف مولانا شرر مرحوم کی تصنیف ہے اسمیں حسن بن صباح (جو فرقہ اسمعیلیہ کا زبردست رکن تھا) کے دلچسپ حالات درج ہیں قیمت ۱۲

سبزگل یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ، وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی ہے۔ آج روسی کہانیوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے۔ ان کے ابن پیش کرنے والے کی تحریروں کا اعجاز دیکھنا ہو تو سبزگل ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت ۔ عہ

بندگی امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب العبودیت کا اردو ترجمہ اپنی وضع کی بہترین کتاب ہے مترجمہ میر ولی اللہ صاحب وکیل۔ قیمت ۱۲

اسرار رنگون مسٹر داد کا ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے ہر بات کو اصلی سطح پر لاکر پیش کیا گیا ہے بڑی حد تک یہ ناول سچے واقعات سے مترتب ہے حجم ۱۷ صفحات۔ قیمت عہ

بزم احباب اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ ہے۔ قیمت ۸

سلومی آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما سالومی کا ترجمہ ہے جس کو جناب مجنوں نے نہایت محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۸

زمانہ بک ایجنسی کانپور

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۱۲ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور با تصویر رسالہ پینتیس سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر مسلسل خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ پرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کیجائیگی:۔

(۱) گیارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے اٹھائیس روپیہ مع محصول

(۲) چار سال کے خریدار سے علاوہ محصول بحساب تین روپیہ فی فائل

(۳) ایک سال کے خریدار سے ساڑھے تین روپیہ علاوہ محصولڈاک

نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیئے۔

فائل ۱۹۲۰ء میں جولائی نمبر باقی نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ہے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

یک رنگی تصاویر

وقت نزع۔ غسل کی تیاری، لیلیٰ مجنون، بھکارنی، ہمدردی، مسیح اور کانٹوں کا تاج، ذبح عظیم، عشق اور زندگی، بخیل، ہڑتالی مزدور، کثرت میں وحدت، شیر محمد قوال، ماگھ پھاگن وغیرہ موسمی تصاویر۔ اجنٹا کے غار رنگی مختلف تصاویر۔ قیمت فی تصویر ۲ ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

صحافت کے ذریعہ سے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنیکی پہلی کوشش

"کلیم" دہلی

زیر ادارت

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اسوقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ ٹھوس اور سنجیدہ علمی ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب بھی ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔ عمدہ تصاویر سے مزین، کتابت طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق، سالانہ چندہ چھ روپے، ششماہی تین روپے آٹھ آنے (۸/۳) اور نمونہ کے پرچے کیلئے ۹ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

منیجر کلیم، مہاجانتی نواس، دریا گنج دہلی

شعلہ طور

دوسرا ایڈیشن

شاعرِ فطرت حضرت جگرؔ مرادآبادی کے کلام سے کون واقف نہیں۔ اُنکے کلام کے مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ نے ۳۰ر نومبر کو شائع کیا۔ اِس مرتبہ موصوف کی چند نئی غزلوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔

سادگی و پرکاری، بیخودی، ہوشیاری جو فارسی میں امیر خسروؒ کے کلام کی خصوصیت ہے اُردو میں جگرؔ مرادآبادی کے حصے میں آئی ہے۔ جگرؔ کی ساحرانہ شاعری کا اِس دَور میں جواب نہیں۔ جو حضرات ایکدفعہ بھی شعلۂ طور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں، وہ اُسے اِس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانہ انقلاب فرانس میں "معاہدۂ عمرانی" لئے پھرتے تھے۔

طباعت وغیرہ اعلیٰ، از حد دیدہ زیب، پنج رنگی، سُنہرا کور، مضبوط و خوبصورت جلد اور جگرؔ کی بے نظیر تصویر۔ اِن تمام خصوصیات کے باوجود ہم نے قیمت میں کمی کر دی ہے یعنی سے کے بجائے ع

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور**

منشی دیا نراین نگم بی۔ اے۔ ایڈیٹر و پبلشر پنڈت سری بلبھ پرشاد نے ببر دال پریس کانپور میں چھاپا

زمانہ

فروری ۱۹۳۸ء | مرتبہ: دیانراین نگم، بی۔ اے۔ | جلد ۷۰ نمبر ۲

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

زمانہ کے پُرانے فائل

دفتر میں ۱۹۲۳ء سے پُرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے قدردان اوب بخوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور باتصویر رسالہ پینتیس سال سے اُردو زبان و ادب کی کسقدر مسلسل خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پُرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ پُرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی:

۱۔ گیارہ سال کے مکمل سیٹ کے خریدار سے ۲۰۰ روپے مع محصول

۲۔ چار سال کے خریدار سے علاوہ محصول بحساب ۴ فی فائل

۳۔ ایکسال کے خریدار سے ۵ علاوہ محصول ″ ″

نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئیے فائل ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ہے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

یادگارِ پریم چند

—— میں ——

منشی پریم چند کے پُرانے دوستوں اور اُردو کے بہترین انشا پردازوں اور شاعروں کے چونتیس ۳۴ مضامین نثر اور تیرہ ۱۳ نظمیں ہیں

—— اور ——

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، اُن کا عکس تحریر ... مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ...

حجم ۲۰۰ صفحات علاوہ تصاویر

قیمت عمر علاوہ محصول

منیجر "زمانہ" کانپور

آپ بھی ایسے ہی تندرست بن جائیے

جب ایک ایسا علاج موجود ہے جو بہت ہی کم عرصہ کے اندر، آپ کی تمام زائل شدہ طاقتیں از سرِ نو بحال کر دے سکتا ہے، تو پھر آپ کیوں کمزوری، بے خوابی، تھکن، اور خستگی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں؟

سائنس کے "سیناٹوجن" میں خواص معلوم کر لئے ہیں، جو بہت قلیل عرصہ کے استعمال سے آپ کو خوشی و خورمی کا حیرت انگیز احساس اور طاقت و شگفتہ صحت عطا کرتے ہیں۔ دُنیا کے پچیس ہزار ڈاکٹروں نے اپنے دئے ہوئے اسناد کے ذریعہ سے جنھیں انھوں نے سیناٹوجن کی سفارش کی ہے، مندرجہ بالا قول کی تصدیق کی ہے۔

سیناٹوجن بے نظیر صحت بخش دوا ہے، اس لئے وہ بحالی صحت میں کبھی قصور نہیں کرتی۔ مردوں، عورتوں، اور بچوں سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ آج ہی سیناٹوجن استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔

ایک صاحب جو سیناٹوجن کے بڑے شوقین ہیں تحریر فرماتے ہیں:-

"جو لوگ میری طرح ضعفِ اعصاب میں مبتلا ہیں، انھیں میری طرف سے کہدیجئے کہ وہ سیناٹوجن استعمال کیا کریں۔ کیونکہ اب میں کھانا خوب کھا سکتا، میٹھی نیند سو سکتا اور لطفِ زندگی حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ زندگی ہے، اور زندگی اسی وقت عجیب چیز معلوم ہوتی ہے جب انسان تندرست ہو اور سیناٹوجن کی ہر شیشی میں تندرستی موجود ہے۔"

SANATOGEN

صحیح معنی میں مقوی غذا ہے

تمام دوا فروشوں اور بازاروں سے مل سکتی ہے

تیاری کی کسی حالت میں بھی سیناٹوجن کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا اور اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کسی فرقہ یا مذہب کے خلاف ہو۔

اطلاعنامہ بغرض اعلان و اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ ۱۹۳۴ء)

بعدالت جناب پنڈت برج ناتھ زتشی صاحب اسپیشل جج بہادر لکھیم پور درجہ دوم مقام لکھیم پور

مقدمہ نمبری ۱۶۳ ۱۹۳۶ء　　　پیشی ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء

مسماۃ پدماوتی عرف للی زوجہ بابو نند نندن سرن قوم کائستھ ساکن شہر ڈیرہ دون　　　قرضدار سائل

بنام　سمری لال ولد لوک ناتھ قوم برہمن ساکن موضع دلجیت پور پرگنہ ... ضلع کھیری　قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ مسماۃ پدماوتی عرف للی زوجہ بابو نند نندن سرن ساکن شہر ڈیرہ دون ضلع ڈیرہ دون نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے۔ لہذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دی جاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ مسماۃ پدماوتی مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعوی رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۴ فروری ۱۹۳۶ء جاری ہوا۔

مہر عدالت　　　دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

قابل فروخت

تنبیہ:- فہرست ہائے (الف) و (ب) اودھ جوڈیشل فارم نمبر ۲۹ پارٹ ۶ (الف) پر اس اطلاعنامہ کے ساتھ بھیجی جاویگی۔

اوقات حاضری عدالت　۱۰ بجے دن سے ۴ بجے شام تک

فہرست ہائے جائداد پیش کردہ قرضدار حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۸ و پیش کردہ قرضخواہ حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۱۰ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ۔

قرضدار کے حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی

فہرست (الف)

ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست محال	درخواست دہندہ کی مستقل قابل وراثت و قابل انتقال حقیت کی تصریح	وسعت حقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کس حقیت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	نمبر
کھیری	زمینداری	موضع دلجیت پور پرگنہ ...	حق اعلے	۴ ر ۶ پائی	مالگذاری ...	
	"	موضع ہرشہرہ محال ...	"	نصف محال	...	
	"	موضع ادھری محال ...	"	۴ بسوہ ۶ بسوانسہ	...	
	"	... ادھری محال ...	"	۸ بسوہ	...	

جائداد جو کہ مہاجنان نے اپنے بیان تحریری حسب دفعہ ۹ لکھیم پور اسپیشل ایکٹ میں دکھلائی ہے

۴ ... بحصہ ۶ ... یعنی مسلم موضع دولتا پور پرگنہ ... ضلع کھیری

... بحصہ ۶ ... سمری لال ... کیدارناتھ واقع موضع ... پرگنہ ... ضلع کھیری

دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری　　　مہر عدالت

مر ۲۹

اجلاس ٹھاکر رندھیر سنگھ صاحب اسپیشل جج بہادر درجہ دویم علیگڈھ

بحث قانون قرضہ جات ملکی مقدمہ نمبر ۲۸ ، ۱۹۳۶ء

نمونہ نمبر ۱۰

نمونہ اطلاع نامہ حسب دفعہ ۱۱ - ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

ہرگاہ راؤ ساکرشن خلف جواہر لال قوم ویش اگروال ساکن حال قصبہ ہاتھرس محلہ محمد آباد دروازہ ضلع علیگڈھ سائل نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے۔

لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ا دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دی جاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے شاملہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ سائل مذکور کی جائداد بتایا ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعوی رکھتا ہو تو اس یوم سے جو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں۔

ضمیمہ (الف)   قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ اراضی

نمبر سلسلہ	ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست محال	درخواست دہندہ کی مستقل و قابل وراثت و قابل انتقال حقیقت کی تصریح	کیفیت حقیقت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیقت پر موجودہ تخمینی مالگذاری
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱	علیگڈھ	حقیت زمینداری	موضع چاندن پورہ محال ایک تلث کھیوٹ ۱	سا للہ بیگہ پختہ ۱۹ بسوہ	سا للہ بیگہ پختہ ۱۹ بسوہ	ایما مد [illegible]
۲	"	"	موضع و محال مذکور کھیوٹ ۲	½ حصہ ۸ بسوہ ۳ بسوانسی	بیگہ پختہ ۱۲ بسوہ	[illegible]
۳	"	"	موضع چاندن پورہ محال عبدالمجید خان کھیوٹ ۲	½ حصہ بیگہ ۱۰ بسوہ	بیگہ ۱۰ بسوہ	[illegible]
۴	"	"	موضع اوسی محال چمن لال ٹیکا رام کھیوٹ ۲	½ حصہ بیگہ پختہ ۶ بسوہ ۱۳ بسوانسی ۶ کچوانسی	[illegible]	[illegible]
۵	"	"	موضع دہباکھیوٹ ۳ تھوک گوبند رام	۱۲ بسوہ ۲ بسوانسی	۱۲ بسوہ ۴ بسوانسی بیگہ ۱۲ بسوہ ۱۲ بسوانسی	[illegible]
۶	"	"	قصبہ سکندرہ محال محبت خان کھیوٹ ۸	۳۲ ½ حصہ شمولہ ۲۵ حصہ منجملہ ۱۴۴۰ حصہ بقدر	¼ حصہ بیگہ ۱۲ بسوہ	[illegible]
۷	"	"	قصبہ سکندرہ محال محبت خان کھیوٹ ۲۱	نصف حصہ شمولہ ۶ حصہ منجملہ ۵۱۰ حصہ بقدر بیگہ [illegible]		
۸	"	"	قصبہ سکندرہ محال محبت خان کھیوٹ [illegible]	۶۵ حصہ منجملہ ۱۱۶ حصہ بقدر [illegible]		

ضمیمہ (ب)   قرضدار کی جائداد جو بہ استثنار حقوق مالکانہ متعلق اراضی دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرقی اور نیلام ہو سکتی ہے

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیت درخواست دہندہ
۱	۲	۳
۱	½ حصہ ایک منزل مکان	واقع شہر فرخ آباد محلہ [illegible]

۱۴۰

بحکم جناب پنڈت سوریش چند چترویدی صاحب بہادر اسپیشل جج درجہ اول اٹاوہ

بدست عوام فروخت کیلئے)   نمونہ نمبر ۱۶۹

نمبر مقدمہ ۱۲ سنہ ۱۹۳۷ء   تاریخ پیشی مقدمہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

فارم اطلاعنامہ حسب دفعہ ۹ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

خانصاحب شیخ امیر حسن ولد شیخ عبد القیم قوم شیخ پنجابی ساکن اٹاوہ محلہ کٹرہ شہاب خان   سائل

مسماۃ سارا بی بی بیوہ شیخ عبد القیم مرحوم قوم شیخ ساکن اٹاوہ محلہ کٹرہ شہاب خان   سائلہ

بنام

۱- شیخ شفیق احمد
۲- شیخ حبیب احمد پسران شیخ صدیق احمد ساکن کٹرہ شہاب خان
۳- سکینہ بی بی دختر شیخ صدیق احمد زوجہ شیخ محمد شریف ساکن حال کانپور محلہ کھنیاں بازار
۴- لالہ بندرابن ولد جانکی پرشاد قوم ویش اگروال ساکن اٹاوہ محلہ کٹرہ بیوہ گلی
۵- لالہ رام بھروسہ تکسیا ولد لالہ رام سہائے قوم ویش ساکن اٹاوہ محلہ کوچہ ٹیک چند
۶- لالہ جوگل کشور ٹنڈن ساکن اٹاوہ محلہ گنج ٹیک چند
۷- بابو سورج پرشاد اگروال محلہ کٹرہ ٹیکچند
۸- بابو شمبھو ناتھ ساکن اٹاوہ محلہ گنج
۹- رائے بہادر پاٹھک ہر سہائے ولد پاٹھک بیادین ساکن اٹاوہ محلہ پنساری ٹولہ
۱۰- پرتم داس ٹنڈن ولد رگھبر دیال قوم کھتری ساکن محلہ کھتانہ ٹولہ اٹاوہ

چونکہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء) جیسا کہ بذریعہ ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے۔

سائلان کی جانب سے اس غرض سے

دی گئی ہے کہ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اس سے متعلق کئے جائیں۔
لہٰذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ۹ (۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بذریعہ ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے۔ اطلاع دی جاتی ہے کہ جملہ اشخاص جو سائلان مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ڈگری شدہ وغیر ڈگری شدہ خانگی قرضہ جات کے متعلق دعوے رکھتے ہوں وے گزٹ میں اس اشتہار کے شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے دعووں کے متعلق تحریری بیانات اس حاکم کے روبرو پیش کریں جو ذیل میں ثبت ہیں۔ اور بہ صورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعویٰ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ جملہ اغراض و مرقومات کے لئے زیر دفعہ ۱۳ ایکٹ مذکور بضابطہ بیباق تصور ہوگا۔

دستخط اسپیشل جج درجہ اول   مہر عدالت
ضلع اٹاوہ (رحمۃ اللہ)

پریم چند مرحوم کے تیرہ ۱۳ افسانوں کا مجموعہ نہایت محدود تعداد میں شائع ہو گیا ہے
قیمت عمہ علاوہ محصول ڈاک۔ شائقین جلد طلب فرمائیں۔
ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

جلد ۷ فروری سنہ ۱۹۳۰ء نمبر ۲

قدیم ہندوستان اور اُس زمانہ کے ہندو مسلم تعلقات

(از سید طفیل احمد صاحب منگلوری (علیگ) مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

بدقسمتی سے آجکل ہندوستان کے متعلق ایک خیال یہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ زمانۂ سابق میں مختلف اقوام کے حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی نہ جان و مال محفوظ تھی، نہ اُن کے کسی قسم کے حقوق تھے، نہ یہاں عدل و انصاف تھا۔ لوگوں کو کسی قسم کا امن اور سکون حاصل تھا اور نہ فارغ البالی اور خوشحالی کا پتہ تھا۔ اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آجکل یہ سب چیزیں حاصل ہیں۔

مندرجہ بالا خیال صرف مسلمان اقلیت ہی کا نہیں بلکہ ہندو اکثریت کا بھی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے اُس زمانہ پر نظر ڈالی جائے جو مختلف اقوام کی باہمی کشاکش کا سمجھا جاتا ہے، اور دیکھا جائے کہ اُس زمانہ کی واقعی کیا حالت تھی۔ اور اہل ہند کو بنیادی حقوق جن پر کسی ملک کی خوشحالی اور آزادی کا انحصار ہے کس حد تک حاصل تھے۔

ایشیائی ملکوں کے درمیان آمدورفت اور تجارت

دراصل پہلے زمانہ میں ایک ملک والوں کا دوسرے ملک میں جانا اور وہاں رہنے کے لئے کشاکش کرنا اُن دنوں کی خصوصیات میں تھا۔ وہ زمانہ صرف ہندوستان اور ایشیا بلکہ تمام دنیا میں مختلف گروہوں کے انتشار اور امتزاج کا تھا۔ اُس وقت کوئی ملک تو انسانوں کی پیدائش کے لئے زیادہ موزوں تھا اور کسی ملک کی زمین زیادہ سرسبز و شاداب

اور پھلوں اور غلوں کی کاشت اور مویشیوں کی چراگاہوں کے لئے زیادہ مناسب تھی۔ انھیں چراگاہوں اور زمینوں کی تلاش میں بعض قومیں خانہ بدوش پھرتی تھیں، اور بعض کسی حصۂ ملک میں رہ کر متمدن اور مہذب بن جاتی تھیں۔ اُن کا سب سے بڑا مولد وسط ایشیا تھا جہاں سے انسانوں کے مختلف جتھے یورپ، افریقہ اور چین تک جا کر بسے اور جنوبی و غربی ایشیا (جس میں ترکستان، افغانستان، ہندوستان، ایران، عرب، شام وغیرہ شامل ہیں) بمنزلہ اُن کے اصلی گھر کے ہو گئے تھے۔ اُس زمانہ کے ہندوستانیوں کو جبکہ ہندوستان کی شمالی سرحد کے درّے اور راستے بند ہیں اور اس کی وجہ سے اہل ہند مثل پردہ نشین عورتوں کے ہو گئے ہیں پہلے زمانہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا جبکہ مختلف قوموں کی نقل و حرکت میں نہ کوہ ہمالیہ کی بلند اور برفانی چوٹیاں مانع ہوتی تھیں، اور نہ میلوں چوڑے دریا کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتے تھے۔ اگر آجکل کے مصنوعی اخلاقی اصول کی رُو سے دراوری اور آریہ اور سیتھین قومیں اپنے قدم اپنے اصلی مولد و مسکن سے نہ نکالتیں اور سب قومیں اپنے اپنے پیدایشی ملکوں میں رہا کرتیں، تو غالباً آج تک ہندوستان کے نہ جنگل صاف ہوتے، نہ یہاں کاشت ہوتی نہ باغات نصیب ہوتے، نہ عظیم الشان شہر بنتے، نہ موجودہ تمدن اور تہذیب قائم ہوتی، اور صرف ہندوستان کی یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ یورپ بھی اپنی جنگلی اور بیابانی حالت سے اب تک نہ نکل پاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں براعظم ایشیا کے مختلف ملکوں کے درمیان نہایت آزادی سے آمد و رفت تھی اور چونکہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان زیادہ سرسبز اور زرخیز تھا اس لئے لوگوں کی توجہ زیادہ تر اُس کی طرف رہتی تھی، اور اکثر قومیں جو اس طرف آتی تھیں بالعموم یہیں بود و باش اختیار کر کے اس ملک کو ترقی دیتی تھیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی نیا جتھا ہندوستان میں داخل ہوتا تو یہاں کے سردار اُس کا مقابلہ کرتے تھے، مگر وہ لڑائی سرداروں تک محدود رہتی تھی کامیابی یا ناکامی کے بعد یا تو وہ جتھا واپس چلا جاتا تھا یا ہندوستان میں رہ پڑتا۔ رہ جانے کی صورت میں بالکل وہی کیفیت ہو جاتی تھی جو عرسوں اور میلوں کے زمانہ میں ریل کے کسی درجہ میں نئے آنے والوں کی ہوتی ہے کہ داخل ہوتے وقت تو اُن کے ساتھ ہٹنت مُنت تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے مگر تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کے بعد دوستانہ تعلقات قائم ہو کر باہمی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر باہر سے داخل ہونے والے کا مقابلہ یہ سب مل کر کرتے ہیں، جو گھنٹہ بھر قبل آپس میں لڑ رہے تھے۔

علاوہ بریں بار بیرونی حملے کے بعد جلد سکون ہو جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ فاتح کے قیام و بقا کا انحصار چونکہ عوام کی خوشنودی پر ہوتا تھا اس لئے وہ اپنی رعایا کی رضا جوئی کرتا تھا، وہ اور اُس کے اُمرا و عمّال اپنی دولت رعایا میں لٹاتے تھے جس سے ہر پیشہ کے لوگ فارغ البال رہتے تھے۔ اُس زمانے کے اُمرا کا اسراف عمدہ اوصاف میں شمار کیا جاتا تھا بعض امرا اور سلاطین ذاتی طور پر فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی دولت رعایا کے خوشحال بنانے میں صرف کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کو سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم بنیادی حق روٹی کی طرف سے مطمئن ہونے کا بدرجۂ اتم حاصل تھا۔

پچھلی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ سابق میں چین سے لیکر ایشیائے کوچک تک اور سائبیریا سے لیکر راس کماری تک جملہ ایشیائی ممالک کے راستے کھلے ہوئے تھے اور ان تمام ملکوں میں آزادی کے ساتھ تجارت ہوتی تھی، ہندوستان کا لوہا اور اسپات اور یہاں کی شکر وسط ایشیا تک جاکر فروخت ہوتی تھی۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان کی تجارت چین اور سلطنت روما کے ساتھ تھی۔ غرضیکہ مشرقی ایشیا کے لوگ عرب میں اور شمالی ایشیا کے لوگ جنوبی حصوں میں آتے جاتے تھے، اور جب کوئی سیاح کسی ایک طرف سے اُٹھتا تھا تو ہر ملک کے کونے کونے میں پھر جاتا تھا۔ یہ حالت جملہ ایشیائی ملکوں میں تھی، اور وسط ایشیا سے لیکر ہندوستان تک تو بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہاں سے لیکر یہاں تک ایک ملک ہے جو مختلف صوبوں میں تقسیم ہے اور ان صوبوں کی حدود وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے حدود

رگ وید کے بعض منتروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ قوم کے لوگ کسی دریا کے کنارے پر رہتے تھے، یہ دریا بعض کے نزدیک دریائے ہلمنڈ تھا بعض کے نزدیک دریائے انڈس تھا جو سندھ کو سیراب کرتا ہے، اِن دونوں میں سے کوئی دریا بھی کیوں نہ ہو یہ یقینی امر ہے کہ اُس زمانہ میں جس علاقہ میں آریہ قوم بستی تھی وہ دریائے ہلمنڈ سے لیکر پنجاب تک تھا دریائے ہلمنڈ کے متوازی شمال کی جانب اُونچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جس نے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور جو در اصل ہندوستان کی قدیم ترین شمالی سرحد ہے۔ جو مغلوں کے زمانہ تک قائم رہی اور جہاں سے لیکر بندھیاچل تک ایک وسیع ملک تھا جو حقیقی معنوں میں ہندوستان تھا اور یہ ایک واقعہ ہے کہ تمدن، زبان، اور معاشرت کے اعتبار سے اُس کے ہر علاقہ کے باشندوں میں یکسانیت تھی۔ جتنی کہ گنگا جمنا کے درمیان رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب دکن کے باشندوں کے

مقابلہ میں غزنی اور کابل کے باشندوں سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ اور یہ عرض کیا گیا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان کی شمالی سرحد دریائے ہلمند کے متوازی تھی۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ہندوستان کے صوبوں کا علاقہ اس سرحد کے پار تک پھیل جاتا تھا۔ مثلاً تاریخ ہند مصنفہ ڈاکٹر ایشری پرشاد میں تحریر ہے کہ مسیح سے چھ سو سال قبل آریہ ورت میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اُن میں سے ایک کاندھار (قندھار) تھی، اس کا دارالسلطنت ٹیکسیلا تھا یہ ریاست پشاور کے قریب تھی۔ یہ وہی ٹیکسیلا ہے جہاں سے اب بودھوں کے مشہور دارالعلوم کی عمارتیں برآمد ہوئی ہیں اور موجودہ سرحد سے ایک سو بیس میل جنوب کی طرف واقع ہے جو کسی زمانہ میں ہندستان میں شامل تھا۔

اہل ہند کی واقفیت ایشیائی زبانوں سے

سنہ ۵۰۰ قبل مسیح میں دارا کے زمانہ میں پنجاب ایران کا ایک صوبہ تھا اور اُس کے تعلقات اصلی ہندوستان یعنی صوبۂ متحدہ کے مقابلہ میں ایران کے ساتھ زیادہ تھے اسی طرح پہلی صدی عیسوی میں مشہور راجہ کنشک کا جو بودھ مذہب رکھتا تھا۔ علاقہ متھرا سے لیکر سمرقند تک تھا جو شمالی سرحد افغانستان سے دو سو میل آگے ترکستان میں واقع ہے۔ اس وقت براعظم ایشیا کے مختلف ملکوں میں باہمی میل جول کی وہی کیفیت تھی جو آج براعظم یورپ کے مختلف ممالک کے درمیان ہے کہ اُن کا تمدن، اُن کی معاشرت تقریباً ایک ہے اُس وقت یہاں بھی ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کی زبان جاننے والے بکثرت ہوتے تھے اور یہ حالت نہ تھی کہ پنجاب کے لوگ اس وقت افغانستان یا ایران کی زبان سے بالکل بیگانہ ہیں جس طرح یورپ میں تقریباً ہر شخص اُس براعظم کے ملکوں کی کئی کئی زبانیں جانتا ہے۔ بجنسہ یہی حالت براعظم ایشیا کے لوگوں کی تھی کہ ایک ہندی اگر فارسی اور پشتو بولتا تھا تو افغانی اور تاتاری بھی ہندی زبان میں بامحاورہ گفتگو کر سکتا تھا، کیونکہ آمدورفت کے راستے کھُلے ہوئے تھے۔

ہندوستان مختلف مذاہب کا عجائب خانہ تھا

ایشیا کی مختلف زبانیں جاننے والے بالخصوص ہندوستان میں زیادہ تھے اس لئے کہ بوجہ سرسبزی اور غلّوں کی پیداوار کے مختلف اقوام کی آمد کے لئے اس ملک میں زیادہ کشش تھی۔ نیز مختلف اقوام کا مرکز ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں کم وبیش ہر عقیدے کے لوگ پائے جاتے تھے۔ اور ہندوستان مذہب کے اعتبار سے ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تھا جس میں ہر نمونے اور ہر عقیدے کے لوگ موجود تھے، اور امن وآشتی کے ساتھ یکجا رہ کر رواداری کا ایک بہترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اور یہ دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف اقوام کے مذہبی اور معاشرتی حقوق کسی اور ملک میں یہاں کے برابر محفوظ نہ تھے۔

ہندوستان کی حالت براعظم یورپ سے بالکل مختلف تھی، جہاں مذہب کی بنا پر صدیوں تک کشت و خون ہوئے، اختلاف عقائد کی بنا پر ہزاروں بیگناہ آدمی زندہ جلا دیئے گئے، شہر اور مضافات برباد کئے گئے۔ یورپ کے لوگ قدیم ہندوستان کی حالت کو بھی اپنے براعظم پر قیاس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی ایک عقیدہ والے دوسرے عقیدہ والوں اور فاتحان اپنی مفتوحہ رعایا کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کے لئے مجبور کرتے ہونگے۔ اگر یہاں ایسا ہوا ہوتا تو اس ملک میں صدہا مختلف مذاہب اور مذہبی فرقوں کا وجود کیونکر ہوتا۔ یہاں کی حالت ہمیشہ سے بالکل مختلف رہی ہے اور بجز موجودہ زمانہ کے جبکہ سیاسی اثرات سے یہاں فرقہ پرستی پیدا ہوگئی ہے بالعموم تمام ایشیا اور بالخصوص ہندوستان ان گندگیوں اور آلائشوں سے بالکل بری اور پاک تھا۔

حملہ آوروں نے بودھوں کا مذہب اختیار کرلیا

اس وقت ہمارے سامنے وسط ایشیا کی حملہ آور اقوام کی نظیریں موجود ہیں، جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ انھوں نے بجائے اپنا مذہب پھیلانے کے خود اہل ہند کا مذہب اختیار کرلیا۔ مغل، ترک اور تاتاری جنھوں نے تمام ایشیا و یورپ کے براعظموں میں اودھم مچا رکھی تھی سب کے سب بودھ مذہب کے پیرو ہوگئے تھے۔ چین میں اہل ہند کی فوج چڑھ کر نہیں گئی مگر وہاں ہزاروں میل کے رقبہ میں بودھ مذہب پھیل گیا۔ وسط ایشیا اور ترکستان جن کے تصور سے کمزور قوموں میں لرزہ پڑتا تھا وہ بودھوں کی مذہبی یادگاروں کے خزانے ہیں۔ اس وقت نئی دہلی میں سنٹرل ایشین میوزیم کے نام سے جو عجائب خانہ قائم کیا گیا ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ترکستان بودھوں کے مندروں سے پٹا پڑا تھا۔ یہ وہی مذہب ہے جو کمزور ہندوستان میں پیدا ہوا اور اُس نے وسط ایشیا کی سب سے زیادہ خونخوار اور جنگجو اقوام کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔

تاتاری فاتحین نے مغلوب مسلمانوں کا مذہب اختیار کرلیا

اس کے بعد عرب میں اسلام پیدا ہوا اور سرعت کے ساتھ بڑھا۔ اس کی نسبت مخالفین کہتے ہیں کہ وہ سلطنت کی قوت اور تلوار کے زور سے مختلف ممالک میں پھیلا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ بے رحم تاتاریوں اور ترکوں نے اسلامی ممالک پر حملے کرکے اُس کے دارالسلطنت بغداد کو برباد اور سلطنت عباسیہ کو پاش پاش کردیا اور پھر انھیں ترکوں اور تاتاریوں سلجوقیوں اور مغلوں نے اپنے دست نگر اور مظلوم مسلمانوں کا مذہب اختیار کرلیا۔ اس حملہ کی تفصیل ڈاکٹر سر آرنلڈ نے اپنی کتاب اشاعت اسلام میں اسطرح کی ہے:-

"مغلوں نے جو حملے مسلمانوں پر کئے اُن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ چنگیز خاں نے مسلمانوں

کی تہذیب کے مرکزوں کو تاخت و تاراج کردیا، عمارات کو مسمار باغات و زراعت کو برباد کردیا۔ جب ہرات میں سے فوج گذری تو لاکھ آدمیوں میں سے صرف چالیس آدمی چھپ کر نکل پائے۔ بخارا میں مغلوں نے مسجدوں کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا، انسانوں کو قتل کیا جو بچے انھیں غلام بنا لیا۔ یہی حال سمرقند و ورخ کا کیا۔ اسی طرح بغداد کو برباد کیا جو عباسیوں کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ بغداد کی لوٹ ایک ہفتہ تک جاری رہی جس میں دس لاکھ آدمی مارے گئے۔ سرپرسی سائیکس نے لکھا ہے کہ اس صدمہ سے مسلمانوں کی تہذیب پھر نہیں پنپی، زبان عربی کی اہمیت جاتی رہی۔"[1]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سفاک اور بے رحم مغل پھر مسلمان کس طرح ہوگئے، کیا وہ مسلمانوں کی تلوار کے زور سے ہوئے، یا اُن کے صبر و تحمل اور اخلاقی قوت سے۔ اور پھر کیسے مسلمان ہوئے کہ خونخواری کی جگہ اُن میں حد درجہ کی بُردباری اور رواداری پیدا ہوگئی۔ ان ہی واقعات سے ظاہر ہے کہ ایشیا میں مذہب پھیلنے کے وجوہ دست و بازو کی قوت کے علاوہ کچھ اور ہوتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اپنی قوت سے واقف ہیں، وہ عربوں اور افغانیوں کو بھی دیکھتے ہیں کیا وہ لوگ یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ منہ زور افغانیوں نے کسی زمانہ میں اہل ہندوستانیوں سے دب کر بودھ مذہب اور پھر اس کے بعد عربوں سے مغلوب ہوکر اسلام قبول کیا ہوگا۔ یہ محض سیاسی فوائد کی بنا پر بعض خودغرض جماعتوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تاکہ اس ملک میں فرقہ پرستی کی آگ سلگتی رہے اور قیامت تک یہ ملک غلامی میں پھنسا رہے

اسلام اور بودھ مذہب کے پھیلنے کی وجوہ

اگر غور سے دیکھا جائے تو ایشیا میں اسلام پھیلنے کی بڑی وجہ وہی ہے جو اس براعظم میں بودھ مذہب پھیلنے کی ہوئی تھی۔ اور وہ وجہ یہ تھی کہ بودھ مت اختیار کرنے والے خواہ امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل سب کے سب تمدن کی ایک سطح پر آجاتے تھے۔ ہزار ڈیڑھ ہزار برس بعد جب بودھ مذہب کی اس خصوصیت میں کمی ہوگئی اور ہندوستان کے ادنیٰ فرقے چھوت چھات کی سختی کی وجہ سے بیکسی کی حالت میں پہونچ گئے تب اسلام نے اُن کی مدد کی اور اُس کی مساوات کی تعلیم کی وجہ سے اُسے عوام الناس نے اختیار کیا۔ پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر آرنلڈ کا یہ نظریہ تسلیم کیا ہے کہ "بنگال میں کپڑا بُننے والے ہندو ذلیل اور ناپاک سمجھے جاتے ہیں، اس لئے اُنھوں نے اسلام قبول کرکے اپنی عام سطح کو بلند کرلیا"[2]

---

[1] ماخوذ از طبقات ناصری ۲۳ باب خروج بقول از قاضی منہاج السراج جرجانی قاضی دہلی۔
[2] مضمون پنڈت سندر لال از اخبار استقلال دیوبند مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء

مذہب عیسوی بھی اوّل یورپ میں اسی خصوصیت کی وجہ سے بڑھا اور پھیلا تھا، اور ہندوستان میں اگرچہ سلطنت ابتدا سے اُن کی پشت پر رہی، اور یورپ و امریکہ سے بےشمار روپیہ آکر یہاں اشاعت و تبلیغ پر صرف ہوتا ہے، تاہم اس وجہ سے کہ اہل یورپ دیسی عیسائیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہیں کرتے ہندوستان میں مسیحیت اُن کی مساعی کے مطابق نہیں پھیلی۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کس راستہ سے داخل ہوا۔ اس کی نسبت پنڈت سندرلال صاحب الہ آبادی نے صاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ "ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ[1] جنوبی اطراف سے ہوئی، شمالی سے نہیں، اور وہ بھی اُس وقت جبکہ وہاں مسلمانی حکومت کا پتہ نہ تھا۔"

دراصل ہندوستان میں اسلام کی آمد کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ بحری تجارت کے ذریعہ سے عرب تمام مشرقی جزائر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اوّل وہ آٹھ صدی قبل مسیح جزیرہ سماترا میں آنے اور اُسی دوران میں وہ جنوبی ہند کے ساحل ملابار اور سیلون میں رہنے لگے۔ اُس وقت ملابار میں بودھ جینی، برہمن، یہودی، عیسائی غرضکہ جملہ مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ اُنھیں میں سے عرب تھے جن کا عقیدہ بت پرستی اور ستارہ پرستی تھا۔ عرب میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو بوجہ عرب کے ساتھ آمد و رفت کے تعلقات کے سبب سے اول جنوبی ہند کے عرب اُس سے متاثر ہوئے اور اُن فیضِ صحبت اور ہمسائگی سے دوسرے ہندیوں نے اسلام کی طرف توجہ کی، حتیٰ کہ ملابار کے راجہ زمورن کی نسبت مشہور ہے کہ اُسے اسلام کی طرف رغبت ہوئی اور وہ اپنا تخت اپنے ولیعہد کے سپرد کرکے عرب کو سمندر کے راستہ سے روانہ ہوا اور اثنائے سفر میں فوت ہوکر یمن کے ساحل پر دفن ہوا۔ اسی زمورن نے اپنی ریاست میں حکم دیا تھا کہ مچھیروں کے ہر خاندان میں کم سے کم ایک مسلمان کی پرورش کی جائے کہ وہ جہاز پر کام کرسکے۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی تصنیف 'عرب اور ہند کے تعلقات' اور مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے 'تاریخ آئینۂ حقیقت نما' میں آنحضرت صلعم کے متعدد صحابہ کرام کے اسمائے گرامی دئے ہیں جنھوں نے اس نواح میں آکر وفات پائی۔ جن میں سے ایک صحابی تمیم انصاری کا مزار مدراس کے نواح میں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو خالص تجارت یا تبلیغ کے سلسلہ سے ہندوستان میں آئے تھے اور

---

[1] اسلام اور پیغمبر اسلام کے کارنامے از استقلال دیوبند نمبر ۹ جلد ۲

ان کا نشان ملک گیری یا فوج کشی سے قطعاً نہ تھا۔ انھیں اصحاب کے فیض صحبت سے بقول مصنف "تاریخ فرشتہ" سراندیپ یعنی سیلون کا راجہ بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ پھر دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی میں مالابار کے راجہ سامری چیرامن پیرومل نے مسلمان سیاحوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی، اُن کے ہاتھوں اسلام قبول کیا، اور اُن کے ساتھ عرب کو روانہ ہوا مگر راستہ میں انتقال کیا۔ مسلمانانِ عرب کے ساتھ ہندو راجاؤں کے اس حسن اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند کے بہت سے مقامات میں اسلام [illegible] جاگزیں ہوگیا اور اُن کی مسجدیں اور مدرسے مختلف شہروں میں بکثرت بن گئے۔ اُس زمانہ کی نسبت مورخوں نے لکھا ہے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بقدر دس فیصدی کے ہوگئی تھی۔ اسی زمانہ کی نسبت تاریخوں میں مالدہ کے راجہ کی نسبت بھی تحریر ہے کہ وہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور اُن سے عقیدت رکھتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی ابتدا

ابتدائی تبلیغی دور کے بعد اب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے واقعات یہ ہیں کہ صوبہ سندھ اور عرب کے درمیان ایران کا ملک واقع تھا۔ پہلی صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں ایرانیوں اور عربوں کے درمیان متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اُن میں سے مقامات نہاوند اور ذات السلاسل، قادسیہ اور مکران کی لڑائیوں میں سندھ کے راجہ ایرانیوں کی طرف سے لڑتے رہے حتیٰ کہ ایک بار راجہ داہر کے نائب نے گورنر قندھار پر حملہ کیا مگر عربوں نے اُس کا کوئی انتقام نہیں لیا۔ اُسی کے ساتھ خلفائے بنی اُمیہ کی سلطنت کے باغی مسلمان ہمیشہ راجہ داہر کے ہاں پناہ لیتے رہتے تھے حتیٰ کہ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں محمد بن علافی اُس سے باغی ہوکر معہ پانسو سپاہیوں کے لشکر کے راجہ داہر کے ہاں چلا آیا۔ راجہ موصوف نے اُس کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور بعد کی خدمات کے صلہ میں اُسے [illegible] اور سکّہ کے ایک طرف اُس کا نام مسکوک کیا۔ اس دوران میں راجہ سراندیپ نے [illegible] جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا جن میں قیمتی تحائف بار کئے گئے تھے اور اُن میں بہت سے مسلمان سوداگروں اور حاجیوں کا قافلہ سوار تھا۔ یہ بیڑا بادِ مخالف سے بہ کر ساحل دابیل بندرگاہ سندھ کے قریب پہونچا۔ جہاں [illegible] کے گورنر نے لوٹ کر مردوں عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا۔ حجاج کو جب اس واقعہ کی خبر پہونچی [illegible] داہر کو خط لکھا، اُس کا جواب گستاخانہ پہونچا۔ اس لئے حجاج نے پچھلے تمام واقعات کی بنا پر [illegible] حملہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ مگر قبل اس کے کہ عربوں کی فوج دابیل تک پہونچے [illegible] اُسے پے درپے دو شکستیں دیں۔ بالآخر حجاج نے محمد بن قاسم کو جن کی عمر سترہ سال

جنھوں نے سندھ کو فتح کیا۔ اس حملہ کے تفصیلی حالات بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم صرف یہ دکھانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب راجہ داہر کی طرف سے محمد بن علافی مسلمانوں کے پانسو جوانوں کے ساتھ لڑ رہے تھے تو یہ جنگ ہرگز کوئی مذہبی لڑائی نہ ہوسکتی تھی بلکہ خالص سیاسی لڑائی تھی۔ اسی طرح محمد بن قاسم کو جب کامیابی شروع ہوئی تو اُنھوں نے اپنے مشیروں میں ہندو سرداروں کو داخل کیا۔ چنانچہ اُن کا سب سے بڑا مشیر کاکا تھا جسے مسلمان مشیروں پر ترجیح دی جاتی تھی محکمۂ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کیا۔ موکا اور راسل دو سپاہی تھے اِن میں سے موکا محمد بن قاسم کا طرفدار اور راسل راجہ داہر کا طرفدار تھا۔ محمد بن قاسم کی فوج میں ہندو جاٹ شامل ہوکر لڑتے تھے۔ سی ساگر اول محمد بن قاسم کا مقابلہ کرتا ہے۔ پس کے بعد اُس کا وزیر اور خاص راز دار بنا دیا جاتا ہے۔ ایک طرف سے چچ سیہ اور محمد علافی [illegible] ہے ہیں تو دوسری طرف سے محمد بن قاسم کے ساتھ کاکا مقابلہ پر آرہے ہیں۔ سندھ میں قدم رکھتے وقت محمد بن قاسم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی مگر فتح ملتان کے وقت تک یہ پچاس ہزار ہوگئی۔ گویا اُس کے لشکر میں پچھتر فیصدی ہندو شامل ہیں اور ہندوؤں کی بھی یہ حالت ہے کہ آج محمد بن قاسم سے مقابلہ میں لڑتے ہیں اور دوسرے دن مغلوب ہوکر سب ساتھ ہوجاتے ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ پوری وفاداری اور جاں نثاری کرتے ہیں۔

اِن واقعات سے بجز اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے سب مذہبی تعصب سے پاک تھے، اور مذہب و سیاست دونوں چیزوں کو اپنے اپنے حدود کے اندر رکھتے تھے۔

مسلمانوں کا برتاؤ برہمنوں کے ساتھ

اب رہا محمد بن قاسم کا برہمنوں اور مندروں کے ساتھ برتاؤ، اُس کی نسبت اُس زمانہ کے ہندو مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے مندر وغیرہ نہیں توڑے۔ زمانۂ قدیم میں عام خیال یہ تھا کہ ہر قوم کے دیوتا جنگ کے وقت اپنی اپنی قوم کو مدد دیتے ہیں۔ پس جب کوئی قوم فتح پاتی تو اُس قوم کے معبود کی طاقت دیکھکر مفتوح قوم کے لوگ فاتح قوم کا مذہب اختیار کرلیتے۔ اسی کلیہ کے مطابق راجہ داہر کے مارے جانے پر جب ہندو [illegible] کے لوگ مسلمان ہونے لگے تو محمد بن قاسم نے دوسرے روز اعلان کردیا کہ جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ برہمن آباد فتح ہونے پر مندروں کے پجاری محمد بن قاسم کے پاس گئے اور کہا کہ ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لئے مندروں میں آنا کم کردیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آگیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوئی۔ تم اُنھیں [illegible] اور ہندوؤں کو مجبور کرو کہ وہ مندروں میں آکر پوجا کریں۔

[illegible] اکبر شاہ خاں صاحب۔

[illegible] اکبر شاہ خاں صاحب۔

یہ سنکر خلیفہ سے بذریعہ خط کے استصواب کیا گیا۔ جواب آنے پر محمد بن قاسم نے اعلان کر دیا کہ برہمنوں کے دان پُن، دکشنا، بھینٹ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں۔ اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں۔ سرکاری مالگذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لئے الگ خزانے میں جمع کیا جائے اس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانہ سے برآمد کر سکتے ہیں۔ پھر سب سے بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دیکر ان کے امورِ مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کر دیا۔[1]

محمد بن قاسم اور اُس کے بعد مسلمان گورنروں نے سندھ میں مثل مساجد کے ہندوؤں کے مندروں کے لئے بھی بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں۔

محمد بن قاسم کا اعزاز | ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا کہ جب محمد بن قاسم چار سال ہندوستان میں رہنے کے بعد عرب کو بلا لئے گئے تو شہر کیرج کے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے شہر میں اُن کا ایک مجسمہ (بُت) بنا کر رکھا اور اُس کی پرستش شروع کی۔[2]

اس کے واپس جانے کے چند روز بعد یہاں کے راجے خود مختار ہو گئے، اور کچھ دنوں کے لئے بغاوت ہو گئی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ سرکشی کے زمانہ میں بھی مسلمانوں اور نومسلموں کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا اور نہ نومسلموں نے اسلام ترک کرنے کا ارادہ کیا۔ برخلاف اس کے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں راجہ جے سیہ بن داہر نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس زمانہ میں جا بجا ہندو رؤسا سلطنت اسلامیہ کی طرف سے برسرِ حکومت تھے۔ تاہم ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سندھیوں نے اسلام قبول کیا۔

مسلمانانِ عرب کی خانہ جنگیوں میں ہندوؤں کی شرکت | اُس زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں اس قدر قریبی تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ خاص عرب میں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں میں ہندو شریک ہوتے تھے، چنانچہ برہمنوں کا ایک خاندان اپنے کو اسی بنا پر حسینی برہمن کہتا ہے کہ بقول اُن کے اُن کے بزرگوں نے میدانِ کربلا میں سادات کا ساتھ دیا تھا۔

اسی طرح محض چند صدیوں کے اختلاط سے ہندو مسلمانوں کا تمدن ایک ہو گیا تھا، اور سندھیوں عراقیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کا لباس یکساں ہو گیا تھا۔[3]

ہندوؤں کی جنگی قابلیت | محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی کے متعلق ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لکھا جائے جو اول الذکر کے پونے چار سو سال بعد ہندوستان میں آیا اور جس کے حملوں کا بڑا چرچا ہے۔ اُس وقت

---

[1] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۹۷- ۹۸　　[2] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۰۱

[3] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۱۰　　[4] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۱۹

تک مسلمان جنوبی ہند، ساحل مالابار، کاٹھیاواڑ، بھڑوچ میں آباد ہو چکے تھے، گویا ہندوکش سے لے کر راس کماری تک پھیل چکے تھے۔ وہ ریاستوں میں وزارت کے عہدوں تک پہونچ گئے تھے اور اپنے حکمرانوں کے ساتھ ہر حملہ آور کے مقابلہ میں لڑتے تھے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اُس زمانہ کے متعلق ایک غلط خیال یہ ہے کہ مسلمان دور دراز ممالک کے رہنے والے اور غیر معمولی قسم کے خوفناک انسان تھے جو ہندوستان پر چڑھ چڑھ کر آتے اور اُسے تہ و بالا کرتے رہتے تھے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندو ہوں یا مسلمان سب اپنے کو ایک چہار دیواری کے اندر محدود اور بے دست و پا پاتے ہیں، اور اس قدر کمزور اور بزدل ہو گئے ہیں کہ وہ خود اپنے ملک میں افغانی تو بڑی چیز ہیں معمولی قسم کے آوارہ گرد پردیسیوں تک سے ڈرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ یقین آنا مشکل ہے کہ کسی زمانہ میں خود ہندوستان کے لوگ افغانوں اور ترکوں پر چڑھائی کر جاتے ہوں گے، حالانکہ یہ تاریخی واقعات ہیں کہ ہندو برابر اُن اقوام کے دوش بدوش یا اُن کے مقابلہ میں بڑی مردانگی سے لڑا کرتے تھے، اور کیوں نہ لڑتے جبکہ ہندوستان کی حدود ایران اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور قندھار اور مکران جو اب افغانستان اور ایران میں واقع ہیں ہندوستان کے اندر داخل تھے، اور کبھی مسلمان بادشاہوں اور کبھی ہندو راجاؤں کے زیر حکومت رہتے تھے۔ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر قومیں وسط ایشیا سے آئی ہوئی تھیں، عادات و اطوار تقریباً ایک تھے، آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، جب اَن بن ہوتی تھی تو ایک دوسرے پر دھاوے بھی ہوتے تھے مگر وہ دھاوے ایسے تھے جیسے کہ پچھلی صدی میں سکھوں کے مغلوں پر مرہٹوں کے مرہٹوں پر، اور یہ سب کچھ سیاسی ضرورتوں کے تحت میں ہوتا تھا نہ کہ مذہب کے، جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر لڑائی میں دونوں طرف سے ہندو اور مسلمان ملے جلے ہوتے تھے، اور بعض وقت تو یہ لڑائیاں دو حقیقی بھائیوں اور باپ بیٹوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ اگر سلطنت اور مذہب لازم ملزوم ہوتے تو اس وقت سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی صوبۂ متحدہ میں ہونی چاہیئے تھی جہاں صدیوں تک ان کا دارالسلطنت رہا۔ مگر حالت اس کے برعکس ہے اور صوبۂ متحدہ میں صرف چودہ فی صدی مسلمان ہیں۔

غزنویوں کے حالات یہاں پر ہم چند واقعات غزنویوں اور راجہ جے پال کے باہمی جنگ و جدال کے متعلق لکھتے ہیں جن کے مفتوحات کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کی باہمی لڑائیاں کہاں تک مذہبی اختلاف پر مبنی تھیں۔ امیر ناصرالدین سبکتگین غزنی کا حاکم تھا اور راجہ جیپال پنجاب کا راجہ تھا۔ امیر ناصرالدین طوس کے قریب خانہ جنگیوں میں مصروف تھا۔ جیپال نے جس کے دل میں بھی ملک گیری کا جذبہ تھا سبکتگین کو ترددات میں مبتلا دیکھ کر غزنی کی طرف پیش قدمی کی سبکتگین کو جب

اس حملہ کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنے بیٹے محمود کے ساتھ غزنی لوٹ کر آیا اور جے پال کی فوجوں سے
لڑا۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اُس وقت جے پال کا پلّہ بھاری تھا اور اُس کی فتح یقینی تھی
مگر [illegible] شدت کے ساتھ برفباری ہونے لگی اس لئے ہندوستان کی فوج کو وہاں سے پسپا ہونا پڑا۔
یہ جنگ بقول مورخ سجان رائے غزنی میں ہوئی، جیپال نے اس وقت مجبور ہوکر سبکتگین سے صلح کرلی اور
اُس کے [illegible] اپنے ساتھ یہ کہہ کر دار السلطنت لاہور میں لایا۔ کہ اُن کے ہاتھ اپنا نذرانہ بھیجے گا۔ مگر بقول
مورخین اس نے بدعہدی کی۔ اس بدعہدی کے بعد سبکتگین اور جے پال کے درمیان ایک مستقل بنائے
مخاصمت قائم ہوگئی۔ جس کی وجہ سے سبکتگین کی وفات کے بعد محمود اور جیپال کے درمیان لڑائیوں کا
سلسلہ جاری رہا۔ مگر چونکہ غزنویوں اور تاتاریوں کے درمیان بھی جنگ کا مستقل سلسلہ جاری تھا۔ اس لئے
سلطان محمود بالعموم موسم گرما میں وسط ایشیا میں مصروف بہ پیکار ہوتا تو موسم سرما میں راجگان ہند سے۔ اور
چونکہ یہ لڑائیاں خالص سیاسی تھیں اور مذہبی یا قومی نہ تھیں اس لئے ایک طرف سرحد کے مسلمان
راجہ جیپال کے ساتھ ہوکر سلطان محمود کے خلاف لڑتے تھے تو دوسری طرف محمود کی ہندو فوجیں
راجاؤں کے خلاف لڑتی تھیں۔ چنانچہ شیخ حمید راجہ جیپال کی فوج کا کمانڈر تھا، برخلاف اس کے
[illegible] کی لڑائی میں [illegible] بھیم کا ہندو راجہ محمود کے ساتھ تھا، اور اس لڑائی کے بعد دس ہزار ہندو۔ محمود
کی فوج میں داخل ہوئے جن کا سپہ سالار سوہندرائے تھا۔ اسی طرح تیسری لڑائی میں محمود کے ساتھ
بارہ ہزار ہندو تھے۔ جب قنوج، مہابن اور برن (بلند شہر) پر فوج کشی ہوئی تو راجہ کشمیر برابر سلطان محمود کی
رہبری کررہے تھے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ مشہور سومناتھ کی لڑائی میں سمندر [illegible]
اُس میں ہندو سپاہی کشتیوں پر سوار تھے، اور یہ یقینی بات ہے کہ اُس زمانہ کے ہندو نہ [illegible] تھے
بزدل اور نہ بے حمیت، جو اپنے مذہب کے خلاف محمود کے ساتھ ہوجاتے بلکہ جرأت [illegible]
فراخ دلی میں ترک مسلمانوں کے جوڑ کے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف قومیں آپس میں تو ایک دوسرے
سے تعصب رکھتی تھیں مگر ہندوؤں سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا۔ مثلاً محمود غزنوی نے [illegible]
فوج میں داخل نہیں کیا۔ اسی طرح علاؤ الدین نے کسی ترک کو فوج میں گھسنے نہ [illegible]
بے دریغ اپنی فوجوں میں ہندوؤں کو نہ صرف بطور سپاہیوں کے بلکہ بطور [illegible]
اب رہا ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کا برتاؤ، اس کی نسبت ہم زیادہ [illegible]
موقع پر سلطان محمود کی حمایت کرنا ہمارا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا [illegible]

یا قومی نہ تھیں۔ اس کی تائید میں مورخ الفنسٹن کا ایک قول نقل کر دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان محمود نے ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو، اور سوائے لڑائی کے کسی ہندو کو قتل کیا ہو"

سلطان محمود کے بعد اس کا جانشین سلطان مسعود ہوا۔ اس کے بڑے عہدے دار اور درباری ہندو بھی تھے۔ جب اس کے نائب احمد نیالتگین نے سرکشی کی تو تمام مسلمان درباریوں کو چھوڑ کر سلطان مسعود نے ایک ہندو سردار تلک نامی کو متعین کیا جس نے احمد مذکور کو شکست دی، اور قتل کیا۔ پھر اسی تلک نے سلطان مسعود کی طرف سے راجہ ہانسی کے خلاف لڑ کر قلعہ ہانسی فتح کیا۔ ایک طرف تو ہندو مسعود کی جانب سے ہندوستان میں لڑ رہے تھے، دوسری طرف پانسو ہندو خراسان میں سلجوقیوں کے خلاف مسعود کی طرف سے مصروف پیکار تھے۔ اس لڑائی میں سلجوقیوں سے شکست کھا کر سلطان مسعود نے ارادہ کیا کہ وہ اپنا دارالسلطنت غزنی سے ہٹا کر لاہور کر دے، اس کے لئے اس نے تین ہزار اونٹ سونے چاندی اور جواہرات کے لادے، اور تمام اس خزانہ کو ہندو فوج کے ساتھ لاہور کو روانہ کیا، جو بالآخر جہلم کے کنارے آکر لوٹ لیا گیا۔ پس اس زمانہ میں ہندوستان کے کسی صوبہ کا روپیہ غزنی جانے یا غزنی کا روپیہ کسی دوسرے صوبہ میں جا کر لُٹ جانے کے معنی یہ تھے کہ وہ روپیہ ہندوستان سے باہر چلا گیا، یا باہر کا روپیہ ہندوستان میں آیا۔ حقیقت کے اعتبار سے اس زمانہ میں یہ بے معنی الفاظ تھے۔

اور غزنویوں کے بعد جبکہ مسلمان بادشاہوں کا دارالسلطنت غزنی سے ہٹ گیا تو مسلمان فاتحوں کے غیر ملکی ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ وہی غزنی جس کو اس زمانہ میں مسلمانوں کے تعصب اور مذہبیت کا مرکز قرار دے رکھا ہے، اس پر وہ وقت بھی گذر گیا ہے جبکہ بہرام شاہ ہندو راجاؤں اور ٹھاکروں کی فوج ساتھ لیکر غزنی پر چڑھائی کرتا ہے، اور جب شہر پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے تو علاء الدین حسن غوریوں کا لشکر بہرام شاہ کے خلاف لاتا ہے، اس میں ہندو فوجیں بھی غزنی کی حفاظت کے لئے بہرام شاہ کی طرف سے لڑتی ہیں۔ مگر علاء الدین حسن کامیاب ہو کر غزنی میں سات شبانہ روز قتل کا بازار گرم کر کے شہر میں آگ لگا دیتا ہے اور غزنوی سلاطین کی قبروں کو اُدھیڑ کر اُن کی لاشوں اور ہڈیوں کو نکلوا کر آگ میں جلا دیتا ہے۔ [illegible] سے [illegible] کا لقب ملتا ہے، اور وہ کامیابی کے بعد ایک [illegible] نظم لکھتا ہے۔

[illegible] حملے ہندوستان کی سلطنت پر ہوئے [illegible] در اصل [illegible] ندان

خلجیوں، تغلقوں، سیدوں، لودیوں پر تھے۔ اور یہ سب کے سب مسلمانوں کے خاندان تھے۔ حتیٰ کہ سب سے آخر میں مغل غالب آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حملے سراسر سیاسی تھے اور مذہبی تعصبات سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اُس زمانہ کی لڑائیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ صرف بادشاہوں میں لڑائی ہوتی تھی اور اُس کا اثر رعایا پر کچھ نہ پڑتا تھا۔ بادشاہ یکے بعد دیگرے جاتے اور آتے تھے، اور سوسائٹی کا نظام بدستور قائم رہتا تھا۔ ان سب بادشاہوں کا اور بالخصوص مغلوں کا جو برتاؤ اہلِ ہند کے ساتھ رہا ہے اُس کی تفصیل اگر یہاں کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے۔ صرف نمونہ کے طور پر بابر کا وصیت نامہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو اُس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے حق میں یکم جمادی الاوّل سنہ ۹۳۵ھ مطابق ۲۰۔۹ جنوری سنہ ۱۵۲۹ء بمقام دھولپور بزبان فارسی لکھا تھا۔ اُس کا ضروری اقتباس اُردو میں حسبِ ذیل ہے:۔

"استحکام سلطنت کے مدِ نظر تحریر ہے کہ اے میرے فرزند ہندوستان مذاہبِ مختلفہ سے بھرا پڑا ہے۔ بحمد اللہ کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے اس کی بادشاہی عطا فرمائی۔ تمھیں لازم ہے کہ اپنے دل کو ہر قسم کے مذہبی تعصبات سے خالی کر کے ہر قوم کے طریق کے مطابق عدل و انصاف کرو۔ اپنی بادشاہی کے اندر کسی قوم کے عبادت گاہوں کو خراب مت کرنا، اور ایسا انصاف کرنا کہ بادشاہ رعیت سے اور رعیت بادشاہ سے خوشحال ہو جائے۔ اسلام کی ترقی تیغِ ظلم کے بجائے تیغِ احسان سے بہتر ہے۔ اہلِ سنت اور شیعہ کے مناقشات سے بھی چشم پوشی کرنا، کیونکہ اختلاف ضعفِ اسلام کا باعث ہے۔ مختلف العقیدہ رعایا کو اربعہ عناصر کی طرح متحد کر دو تاکہ سلطنت کا جسم امراضِ مختلفہ سے محفوظ رہے[1]۔"

یہ امر کہ بابر کی اولاد نے اُس کے وصیت نامہ پر عمل کیا، اس سے ظاہر ہے کہ مغل بادشاہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ تقریباً تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔

رُباعی

ہر چند شکارِ درد و حرماں ہوں میں صحت نے کہا کہ عین راحت ہوں میں
اُلفت سے کہا جو میں نے تو بھی کچھ کہہ تو اُس نے یہی کہا کہ اُلفت ہوں میں

ادیب لکھنوی

---

[1] تاریخ کا روشن پہلو از محمد دین فوق صفحہ ۱۱

صبحِ وطن

(از پنڈت اندرجیت شرما، اچھنیرا ضلع میرٹھ)

غیب کے پردے سے جس وقت نکل آتی ہے — نور برسا کے شبِ تار پہ چھا جاتی ہے
گلشنِ ہند کی ہر بزم کو گرماتی ہے — دلِ بیمار کو پیغامِ شفا لاتی ہے
محو ہو جاتا ہے ہر ذرّہ ضیا باری پر
دل تڑپ اُٹھتے ہیں سب نغمۂ بیداری پر

تیرے دیدار سے ہو جاتی ہیں آنکھیں روشن — نور سے تیرے چمک اُٹھتا ہے ایوانِ کُہن
کاہ کیا کوہ بھی ہو جاتے ہیں سرگرمِ سخن — وجد میں جھومنے لگتے ہیں جوانانِ چمن
شور ہوتا ہے ترا دَیر میں بُت خانے میں
رنگ کھلتا ہے ترا جام میں پیمانے میں

غنچۂ دل کو کھلاتی ہیں ہوائیں تیری — مست کر دیتی ہیں روحوں کو نوائیں تیری
خفتہ بختوں کو جگاتی ہیں فضائیں تیری — گھر بنا لیتی ہیں آنکھوں میں ادائیں تیری
کلفتِ زیست مٹا دیتے ہیں تیرے منظر
یادِ جنّت کی بھلا دیتے ہیں تیرے منظر

جس میں تیرا نہ گذر ہو کوئی گلزار نہیں — تیرا جلوہ نہ ہو جس پر کوئی کہسار نہیں
کونسی بزم ہے جس میں تو ضیا بار نہیں — تو نہیں ہے تو کہیں گرمیِ بازار نہیں
زینتِ صحنِ چمن ہے ترے دم سے باقی
نغمۂ حُبِّ وطن ہے ترے دم سے باقی

تیرا ہی جوش ہے دریاؤں کا تلاطم کیا ہے — تیرا ہی حسن ہے پھولوں کا تبسّم کیا ہے
تیرا ہی ذکر ہے کلیوں کا تکلّم کیا ہے — تیرا ہی راگ ہے چڑیوں کا ترنّم کیا ہے
یہ صبوحی میں جو مشغول ہیں پینے والے
نظر آتے ہیں ترے جام کے سب متوالے

آسماں پر جو ترا روئے دُلارا چمکا
گھاٹ گنگا کا تو جمنا کا کنارا چمکا
بے نواؤں کا غریبوں کا سہارا چمکا
مادرِ ہند کی قسمت کا ستارا چمکا

نگہِ لطف سے سب غمزدہ دل شاد ہوئے
غیر آباد جو جنگل تھے وہ آباد ہوئے

ہم نے ہر حال میں اپنا تجھے رہبر پایا
خار پر ہاتھ جو ڈالا تو گُل تر پایا
آنکھ سے ٹپکے ہوئے اشک کو گوہر پایا
جب کُھلی آنکھ ترا سامنے منظر پایا

درد میں دُکھ میں کبھی ساتھ نہ چھوڑا تو نے
خدمتِ خلق سے منھ ہی نہیں موڑا تو نے

تیرے ہی فیض سے معمور ہے دامانِ وطن
رشکِ جنت ہے ترے نور سے میدانِ وطن
ہے تو ہی روحِ وطن اور تو ہی جانِ وطن
خاک میں دیکھ نہ مل جائے کہیں شانِ وطن

باغِ ہستی میں ترے دم سے بہار آئی ہے
تجھ پہ سو جان سے قرباں دلِ سودائی ہے

کھنچ گئی دل پہ ترے نقشِ وفا کی تصویر
دمِ عیسٰی ہے ہمیں تیری ہوا کی تاثیر
چھوڑ کر اب تجھے ہوں کس سے بھلا دامنگیر
تو ہی تدبیر ہماری ہے تو ہی ہے تقدیر

زندگی بھر نہ چھُٹے ہاتھ سے تیرا دامن
بعد مرنے کے ملے تیرے ہی سایہ کا کفن

اے کشورِ ہندوستاں!

اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن میں موجزن، اُن آبشاروں کے وطن
نازاں ہے جن پر ایشیا اُن کوہساروں کے وطن
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

روش صدیقی

شاہراہ بہار (ہمالیہ)

اداکاری

(از منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

فنِ رقص کی طرح اداکاری کی ابتدا بھی اس عہد قدیم کی رہینِ منت ہے جبکہ نطق زبان والفاظ کے استعمال سے ناآشنا ہونے کے باوجود بیتابِ تکلم تھا، لیکن ابھی اس نگین فن نے نقالی کی حدود سے تجاوز نہ کیا تھا، نہ اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی کہ یک جنبشِ دل کی گہرائیوں میں گدگدی پیدا کرکے روح پر وجدانی کیفیت طاری کردے۔ تاہم وہ نمود و شہود کی ساعتِ اولین ہی سے محتاجِ اثر نہ تھی اس اعتبار سے اداکاری کے نقوشِ اولین فنونِ لطیفہ کی صف میں جگہ پانے کے مستحق قرار نہیں دیے جاسکتے۔

ظاہر ہے کہ ہر فن کا مخزن و مولد فطرت ہے، اور نقالی بھی اپنی وسعت و ہمہ گیری کے لحاظ سے فطرتِ بشری کے مطابق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزِ ازل ہی سے نقالی کی قدرت انسانی خمیر میں ودیعت ہوئی ہے بہرحال اداکاری کے ابتدائی مدارج اور انتہائی عروج کے پیشِ نظر اس فنِ لطیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) نقالی،

(۲) اصل کاری

نقالی سے مراد یہ ہے کہ اداکار اپنی عضلاتی حرکتوں اور جنبشِ اعضا کی وساطت سے کسی شے کی ہوبہو نقل یا تصویر اُتار کر دکھادے۔ لیکن اصل کاری کا درجہ اس سے بلند تر ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس میں نقالی کے ساتھ ساتھ مادۂ تخلیق سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر نقالی کا جسمانی حرکات و سکنات سے تعلق ہے، اور اصل کاری روحانیات سے وابستہ ہے۔ نقالی میں وجدانی کیفیات اور جمالیات کا عنصر اصل کاری کی بہ نسبت اس قدر قلیل ہوتا ہے کہ اس سے خلاقی کا جوہر یک لخت معدوم و مفقود ہوجاتا ہے۔ اور وہ شانِ خود نمائی مترشح نہیں ہوتی جو اصل کاری کا حصہ ہے۔

ابھینے یا اداکاری ناٹک کا جزو لاینفک ہے۔ یہ ثابت ہے کہ "نرتیہ ناٹک" ہندی ناٹکوں کی ابتدائی صورت ہیں۔ ان میں "درو راگ" کے تتبع میں جو ناچ مستعمل و مروج تھے وہ منسلکہ و متعلقہ گیتوں کی حرف بحرف

ترجمانی کرتے تھے۔ مغنیہ کی لَے کے زیر اثر، خاصہ راگ کی لشکیں کے ساتھ ساتھ جذبات کا اظہار ابھینے یا تباوہ کی خاموش زبان میں کرتی جاتی تھی۔ لیکن ابھینے کے ساتھ رقص کا ہونا لازمی تھا۔ اس طرح ناچ تو ابھینے سے آزاد تھا، مگر ابھینے یا تباوہ ہر حالت میں ناچ کا پابند تھا۔

اگر رقص کی معینہ حرکات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تباوہ خود رقص ہی کا ایک جزو ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اداکاری کی ابتدا رقص کی رہینِ منت ہے۔ ہند قدیم کے "چھیا ناٹک" عام ناٹکوں کے پیشرو تسلیم کئے جا چکے ہیں "کٹھ پتلی کا ناچ" ان کا دوسرا نام ہے۔ کٹھ پتلی کے ناچ یا چھیا ناٹک میں اداکاری کی تمام ابتدائی خصوصیات موجود ہیں۔ اور فنی نقطۂ نگاہ سے نقالی کا بہترین نمونہ ہیں۔ فنِ رقص کی ترقی کے دوش بدوش نرتیہ ناٹک کوچی (कुममी) کیاتکلی (कैकात्तक ली) اور کتھاکلی وغیرہ ناچ عرصۂ ظہور میں آئے جو آگے چل کر اصطلاحی ناٹکوں کا سنگِ بنیاد بن گئے۔

نرتیہ یا رقص کے ذریعہ شردیہ کاویہ بھی "درشیہ کاویہ" بنجاتا ہے اور سامعہ کی بجائے باصرہ پر اثرانداز ہوکر فردوسِ گوش کو جنتِ نگاہ بنا دیتا ہے۔ رقص کی غیر معمولی رفعتوں نے ابھینے یا اداکاری کو اپنے مخصوص انداز میں مقید کر لیا تھا، اور اس پر بیشمار پابندیاں عائد کردی تھیں رشدہ شدہ یہ اصولی پابندیاں اتنی بلند ہوتی گئیں، اور فنِ رقص اس درجہ ادق ہوگیا کہ ہر شخص اُسے کامیابی کے ساتھ اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہ بنا سکا، اس لئے اس سے اداکاری یا تباوہ کا فن اخذ کیا گیا۔

نرتیہ ناٹکوں تک تو ان قیود کی پابندی قائم و برقرار رہی، لیکن اصطلاحی ناٹکوں کے آغاز کے ساتھ ساتھ ان کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ اصول اور معیارِ فن کا سارا طلسم چشم زدن میں ٹوٹ کر رہ گیا اور اداکاری نے نہ صرف ایک جداگانہ فن کی حیثیت اختیار کر لی بلکہ وہ اصل کاری سے بھی ہمدوش ہوگئی۔ اس طرح ابھینے (اداکاری) رقص سے مطلق آزاد ہوگیا۔ اب جو ناٹک مروج ہوئے ان کی تصنیف کا اصل مقصد اصل کاری قرار پایا۔ چنانچہ گونگے سوانگوں اور خاموش مظاہروں سے ان کا آغاز ہوا، اور جب اصطلاحی ناٹکوں کا دور دورہ ہوا تو یہ فن انتہائے کمال کو جا پہنچا لیکن راگ ناٹکوں کی تخلیق سے اس کی تمام ترقیاں معرضِ زوال میں آگئیں۔ اور اداکاری سے نقالی کا جو عنصر خارج کر دیا گیا تھا پھر عود کر آیا۔

راگ ناٹک صرف تباوہ تک ہی محدود تھے رقص سے بالواسطہ انھیں کوئی تعلق نہ تھا، لیکن چونکہ راگ ناٹکوں میں زبان کا استعمال بھی ہونے لگا تھا اس لئے اداکاری بھی پستی کی جانب

مائل ہو چلی۔ زبان کے استعمال سے اداکار کی توجہ منقسم ہو جاتی ہے اور اس کی حرکات و سکنات میں وہ دلپذیری و جاذبیت باقی نہیں رہتی جو خاموش اداکاری کی لگاوٹوں کی جان ہے۔

رقص میں ابھینے یا اداکاری کا مظاہرہ جس شان کے ساتھ ہوتا ہے اور نظر نوازی کا جو سامان رقص فراہم کرتا ہے وہ محض اداکاری کی دسترس سے باہر ہے۔ جہاں تک ابھینے (اداکاری) کا تعلق ہے رقص اسے اپنے مخصوص انداز میں دوآتشہ بنا دیتا ہے۔ رقص موسیقی، مصوری اور شاعری کا حسین مجموعہ ہے لیکن اداکاری میں مصوری کے زیر اہتمام شعریت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اس کے باوجود بھی رقص تصنع کی گرفت سے اتنا آزاد نہیں ہے جتنا ابھینے (تیا دہ) اصولی طور پر ہے یا ہو سکتا ہے۔ اداکاری نسبتاً حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس لحاظ سے اسے فنِ رقص پر فوقیت حاصل ہے لیکن وہ جن پست اور اسفل جذبات کی مظہر ہے رقص کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ عشق و شیفتگی کی جو بے عریانی اس کا خاصہ ہے اس سے رقص فطری طور پر محترز ہے۔ اداکاری دنیائے مجاز کا مخصوص حربہ مگر رقص ہمہ تن روحانی بلندیوں سے ہمدوش ہے۔ وہ سراپا تجلّی ہے سقم و سوقیت سے بیگانہ۔ اداکاری حُسن ہے مگر بے نیاز حجاب، عریانی سے مملو۔ سحر کاری رقص کا حصہ ہے اور حسن کاری اداکاری کا طرۂ امتیاز دونوں دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لیکن دونوں الگ الگ اور ایک دوسرے سے دُور دُور!

اداکاری کا میدان وسیع تر ہے اور وہ رقص کی طرح لے اور تال کی پابندیوں سے قطعاً آزاد اس وسعت و ہمہ گیری کے باوجود اس پر عامیانہ رنگ غالب ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنا اور احساسات و جذبات کی لامحدود گہرائیوں کی تشکیل و تخلیق اس کا اہم فریضہ ہے اداکار اپنے جسم کو اس طرح متحرک کرتا ہے کہ محسوسات کی ایک لطیف دنیا کیفیتِ مجسّم بن کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور درد و مسرّت کا ایک بے پایاں سمندر متشکّل و متحرک ہو کر روح کی پہنائیوں میں ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

انسانی جذبات کی دنیا جوش و غضب، نفرت و پسندیدگی، کلفت و مسرّت، درد و آسودگی، عجز و تکبر، ترحم و تفکّر، اضطراب و اطمینان، فکر و آسودگی، غفلت و بیداری، شعور و بدحواسی، طلب و تقاضہ تکرار و محبت، رونے اور ہنسنے کے مختلف پہلوؤں کی وسیع حدود میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے جذبے میں خواہ وہ کسی نوع کے کیوں نہ ہوں رنج یا خوشی کا احساس مضمر رہتا ہے۔ اداکاری انھیں جذبات کو ابھارتی ہے اور معیّنہ عضلاتی حرکات کی مدد سے روح میں ایک خاص ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

اداکار سر، ہاتھ، پیر، چہرہ، اور آنکھوں کی مدد سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے مطالبہ

کی ادائیگی میں زبان کا بھی سہارا لیتا ہے، لیکن جو کام آنکھیں کرتی ہیں وہ کسی دوسری طرح ممکن نہیں۔ آنکھوں سے تشکر واطمینان، محبت وعقیدت، اضطراب وعذاب، غیض وغضب، نفرت وحقارت، غم ومسرت، جوش وسکون، اورصبرواستقلال غرض ہر وہ راز عیاں ہوجاتا ہے جو اداکار کے دل میں نہاں ہو۔ لیکن دل پر قابو پانا آسان ہے، آنکھوں پر اقتدار حاصل کرنا دشوار ہے۔

بلحاظ فن اداکاری نہایت اہم اور دشوار مشغلہ ہے۔ جہاں ایک ہی جذبہ کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں وہاں متضاد محسوسات کی نمود ونمایش کا ایک ہی طریق بھی ہے۔ مثال کے لئے یوں سمجھیے کہ اظہار غم وہمدردی کے لئے بھی آنسو بہائے جاسکتے ہیں، اور انتہائی جوش ومسرت کے باعث بھی آدمی رونے لگتا ہے۔ آنکھوں سے بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے اور انگلی سے بھی۔ اقرار و انکار کے لئے زبان بھی ہلائی جاسکتی ہے اور سر بھی، اب یہ اداکار کا کام ہے کہ اس کی حرکات وسکنات میں ایسی موزونیت ہو کہ جس سے مطلوبہ جذبہ کا درست اظہار ہوسکے، اور اس کی روح کا پیغام سمجھنے میں دیکھنے والوں کی غلط فہمی کا امکان واندیشہ نہ رہے۔ اور وہ اپنے عمل میں اس طریقۂ کار کا انتخاب کرے جو مناسب وقتوں کے اعتبار سے برمحل ومناسب ہونے کے علاوہ سب سے زیادہ مؤثر اور جاذب توجہ ہو۔

اداکار کا فرض اولین ہے کہ وہ کسی جذبہ کی تشکیل وترجمانی سے پیشتر یہ معلوم کرلے کہ اس کے بنیادی تاثرات کیا ہیں۔ آیا اس کا جذبہ رنج سے ملحق ہے یا خوشی سے قریب تر؟ مثلاً رحم وہمدردی کے آنسوؤں میں بےچینی مستور ہوتی ہے اور مسرت کے آنسوؤں میں سکون وامید۔ اسی طرح نفرت و حقارت میں الجھن وانقباض اور پسندیدگی میں خوشی واطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ یہ معلوم کرلے گا کہ تو پھر وہ احساسات کے امتیازات کو بآسانی واضح کرسکے گا۔ اس لئے اداکار کا ذکی الحس ہونا ضروری ہے اور حصول کامیابی کے لئے ذہنیات کا ادراک لابدی۔

"بھرت نے ناٹیہ سے اوستھا نوکیرتیہ ناٹیم (" अवस्थानुकृति: नाट्यम ") یادی کیفیات اور مزاجی تبدیلیوں کی ایسی جیتی جاگتی مصوری مراد لی ہے جو بھاؤ [(محسوسات) (भाव)] راگ تال ترنگ، ترنم اور تغزل سے ہمدوش ہو۔

ہم پیشتر لکھ چکے ہیں کہ بھرت ناٹیہ شاستر کے نزدیک ناچ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) ناٹیہ، اور (۲) اناٹیہ

پہلی قسم کے ناچوں میں اداکاری اور بتاوہ پیش پیش ہوتا ہے اور دوسری نوع کے رقص بتاو سے

سے عاری ہوتے ہیں، اور ان کا مقصد لے (ताल) کی کشائیں اور لطیف جسمانی حرکات کے ذریعہ حسن کاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لتمک ناچ ادنیٰ درجہ کا ناٹیہ نرتیہ مانا گیا ہے۔ ہیں اداکاری کا درجہ بہت پست ہوتا ہے۔ ایسی معیاری اداکاری میں ناٹیہ کی تمام تر خصوصیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

بھرت نے ناٹیہ کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے: (۱) روپک (۲) اُپ روپک۔

روپک (रूपक) سے واکیارتھ ابھینے (वाक्यार्थ अभिनय) یا رس ابھینے اور اُپ روپک (उप रूपक) سے پدارتھ ابھینے یا بھاؤ ابھینے مراد لی گئی ہے۔ روپک میں زبان کا استعمال ناگزیر ہے اور اُپ روپک میں بھاؤ یا محسوسات کو ترجیح حاصل ہے۔ ناٹیہ شاستر میں ابھینے کی چار قسمیں گنائی گئی ہیں۔

(۱) واچیکا　वाचिका　یا تقریر

(۲) ستوِیکا　सत्त्विका　یا محسوسات کی غیرارادی تشکیل

(۳) انگیکا - اور　अङ्गिका　یا جسمانی نقل و حرکت

اور (۴) اہریا　आहरिया　یا میک اپ (تبدیل ہیئت)

رقص کے لئے جیسا کہ ظاہر ہے واچیکا اور اہریا کی اصولاً کوئی حاجت نہیں ہے۔

نرت کو ناٹیہ شاستر نے اداکاری کا جزو لطیف مانا ہے۔ ادنیٰ قسم کے ناچ (ناٹیہ) نرت میں نہیں ملتے۔ بھاوؤں میں ہست ابھینے (हस्त अभिनय) یا مُدرا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہاتھوں کی توڑ مروڑ سے ارتھ (अर्थ) یا تخیلات اور مادی اشیاء کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ یہی مُدرا اجنتا کے غار خصوصاً غار ۲ اور نئی دہلی کے قلعہ کی جدید مصوری کی جان ہے۔ جو نندلال بوس، ونکٹ، آپا، ستاردا، اُکیل، اور استِ ہالدار کے اعجاز قلمکاری کی رہین ہیں۔

بھرت نے بھی اداکاری کا بہترین ذریعہ آنکھ ہی کو مانا ہے، محسوسات سب سے پہلے آنکھ ہی سے ترشح ہوتے ہیں۔ پھر جسم کے مختلف حصص پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جسمانی نقل و حرکت سے ان کی تشریح ہوتی ہے۔

آنکھوں سے تینتیس[۳۳] ویبھیچاری بھاؤ (वीभचारी भाव) یا عام جذبات اور نو[۹] استھائی بھاو (स्थायी भाव) یا مخصوص جذبات نمایاں ہوتے ہیں جو دیکھنے والے کے دل میں رس، یا کیفیات کی لہریں موجزن کر دیتے ہیں۔

آنکھوں کے علاوہ چہرے کے دوسرے حصے مثلاً رخسار، ابرو، ناک، ہونٹ وغیرہ سے بھی

کام لیا جاتا ہے، ریچیکا (रेचिका) یا گردن اور کمر کے اوپر کے حصہ جسم کی حرکت سے بھی نمود جذبات میں مدد لیجاتی ہے۔ بھرت کے نزدیک انگیکا ابھینے (अङ्गिका अभिनय) یا عضلاتی نقل وحرکت تین طرح کی ہوتی ہے:-

(۱) چہرہ کا عمل،

(۲) عام جسمانی حرکات،

اور (۳) آنا جانا، اُٹھنا بیٹھنا، وغیرہ

رقص میں جسم کے حسب ذیل چھ انگ (अङ्ग) یا حصوں سے کام لیا جاتا ہے:-

(۱) سر، (۲) ہاتھ، (۳) کولا، (۴) کمر، (۵) پیر، (۶) بغل اور سر سے سینہ تک کی ہیئت انسانی،

ان کے معاون یہ چھ اُپ انگ (उपअङ्ग) ہوتے ہیں:-

(۱) آنکھ، (۲) ناک، (۳) ابرو، (۴) رخسار، (۵) ہونٹ، (۶) اور زنخدان۔ ان کا تعلق چہرے کے بناؤ بگاڑ سے ہے، اور مُدرا کا شریرا بھینے (शरीर अभिनय) سے۔ اداکاری میں اُپ انگ کا درجہ پہلا ہے اور رقص میں دوسرا۔ بھرت نے ایک اشلوک میں کہا ہے:-

"گلے سے راگ نکلتا ہے، پیر سے تال بتائی جاتی ہے، آنکھوں سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ہاتھوں سے ماسوا کی تشکیل کی جاتی ہے۔"

قدیم سنسکرت ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موہنی اتم، اور بینا یک کو نُرت یا ابھینے نرتیہ بہت پرانے ناچ ہیں۔ رگ وید سے لیکر والمیک اور ویاس تک کی تصانیف میں ان کا تذکرہ مدفون ہے گووند دکیشت نے سنگیت سُدھا (सङ्गीत सुधा) میں لکھا ہے کہ دھروپد کی طرح کیتش گان وبیھی ناٹک کا سنگ بنیاد تھے۔ وبیھی ناٹک دراصل راگ ناٹکوں ہی کی ایک قسم ہے۔ دکن میں جب ان کی دھوم ہوئی تو لوگ کھلم کھلا بھرت اور نند لیشور کے معینہ اصولوں سے انحراف کرنے لگے۔ اس طرح پدارتھ ابھینے کے طریق کار میں غیر معمولی اختلاف ہوتا گیا۔ ناٹیہ شاستر کے باب نہم میں اداکاری کے نکات پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ شلپ آدی کرم اور ابھینے درپن نے بھرت کے فرمانوں کی توضیح [illegible] قلم توڑ دیا ہے۔

ناٹیہ شاستر کے مطابق اداکاری کے لئے تبدیل ہیئت نہایت ضروری چیز ہے۔ [illegible] اور دوسری بیشمار اشیا، مثلاً رنگ و روغن، غبار وغازہ وغیرہ کا ذکر ناٹیہ شاستر میں بڑی شرح [illegible] ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اداکار کے حسن اخلاق، تعلیم وتربیت، بود و باش [illegible]

چال چلن کے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ اور اظہار جذبات و محسوسات کے بیشمار پیرائے بیان کئے گئے ہیں۔ آنکھ کی طرح مُدرا کو صدہا قسم کی ذہنی کیفیات کا مظہر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہاتھوں کا یہ عمل ٹپکا کہلاتا ہے۔ اسی طرح پیروں کی حرکات کو چپیتسٹا کہتے ہیں۔ مُدرا اور کارِ نفس کے بعض نمونے نیچے دیئے جاتے ہیں جن سے اداکاری کے طرزِ عمل میں جو اہم اختلافات وقتاً فوقتاً رونما ہوئے روشن ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ افتراقات اختلاطاتِ فن کے دامن گیر ہے۔
بھرت کی تفصیلی ہدایات شاہد ہیں کہ عہدِ قدیم میں صرف اعلیٰ طبقہ اور کیرکٹر کے تعلیم یافتہ افراد ہی اداکار بننے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ بھانڈوں کا پیشہ سمجھا جاتا ہے۔

زمانہ تیس سال پہلے

آج سے تیس سال پہلے زمانہ فروری ۱۹۱۸ء میں ہمارے مرحوم دوست حضرت نادر کاکوروی کی "جلوہ گاہ دنیا" کے عنوان سے ایک دلکش و سبق آموز نظم شائع ہوئی تھی جس کے ابتدائی تین بند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

عجب ترکیب سے رکھی ہے صانع نے بنا اس کی　　کہ صدیاں ہوگئیں ہاں اک اینٹ بھی جس کی نہیں کھسکی
لگی رہتی ہے آمد رفت جسمیں روز جس تس کی　　وہی رونق ہے جسکی اور وہی دلچسپیاں جسکی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

کچھ اس حکمت سے کی ترکیب تعمین رطب و یابس کی　　نہ آیا ہو تنجا ادھر جاڑا اگر گرمی اُدھر کھسکی
وہی اک دورِ تسلسل ہے بہار اس کی خزاں اسکی　　وہی چتون ہے بلبل کی وہی آنکھیں ہیں نرگس کی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

بساطیں اُٹھ گئیں کچھ کچھ کے راجا و سکندر کی　　صفیں برہم ہوئیں حاتم و جم کے خاقان اور قیصر کی
جہاں تھی نوتن کل تک بکرماجیت و اکبر کی　　وہاں اجلاس کونسل کر رہی ہے اب گورنر کی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

مغربی تہذیب

(از حضرت محمود اسرائیلی ۔ بمبئی)

اک شخص کہہ رہے تھے کہ گلزارِ ہند میں
اہلِ فرنگ آئے نسیمِ چمن کی طرح

آمد نے انکی دل کے شگوفے کھلا دیئے
نسرین و یاسمین و گلِ نسترن کی طرح

شاہانِ مغلیہ کا نہ احوال پوچھیئے
وہ نوچتے رہے ہیں زاغ و زغن کی طرح

میں نے کہا بجا ہے یہ ارشاد، اور آپ
اک نکتہ اس میں کہہ گئے اہلِ سخن کی طرح

اس مغربی نسیم نے گل تو کھلا لئے ہیں
یہ اور بات ہے وہ نہ ہوں یاسمن کی طرح

اور اسمیں شک نہیں ہے کہ مٹی میں زر بھی ہے
مانا کہ ہے شگوفۂ صحنِ چمن کی طرح

لب پر شگفتگی ہے تو دل تیرِ غم سے چاک
دیکھو جسے وہ ہے گلِ آشفتہ تن کی طرح

درسِ عمل

(از پنڈت آنند نراین ملا ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)

عشرت گہِ صیاد کا ساماں لیکر
گلچیں کے لئے دولتِ داماں لیکر

کبتک یہ گل و بہار غیروں کے لئے
غیرت ہو تو مٹ جاؤ گلستاں لیکر

ہندوستان کے بنک[1]

(۲) پریسیڈنسی بنک

(از مسٹر شبلی - بی - کام)

طرز جدید کے بنک ہندوستان میں جدید بنکوں کا عہد یوروپین زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے پہل کلکتہ میں "ایجنسی گھر" بنائے گئے۔ جنھوں نے محض اپنے کاروبار کی امداد کے لئے لین دین شروع کیا۔
ساہوکارانہ حیثیت سے یہ "ایجنسی گھر" تاجروں اور نیل پیدا کرنے والوں سے تعلق رکھتے تھے اور جہازوں اور نیل کے کارخانوں وغیرہ کی ضمانت پر ان کو قرض دیتے تھے ہندوستان میں جو انگریز اور یوروپین سکونت پذیر تھے وہ بھی اپنا روپیہ سرکاری کفالتوں میں لگانے کے بجائے انھیں ایجنسیوں میں جمع کر دیتے تھے۔ ان کی شرحِ سود بھی خاطر خواہ تھی
مگر سٹہ بازی میں حصہ لینے کی وجہ سے ایجنسی گھروں کی ساکھ جاتی رہی اور بالآخر سنہ ۱۸۲۹-۳۲ء کے مالی مشکلات کی وجہ سے ان کا خاتمہ ہو گیا۔
ان ایجنسی گھروں کے علاوہ اسی اثنا میں میسرز الیگزنڈر اینڈ کمپنی نے ایک "ہندوستان بنک" بھی یوروپین طرز پر قائم کیا، لیکن وہ بھی سنہ ۱۸۲۹-۳۲ء کی کساد بازاری کی وجہ سے فیل ہو گیا۔
اس کی راکھ پر "یونین بنک" چلایا گیا، لیکن وہ بھی بالآخر سنہ ۱۸۴۸ء میں ٹوٹ گیا۔
بعد ازاں جو بنک قائم کئے گئے ان کا تذکرہ "مشترک سرمایہ دار بنکوں" کے تحت میں آئیگا۔
فی الحال ہم پریسیڈنسی بنکوں کا حال لکھتے ہیں جو ملک کے تین بڑے بڑے احاطوں کے لئے قائم کئے گئے۔
احاطی بنک انیسویں صدی کے اوائل میں غیر ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت بہت کم تھی۔ ملکی تجارت کا چلانا دیسی بنکوں کے ہاتھ میں تھا، جوں جوں تجارت نے فروغ پایا یوروپین طرز پر بنکوں کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایجنسی گھروں یا ہندوستانی بنکوں سے کام لینے میں اول تو مصارفِ کثیر

---

[1] اس سلسلے کا پہلا مضمون زمانہ جنوری سنہ ۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

آتے تھے دوسرے یہ کوئی قابلِ اطمینان طریقہ نہ تھا۔ اس لئے ۱۸۰۶ء میں کلکتہ میں پہلا پریسیڈنسی بنک پچاس لاکھ کے سرمایہ سے قائم ہوا۔ اس سرمایہ میں دس لاکھ روپیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیئے۔

بمبئی میں پہلا بنک ۱۸۴۰ء میں قائم ہوا جس کا سرمایہ باون (۵۲) لاکھ روپیہ قرار دیا گیا، جس میں سے تین لاکھ روپیہ گورنمنٹ نے دیا۔ یہ بنک ۱۸۶۸ء میں بند ہوگیا، کیونکہ اس نے امریکہ میں روئی کے قحط اور خانہ جنگی کی وجہ سے جو سٹہ بازی ہوئی اس میں نمایاں حصہ لیکر نقصان کثیر اٹھایا۔

مدراس بنک ۱۸۴۳ء میں تین لاکھ روپیے کے سرمایہ سے قائم ہوا، اس میں بھی تین لاکھ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیا۔

اِن تین پریسیڈنسی بنکوں کے قائم ہونے کی وجہ سے بنگال بنک کے تمام ہندوستان پر حاوی ہونے کا جو امکان تھا وہ جاتا رہا۔

آغاز ہی سے اِن پریسیڈنسی بنکوں کا گورنمنٹ کے ساتھ قریبی تعلق تھا۔ گورنمنٹ نے نہ صرف سرمایہ کی فراہمی میں حصّہ لیا بلکہ اُسے ڈائرکٹروں کی تقرری کا بھی اختیار حاصل تھا۔

۱۸۵۷ء تک سکرٹری اور خزانچی کے عہدے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازموں کے ہاتھ میں رہے، اس کے عوض بنکوں کو بعض مراعات دی گئیں جن میں سے گورنمنٹ ساہوکاری کا اجارہ سب سے اہم تھا۔

بعض بندشوں کی وجہ سے اجرائے نوٹ کے حق کا بہت کم عملی فائدہ ہوا، مثلاً کل موجبات "نقد زرِ محفوظ" سے پہلے تین گنا اور بعدہٗ چار گنا سے زائد نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۸۳۹ء کے بعد نوٹوں کے جاری ہونے کی انتہائی مقدار بھی مقرر کر دی گئی، مگر ۱۸۶۲ء میں اجرائے نوٹ کا حق واپس لے لیا گیا، کیونکہ گورنمنٹ نے خود اپنا کاغذی سکہ جاری کرنا شروع کر دیا۔ اس کے معاوضہ کے طور پر گورنمنٹ اپنی رقومات پریسیڈنسی بنکوں میں بطور امانت رکھوانے لگی

قانون پریسیڈنسی بنک ۱۸۷۶ء کی رو سے گورنمنٹ نے اپنے سرمایہ کا ایک حصہ واپس لے لیا اور ڈائرکٹر۔ سیکرٹری اور خزانچی وغیرہ مقرر کرنے کا حق بھی بنکوں کے حصہ داروں کو دیدیا۔

اس کے بعد پریسیڈنسی بنک سرکاری نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت عام تجارتی بنکوں کی سی ہوگئی اگرچہ وہ اب بھی ہندوستان کے مالی نظام کا جزو لاینفک متصور ہوتے تھے، اور حکومت کی قلیل امانتیں رکھنے کے علاوہ سرکاری قرضے کا انتظام و انصرام بھی انھیں کے سپرد تھا مگر انھیں گورنمنٹ سے اپنے حسابات کی پڑتال کروانا اور ہفتہ واری گوشوارے بھی شائع کرنا پڑتے تھے۔

محفوظ سرکاری خزانے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۶ء تک صدر مقاموں پر گورنمنٹ کی تمام رقومات پریسیڈنسی بنکوں میں رکھنا ضروری تھا۔ لیکن چونکہ بنگال بنک اور بمبئی بنک سے امانتیں واپس لینے میں بعض دشواریوں کا تجربہ ہوا، اس لئے گورنمنٹ نے بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں اپنے خزانے قائم رکھنے کا تہیہ کیا۔

بعد ازاں گورنمنٹ کی رقومات کا اکثر حصہ ان محفوظ خزانوں میں رکھا جانے لگا، اور صرف روزمرہ کی ضروریات کے لئے ایک قلیل حصہ تعلقہ اور ضلع کے خزانوں میں رکھا گیا۔

۱۸۷۶ء سے نئے انتظامات شروع ہوئے، جن کے مطابق گورنمنٹ نے ایک خاص معیار سے کم رقومات پر سود دینا بھی منظور کر لیا۔ اگرچہ وہ رقومات جمع کرنے والوں سے کوئی وعدہ کرنے کے لئے تیار نہ تھی مگر عملی طور پر خاص معیار سے زیادہ ہی رقمیں جمع رہنے لگیں، لیکن ساہوکاروں کے نقطۂ نظر سے ان کی تعداد قلیل ہی رہی۔ بہرحال زیادہ تر رقم سرکاری خزانوں میں جمع ہوتی رہی اور گرانی کے زمانہ میں اس کی کتنی ہی ضرورت ہوتی ہو لیکن یہ رقمیں رہیں مقفل رہتیں۔

وقتاً فوقتاً تجاویز پیش کی گئیں کہ پریسیڈنسی بنکوں کے ذریعہ خزانوں سے لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے قرضے دیدیئے جایا کریں۔ لیکن گورنمنٹ ان تجاویز پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھی، کیونکہ ہندوستان کے حالات بعض اوقات فوری ضروریات کے محتاج ہو جاتے تھے، اور وقت پر روپیہ نہ آنے سے بہت سی مشکلات کا سامنا ہو سکتا تھا، دوسرے اس سے یہ غلط فہمی بھی پھیلنے کا اندیشہ تھا کہ سرمایہ گورنمنٹ لگا رہی ہے، حالانکہ وہ لوگوں کے فاضل اندوختے کا حصہ تھا۔

تاہم گورنمنٹ پر بہت زور دیا گیا اور بالآخر ۱۸۹۸ء میں وزیر ہند سے سفارش کی گئی کہ وہ زائد روپیہ ہر سال جنوری سے مئی تک پریسیڈنسی بنکوں کو مقررہ شرح سود سے ایک فیصدی کم شرح پر قرض دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ وزیر ہند نے یہ سفارش اس شرط پر منظور کر لی کہ اس دادوستد سے گورنمنٹ کی تحصیل وصول و ترسیل زر میں کوئی ہرج واقع نہ ہو۔ نیز یہ قرض مروجہ شرح بنک پر دیئے جائیں۔ چونکہ یہ شرائط بہت کڑی تھیں اس لئے شاذ ہی قرضے دیئے گئے۔

چمبرلین کمیشن نے اس کے بجائے محفوظ خزانہ کے طریق کو اڑانے یا ان رقومات کو پریسیڈنسی بنکوں میں منتقل کر دینے کی سفارش کی، اور مندرجہ بالا شرائط کو نرم کرنے کی رائے دیکر تجویز کیا کہ پریسیڈنسی بنکوں کو عام نرخ بنک سے ایک یا دو فیصدی کم شرح پر قرض دیا جائے۔

جنگ ۱۹۱۴ء کے دوران میں گورنمنٹ نے ایک کثیر رقم پریسیڈنسی بنکوں کو اس غرض کے لئے دی تاکہ عوام کو جنگی قرضے میں حصہ لینے میں آسانی ہو۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں محفوظ خزانہ کا طریقہ اٹھا دیا گیا، اور گورنمنٹ کے حسابات پہلے امپیریل بنک میں اور اب سنہ ۱۹۲۵ء میں ریزرو بنک میں رکھے جانے لگے ہیں۔

کاروباری بندشیں | پریسیڈنسی بنکوں پر جو بندشیں لگائی گئی تھیں اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) عام طور پر کسی بنک کو غیر ملکی مبادلہ کا کام کرنے کی اجازت نہ تھی، صرف مدراس پریسیڈنسی کے بنک کو سیلون کے متعلق اجازت تھی۔

(۲) کسی بنک کو غیر ملکوں سے قرض لینے کی اجازت نہ تھی۔

(۳) قرض دینے کے لئے بھی روپیہ کی مقدار، مدت قرض اور ضمانتوں وغیرہ پر بندشیں لگا دی گئی تھیں جس کاروبار کی انھیں اجازت تھی اُس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ امانتیں لے سکتے تھے اور گورنمنٹ اور دیگر نیم سرکاری کفالتوں میں روپیہ لگا سکتے تھے۔ انھیں ملکی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنے کی اجازت تھی وہ ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کی ضمانت پر قرض دے سکتے تھے، اور قیمتی اشیاء کی امانتیں رکھنے سونے چاندی کی خرید و فروخت کرنے اور بعض میونسپل بورڈوں کے اُدھار کاروبار کا انتظام کرنے کی بھی اجازت تھی۔

اِن بندشوں کے باوجود پریسیڈنسی بنکوں نے کافی ترقی کی، اور گورنمنٹ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے ملک میں اُن کی ساکھ اور ناموری قائم ہوگئی تھی۔

ذیل میں اعداد و شمار کا ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۰ء تک پریسیڈنسی بنکوں کی کیا پوزیشن تھی:۔

لاکھ روپیوں میں۔

سال عیسوی	سرمایہ	زر محفوظ	سرکاری امانتیں	دیگر امانتیں	نقد	روپیہ جو کاروبار میں لگا	منافع فیصدی
بنگال بنک							
سنہ ۱۸۹۵ء	۲۰۰	۶۸	۱۸۴	۶۷۷	۴۲۲	۱۳۲	۱۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۲۰۰	۱۹۱	۳۰۱	۱۶۲۴	۸۴۰	۳۱۹	۱۴
سنہ ۱۹۲۰ء	۲۰۰	۲۱۰	۴۳۴	۳۳۹۸	۱۲۲۱	۹۱۰	۱۹ ½

سال عیسوی	سرمایہ	زر محفوظ	سرکاری امانتیں	دیگر امانتیں	نقد	روپیہ جو کاروبار میں لگا	منافع فیصدی
بمبئی بنک							
۱۸۹۵ء	۱۰۰	۵۱	۷۹	۳۵۸	۲۲۸	۱۰۵	۱۱
۱۹۱۳ء	۱۰۰	۱۰۶	۲۰۱	۱۰۱۵	۴۷۷	۲۳۲	۱۴
۱۹۲۰ء	۱۰۰	۱۲۰	۳۴۹	۲۷۴۸	۸۷۶	۲۹۸	۲۲
مدراس بنک							
۱۸۹۵ء	۵۰	۱۶	۴۵	۲۷۰	۱۴۴	۳۵	۱۰
۱۹۱۳ء	۷۵	۶۳	۸۶	۱۰۰۵	۲۱۹	۱۰۷	۱۲
۱۹۲۰ء	۷۵	۴۵	۱۱۰	۱۵۷۹	۵۰۵	۲۱۱	۱۸

اس نقشہ سے ظاہر ہے کہ مالی استحکام کے لحاظ سے بنگال بنک اوّل درجہ پر تھا، بمبئی بنک اُس سے کم اور سب سے کم درجہ پر مدراس بنک تھا۔ تمام بنکوں میں سرمایہ بمشکل بڑھا، لہذا کاروبار اور سرمایہ کا تناسب قائم نہ رہ سکا بلکہ دونوں میں روز افزوں فرق ہوتا گیا۔ جنگ کے دوران میں نجی امانتیں بڑھ گئیں اور زرنقد کا تناسب بھی کافی رہا، یعنی موجبات کا کم سے کم ۳۰ فیصدی جو روپیہ کاروبار میں لگا دیا گیا وہ بھی بڑھتا رہا جو بنکوں کے استحکام کا ثبوت ہے

۱۹۲۰ء میں ان تینوں پریسیڈنسی بنکوں کو ایک میں مدغم کر کے امپیریل بنک قائم کیا گیا، جس کا مفصل حال آئندہ لکھا جائیگا۔

(از حضرت فیاض بی اے)

تہذیب کے سینہ کی امانت مذہب
اخلاق کے مفہوم کی وسعت مذہب
افسوس، مگر آج یہ ہم بھولے ہیں!
انسان کو زحمت ہے کہ رحمت مذہب

رحمت ہی مجھے، تجھے ہے زحمت مذہب
دوزخ ترا مذہب، مرا جنّت مذہب
زاہد مجھے کفر و دیں سے کرنا کیا ہے
مجھ مستِ وطن کا ہے محبّت مذہب

یہ دھرم قدیم ہے، وہ مذہب معقول،
ہے رب کی نظر میں کون زائد مقبول؟
فرصت ہے تو بیٹھا ہوا یہ سوچ، مگر
انساں بھی ہے تو، یہ نہ خدا کے لئے بھول

اِک منزلِ مقصود ہے، راہیں شتّیٰ ہیں
جلوہ ہے وہی ایک، نگاہیں شتّیٰ ہیں
اُف برہمن و شیخ کی کوتہ نظری
مجروحِ وطن کے لب پہ آہیں شتّیٰ ہیں

آپس میں یہ چھوت چھات، نفرت کیسی
یہ نام پہ مذہب کے عداوت کیسی
انسان انسان ایک سے ہیں سب
انسان کو انسان سے نفرت کیسی

بندوں میں کوئی فرق نہ کچھ رب میں فرق
الفاظ میں کچھ فرق نہ مطلب میں فرق
انسانیت آنکھوں سے جہاں اوجھل ہو
سمجھو کہ وہیں پڑ گیا مذہب میں فرق

ہندی نہ ہوئے کبھی مسلماں ہندو
ہے اِن کے لباس و نام میں بھی تفرق کی بو
مذہب کی یہی ہے شان و تعریف اگر
گردن پہ ہے اِس کی آدمیت کا لہو

رہنے دے خدا کو دل میں، مذہب گھر میں
کر فرق خدا کے لئے گھر، باہر میں
تو روح کو پاک کر کے انسان بن جا
ہر وقت جنوں سا کیوں ہے تیرے سر میں

مذہب تو تری روح کو چمکاتا ہے
مذہب تو بڑی آدمیت لاتا ہے
مشرق سے ہوا تھا جس ستارہ کا طلوع
تو اُس کو ڈبوتے نہیں شرماتا ہے

حُبِّ وطن اور مسلمان

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ظرف اور اس حد کا تنگ اے حامیِ دینِ مبیں
حیف ہے ناآشنائے رحمۃ للعالمیں

حیف اے دیوار کے پابند، اے در کے اسیر
اپنے حجرے، اپنی مسجد، اپنے منبر کے اسیر!

دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا
کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا

مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گلہ؟
مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟

تنگ فکر و تنگ داماں تنگ ظرف و تنگ جیب
مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے اور زندہ عیب

فرض بھی کر لوں کہ ہندو ہند کی رسوائی ہے
لیکن اسکو کیا کروں، پھر بھی وہ میرا بھائی ہے

باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے
بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے!

سجہ و زنار کی لہروں ہی پر بہتا ہے تو
اور اس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تو!

تیری ہستی تنگنائے کفر و ایماں کے لئے
میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لئے!

گو نجتی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری
کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری

لیکن اسکے ساتھ ہی اے مبتلائے کفر و دیں
دولتِ حُبِّ وطن کو چھوڑنا ممکن نہیں!

سعی کرنا چاہیئے پہلے تو گھر کے واسطے
گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے

تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں

کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں
کل جہاں تیرا۔ مگر ہندوستاں تیرا نہیں؟

مردِ حق کو قعرِ باطل سے اُبھرنا چاہیئے
کعبۂ حبِّ وطن میں سجدہ کرنا چاہیئے

سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

(م)

کاروبار

(ایک سین کا ڈرامہ)

(از حاجی محمد صادق صاحب قریشی)

افراد

جمشید جی	(باپ)	فریدون	(سالا)
عباس	(بیٹا)	وکیل	
شیریں	(بیٹی)	منظر	(خوابگاہ)
امینہ	(بیوی)		

(ڈاکٹر اور وکیل جمشید جی کے سرہانے کھڑے ہیں)

ڈاکٹر (جمشید جی سے) اے مردِ نکوکار! اپنے گھر در کو سنبھال لے، کوئی دم میں اب دنیا سے اُٹھا چاہتا ہے میں افسوس سے کہتا ہوں کہ تو چراغِ سحری ہے کہ اب بجھا اور اب بجھا!

(جمشید جی کراہتا ہے)

وکیل۔ جمشید جی! وقت نازک ہے، وصیت کی تکمیل میں زرا عجلت سے کام لیجئے، مبادا دم آئے یا نہ آئے!

جمشید جی: میں موت سے گھبراتا نہیں، لیکن یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرے بعد اس کاروبار کو کون سنبھالے گا!

وکیل (ڈاکٹر سے) مناسب ہوگا کہ سارا کنبہ بلا لیا جائے، اب نبض چھوٹ چلی ہے اور سانس بھی اُکھڑ چکا ہے

(ڈاکٹر آواز دیتا ہے، شیریں اندر آتی ہے)

شیریں: ڈاکٹر صاحب! کیا اب کوئی امید نہیں؟

ڈاکٹر: نہیں! عزیزہ اب اللہ ہی اللہ ہے، حالت غیر ہو چکی ہے، گھونگھرو بولنے لگا ہے، ناک کا بانسا پھر چکا ہے!

شیریں : (ابسور کر) ہے ہے !
وکیل : سب کو بلا لو ،

(شیریں لڑکھڑا کر در کھول دیتی ہے، عباس، فریدون، اور جمشید جی کی بیوی آمینہ اندر داخل ہوتی ہیں)

وکیل : کیا سارا کنبہ آگیا ہے یا کوئی رہ گیا ہے ؟
شیریں ، جناب ! بس سب آچکے ہیں "
(جمشید جی سنبھالا لیکر متوحش نظروں سے دیکھتا ہے، اور پھر بالیں سے سر اٹھاتا ہے ۔)
جمشید جی : کیا سب آگئے ، یہ سارا کنبہ یہاں کیوں اکٹھا ہے ؛
ڈاکٹر : ہاں صاحب سب موجود ہیں !
جمشید جی : (اڈبڈا کر ! ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر) بے وقوف کہیں کے ۔ ۔ ۔ پھر دکان کا کون نگراں ہوگا ؛
(جمشید جی بستر سے کود کر دروازہ سے دوڑتا ہے)

(پردہ)

از مہد تا لحد

(حضرت جوش ملیح آبادی)

ہے مہد سے تا لحد برابر بچپن
صرف اتنا بڑھا ہوا ہے پیری کا چلن
نام اپنے کھلونوں کے بدل لیتے ہیں
اطفال بزرگ " یعنی پیرانِ کہن ۔

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلووں کے لیے بے خور و خواب
اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قرباں
لو، ہیں یہ ہنوز بچے ہیں جناب !

شاعر کی قدر

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

رزم کی بے مثل ہندی شاعری کا باکمال
یعنی بھوشن شاعر خوش لہجہ و رنگیں مقال

گرچہ اس کے دل کو شیواجی سے تھا فطری لگاؤ
اور اُس کی شاعری بھی تھی اُسی کے وقفِ حال

ہاں مگر اِک مرتبہ اپنے وطن جاتے ہوئے
آکے وہ ٹھہرا جہاں فرمانروا تھا چھتر سال

عظمتِ شاعر کا تھا راجا جو دل سے معترف
میہمانی میں نہ تھا مطلق کمی کا احتمال

یہ تو تھا لیکن شِوا کے دیکھتے راجا کے پاس
پیشکش کے واسطے گویا نہ ساماں تھا نہ مال

کچھ دنوں کے بعد ہی مہمان کی رخصت کے وقت
آخرش پیدا ہوا جب رخصتانے کا سوال

جو بھی ممکن تھا بہر صورت کیا راجا نے نذر
تھا مگر شاعر کے چہرے سے عیاں رنگِ ملال

دل میں راجا کے خیال آیا یہ اُس دم ناگہاں
ہو نہ شاعر کو کہیں تحقیر کا اپنی خیال

تو ہٹا کر جلد ہی اِک پالکی بردار کو
پالکی راجا نے خود لی اپنے کندھے پر سنبھال!

دیکھکر شاعر وہیں اُترا زمیں پر ایک دم
آگئے آنکھوں میں اشکِ انبساط و انفعال

رو پڑا وہ دست بستہ عرض یوں کرتے ہوئے!
"آہ کس مشکل میں راجا جی رہے ہیں مجھ کو ڈال

بدگمانی کے لئے کر دیجئے مجھکو معاف
قدر شاعر کی زیادہ اس سے ہونا ہے محال

میں تو سمجھا تھا کہ قدر اپنی شِواجی پر ہے ختم
آپ نے اُس سے بھی بڑھکر آج قائم کی مثال!"

یہ کہا اور اُس جگہ سے ہو گیا خوش خوش رواں
لے کے خود اِس واقعہ سے ایک پر اُمید فال

یعنی بھوشن کی نگاہوں میں ثنا کے مستحق
اب سے تھے دو لو شِواجی اور راجا چھتر سال

میرزا واجد حسین یاس یگانہ لکھنوی

(آیات وجدانی پر ایک نظر)

از مسٹر مالک رام ایم اے۔ ایل ایل بی

بیا در ید گرایں جا بود زباندانے غریبِ شہرِ سخنہائے گفتنی دارد غالبؔ

مدتوں تک اُردو شاعری کا سرمایہ جذباتِ عشقیہ رہا۔ تاآنکہ اسمیں تنوع پیدا ہوا اور قصیدہ اور مرثیہ بھی موضوعاتِ شاعری قرار پائے۔ نظیرؔ اکبرآبادی غالباً پہلا اُردو شاعر ہے۔ جس نے اپنی شاعری کیلئے وسیع میدان چنا اور جو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہلا سکتا ہے مگر افسوس اُس پر کافی توجہ نہیں دی گئی۔ اور جس داد کا وہ مستحق ہے۔ وہ اُسے نہیں ملی۔ حالانکہ وہی ایک شاعر ہے جو ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اور جسے ہم بلاخوفِ تردید دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھار بعض شاعروں نے تصوف پر بھی خامہ فرسائی کی۔ لیکن عام طور پر اُردو شعرا عشق و محبت کے مضامین ہی لکھتے رہے۔ یہ شرف غالبؔ کیلئے تھا۔ کہ اُنھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔ اور حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کو بھی موضوعِ فکر بنایا اور اسمیں شک نہیں کہ وہ اس میں حیرت انگیز حد تک کامیاب ہوئے۔ نقشِ اول ہی اتنا کامیاب رہا کہ تعجب ہوتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ جس کی وہ تقلید کر سکتے۔ بے شک اول اول اُنھوں نے بیدلؔ وغیرہ کے رنگ کا تتبع کیا۔ لیکن کچھ لوگوں کی تنقید و نکتہ چینی اور کچھ اُن کی طبع سلیم نے اُنھیں بتا دیا۔ کہ یہ غلط راستہ ہے۔ بہرحال غالبؔ کے بعد اُردو شاعری کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اور آج تو ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

آج کی صحبت میں جس شاعر کا ذکر کرنا مدنظر ہے۔ وہ غالبؔ کے بعد کے دَور کا فرد ہے۔ عشق و محبت کے مضامین وہ بھی لکھتا ہے۔ لیکن خال خال۔ اِس کا دِل پسند موضوع فلسفۂ حیاتِ انسانی ہے۔ آیندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ وہ اِس باب میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

(۲)

عظیم آباد نہایت قدیم زمانہ سے اُردو علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جن دِنوں دہلی میں مغلیہ سلطنت شمع سحری بنی ہوئی تھی۔ مقامی اُمرا کی سرپرستی میں عظیم آباد اُردو زبان کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ راسخؔ اور فریادؔ ہیں کے

رہنے والے تھے۔ راسخ عظیم آبادی میر کے معاصرین میں تھے۔ ان کا کلام سلاست اور، دل نشینی اور گھلاوٹ میں اپنے نامور معاصروں سے کسی طرح کم نہیں۔ متاخرین میں حضرت شاد عظیم آبادی کا نام کسی سے مخفی نہیں رہ وہ حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے۔ مگر ہماری ناقدری کا یہ عالم ہے کہ آج شاد کا کوئی مجموعۂ کلام دیکھنے کو نہیں ہے۔

میرزا واجد حسین یاس یگانہ بھی اسی عظیم آبادی خاک سے پیدا ہوئے اور جب تک عظیم آباد میں رہے۔ یاس تخلص کرتے رہے۔ مگر ۱۹۰۵ء میں طبی ضرورتوں کے ماتحت لکھنؤ کا سفر کیا۔ اور یہاں کی فضا انھیں کچھ ایسی بھا گئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آخر یہیں شادی کر لی۔ اور عظیم آبادی ثم لکھنوی ہو گئے۔ بعض ادبی معرکوں کی یادگار میں اپنا جدید تخلص یگانہ رکھا۔ چنانچہ اب وہ ملک میں میرزا یاس یگانہ یا صرف میرزا یگانہ کے کے نام سے مشہور ہیں۔

میرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم جناب حسرت عظیم آبادی اور بیتاب عظیم آبادی کی نگرانی میں ہوئی اور اس کے بعد وہ خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔ اس وقت تک اُن کے کلام کے تین مجموعے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ نشتر یاس (لکھنؤ) جس میں ۱۹۱۴ء تک کا کلام ہے۔ آیات وجدانی ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور اسمیں نشتر یاس کا انتخاب بھی شامل ہے۔ ترانہ نام سے ۱۹۳۳ء میں اُن کی رباعیوں کا مجموعہ بھی لاہور سے شائع ہوا۔

جیسا میں لکھ چکا ہوں۔ میرزا یاس کا دل پسند موضوع فلسفۂ حیات انسانی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ہمیں اپنے اردگرد جو جہانِ رنگ و بو نظر آتا ہے۔ وہ سب انسان کیلئے ہے۔ فطرت کے ارتقاء کا انتہائے مقصود ہستی انسان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہستی کا مطالعہ کسقدر مشکل اور مہتم بالشان چیز ہے۔ میرزا صاحب نے انسان اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کر کے اپنے نتائج فکر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔

(۳)

ہستیٔ باری تعالیٰ کا ایک زبردست ثبوت انسانی عزم کی ناکامیابی میں مضمر ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ انسان حصولِ مقصد کے لئے تمام دنیوی سامان مہیا کرتا ہے اور ایک شاطر کی طرح تمام مرحلوں کو سوچ بچار کر راہ کی تمام رکاوٹوں کے تدارک کا انتظام کر کے اپنی جگہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب ضرور فتح و ظفر میرے قدم چومے گی لیکن عین اُسوقت جب اُسے عروسِ مدعا کا رُخ نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ اس اُمید میں سرشار ہوتا ہے کہ اب کوئی دم میں پالا مار لیا۔ کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ پیش آتا ہے کہ سارا کھیل تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی عزائم و انتظامات کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی ہے۔ جو اس سے زیادہ قادر و توانا ہے۔ جو اس کے ارادوں کو محو بھر میں درہم برہم کر سکتی ہے۔ اور جس کی مدد کے بغیر انسان کسی ارادہ کو فعل میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ عرفت ربی

بفسخ العزائم" میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ دیکھئے یگانہ نے بھی اسی حقیقت کو کس قابلیت سے اور کیسی شگفتہ زبان میں بیان کیا ہے ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

انسان کا فرض ہے کہ اپنے خالق سے تعلق پیدا کرے۔ دہریت سے زیادہ ناشکری کوئی نہیں ہو سکتی۔ آزادی بڑا دلکش لفظ ہے لیکن وہ کشتی جس کو ساحل سے لگانے کیلئے کوئی رسی نہیں۔ وہاں قائم رکھنے کیلئے کوئی چیز نہیں وہ طوفان کے رحم پر ہے۔ جو اسے جہاں چاہے بہالے جائے۔ لیکن اگر اسے ساحل سے لگانے کیلئے رشتہ قائم ہے۔ تو وہ دریائی سیر کے بعد بھی اپنے مامن وماوا میں پہنچ سکتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس شخص کا ہے جو کسی خاص مسلک میں منسلک نہیں۔ وہ دوسروں کے خیالات کے ریلے میں بہہ جاتا ہے۔ چونکہ اس کا ساحل کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی ساری عمر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے میں گذر جاتی ہے۔ اسی لئے کہا ہے ؎

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

شاہدِ نادیدہ را آثار نتواں یافتن دسترس بر پردۂ اسرار نتواں یافتن

اس گتھی کو سلجھانے کیلئے جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں۔ تو ذرہ ذرہ اس یوسف پنہاں تک ہماری رہبری کرنے کو موجود ہے۔ انسان کا فطری ذوق شاہد ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی پیدائش اور اس کا اصول پر جاری رہنا اس امر کا مقتضی ہے کہ پس پردہ کوئی ہستی اس نظام کی باگ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ جیسے ہم مسافر کا کھوج اس کے قدموں سے لگالیتے ہیں۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت یہ نظام عالم ہے۔

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ ہست شاہدِ عادل بوئے پیرہن تنہا

پھر یہی نہیں کہ ہم ہی وصالِ حقیقی کے مشتاق ہیں۔ بلکہ اس کا ان نشانات کو پیدا کرنا جو اس تک ہماری رہبری کرتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ خود بھی اس کا خواہش مند ہے۔ البتہ اس کیلئے ہمارے دل میں سچی طلب اور خواہش ہونا لازم ہے۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے گی وہ خود ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے اسباب مہیا کردیگا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے جذبِ صادق غائبانہ رہنما ہو جائیگا

لیکن خدا کی رہنمائی کا طریقہ ہم انسانوں کے طریقہ سے مختلف ہے۔ وہ جس زبان میں گفتگو کرتا ہے اسے سمجھنے کیلئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ نہ صرف وہ چیزیں جو ہماری آنکھوں کو حسین و دلکش نظر آتی ہیں۔ اس کی قدرت کی مظہر ہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام اشیاء خواہ وہ ہمارے معیارِ حسن کے مطابق خوبصورت ہوں یا بدصورت خالق کی صنعت کا کامل نمونہ ہیں۔ اور اگر ہمارا ادراک صحیح ہو تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کونسی چیز خوبصورت ہے اور کونسی بدصورت۔ کیونکہ جب ہم یہ خیال کریں گے کہ یہ سب اشیاء

حسنِ ازل کی مختلف صورتیں ہیں۔ تو ہمارے لئے بدصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا ؎

خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال
امتیازِ خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہوگیا

صرف پھول ہی معرفتِ الٰہی کے نکات نہیں بتاتے۔ بلکہ کانٹے بھی مطالب کی ایک دُنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ البتہ دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے والا دماغ چاہیئے۔ جب یہ چیزیں حاصل ہو جائیں۔ تو پھر ہمارے لئے کانٹوں کی زبان بھی اتنی ہی فصیح و بلیغ اور آسان ہوگی جتنی پھولوں کی ؎

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں
معنیٔ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دنیا کی تمام اشیا جمالِ خداوندی کی مظہر ہیں۔ تو کیا وجہ کہ دُنیا میں کفر اور ایمان دونوں قائم ہیں۔ کیوں تمام دُنیا ہستیٔ باری تعالیٰ کی قائل نہیں ہو جاتی؟ ظاہر ہے کہ جبتک یہ دُنیا قائم ہے۔ مختلف اشیا کے مختلف طبائع پر علیحدہ علیحدہ اثرات ہوں گے۔ ہم آئے دن دُنیا میں اسکی مثالیں دیکھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ چلو میں اُلّو ہو جائیں۔ اور ایسے بلا نوش بھی ہیں کہ خُم کے خُم چڑھا جائیں۔ اور انھیں محسوس تک نہ ہو۔ بعض کے لئے ایک قطرہ زہر کا قطعِ حیات کیلئے کافی ہے اور ایسے بندگانِ خدا بھی ہیں۔ جو سانپوں کو گاجر مولی کی طرح کھا جاتے ہیں۔ سچ ہے ؎

وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ
مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں [illegible]

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اِن اشیا کی ظاہری شکل و صورت سے گذر کر اُن کے بطون تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ چھلکے تک رہتے ہیں وہ اِس معرفت کے حصول میں لازماً ناکام رہتے ہیں جو [illegible] مغز میں پوشیدہ ہے۔ بے شک ان کا ظاہر بھی بہت دلکش اور دلفریب ہوتا ہے۔ لیکن اگر [illegible] کُنہ تک پہنچ جائے۔ تو ان کی ظاہری دلفریبی آنکھوں سے گر جائے ؎

صورت پرست کب ہوتے معنی سے آشنا
عالم فریبِ طُور کا افسانہ [illegible]

بعض لوگ اِس امر کیلئے رہبر کی تلاش میں سرگشتہ و حیران پھرتے ہیں۔ لیکن مشکل [illegible] صحیح رہبر نہیں ملتا۔ یہ نام نہاد رہبر خود لیلیٰ مطلوب کی شکل سے اُتنے ہی نا آشنا ہیں [illegible] کیا رہبری کریں گے۔ اِسی لئے پوچھتے ہیں ؎

سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر
کوئی صورت آشنا بھی [illegible]

ایسے لوگوں کی شکلیں بہت گمراہ کن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ [illegible] سے خدا [illegible] مذہب کے ظاہری احکام کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ اس [illegible] درحقیقت وہ بھی منزلِ مقصود سے اتنے ہی دُور ہوتے ہیں جتنا [illegible]

ہمارا قلب مصفا اور ضمیر حق شناس ہوتا ہے۔ ایک ریاکار "مرشد" پر ایک دلِ پاکیزہ کو ہر حالت میں ترجیح حاصل ہے ؎

نیست ازیں ہر دو کہ بکشاید درے از معرفت   زاہدِ شب زندہ دارے با دلِ بیدار را

زاہدِ ظاہر پرست کے نزدیک ایمان ان باتوں میں مضمر ہے کہ انسان صوم و صلوٰۃ کا پابند رہے راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھے کہ اس کی پیشانی پر گھٹے پڑ جائیں۔ لیکن اگر یہی ایمان ہے تو پھر ایک حیوان بھی تعلیم سے انسان بن سکتا ہے۔ تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ کتنے طوطے بھی ہم انسانوں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ دراصل ایمان اور خدا پرستی اور اتقا کا فیصلہ اعمال سے ہے۔ اس اعتقادات بھلا ہی حاصل ہو سکا نتیجہ اعمالِ نیک نہیں ہوا۔ جس طرح محض باتیں کر لینے سے حیوان انسان نہیں بن سکتا۔ بلکہ اس کیلئے انسانوں کے سے اعمال کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کوئی انسان محض ظاہری اور بے معنی رسومِ مذہب ادا کر لینے سے باخدا نہیں بن سکتا۔ بلکہ اس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور عملِ صالح بھی لازم ہیں ؎

پڑھ کے دو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے   پھر تو حیواں بھی دو روز میں انساں ہو جائے

دلِ بیدار بھی ایک عجیب نعمت ہے۔ اس سے استغنا اور بے نیازی کی کوئی حد نہیں۔ اسے کامیابی پر کوئی خوشی نہیں اور ناکامیابی پر غم نہیں۔ وہ اپنا رہبر آپ ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ؎

دلِ بے مدعا بیگانۂ امید و بیم   غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا

اگر خدا کسی کو ایسا دلِ بیدار ودیعت کر دے۔ تو پھر اس شخص کو اس کے احکام کی پابندی میں کسی طرح کی جھجک روا نہیں رکھنا چاہیئے۔ ایسے دل کا فیصلہ شاذ ہی غلط ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی سمت چلنے کو کہے تو سمجھ لو کہ منزلِ مقصود کا راستہ یہی ہے۔ پھر کسی بدرقہ کا انتظار کرنے میں اپنی راہ کھوٹی مت کرو ؎

ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزلِ مقصود   دلیلِ راہ کا کیا غم ملا ملا نہ ملا

اگر ہم ایسے دل کے ساتھ تعاون کریں۔ تو وہ سلوک کی منزلیں جلد جلد طے کر کے خدا تعالیٰ کے نزول کا مقام بن جائے گا۔ ایسے شخص کی قوتِ مدرکہ بھی غیر معمولی طور پہ تیز ہو جاتی ہے ؎

صیقل سے آئینۂ ادراک کے جوہر کھلے   خانۂ دل شاہدِ معنی کی منزل ہو گیا

شاہدِ حقیقی کے دیدار کے راستہ میں ایک کی جگہ دو دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک تو خود خداوند تعالیٰ نے اپنے گرد پردۂ عظمت کھینچ رکھا ہے۔ دوسرے ہماری نظر دنیوی اسباب کے سبب ان حجابات کے اس طرف [illegible] حاصل کرنے سے محروم رہتی ہے ؎

[illegible] ہمارا [illegible]   [illegible] آنکھ [illegible] دوسرا محمل کا ہے

لیکن دراصل وہ پردے جو خدا کی طرف سے ہیں، وہ سب عارضی ہیں۔ خدا ان پردوں کے ذریعہ خود بولتا ہے یہ پردے ساز کے پردے ہیں۔ پردۂ محمل تو خود بخود اُٹھ جائے گا۔ بشرطیکہ ہم ان پردوں کو دور کرسکیں۔ جو ہماری غفلت اور ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں حائل ہوگئے ہیں۔ جب تک ہم اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنا لیتے کہ وہ ہمیں اپنے دیدار سے مسرور کرے۔ یہ دوسرے پردے بھی قائم رہیں گے ؎

چشمِ نامحرم سے غافل، روئے لیلیٰ ہے نہاں　　ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے

ہماری غفلتوں کے پردے ہی وصالِ محبوب کے راستہ میں حائل ہیں۔ کسی جگہ ان پردوں نے تنعم و تعیش کی شکل اختیار کر رکھی ہے، اور کسی جگہ افلاس اور خود پرستی کی۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ سامانِ غفلت ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں یہ سامانِ دنیوی کی شکل میں نمایاں ہیں۔ وہاں صاحبِ سامان اسی جہاں کو سب کچھ سمجھے ہوتے عاقبت سے غافل ہے۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں ظلم کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ سے جو سراسر محبت و رافت ہے، دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں دوسری صورت ہے، وہاں یا تو کسبِ معیشت کی کشمکش اتنی سخت ہے کہ ہمیں پیٹ پالنے کے لئے سیکڑوں جتن اور دغا فریب کرنا پڑتے ہیں۔ یا ہم دوسروں کو عیش کرتے دیکھکر دہریت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدائے عادل کی موجودگی میں ایک جگہ مارے فاقوں کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوں اور دوسری جگہ حیوانوں کے آگے بارہ پکوان رکھے ہوں۔ غرض آرام و آسائش ہو یا عسرت و کلفت۔ دونوں گمراہ کرنیوالی چیزیں ہیں ؎

پردۂ غفلت وہی ہے بس نظر کا فرق ہے　　خواب رنگا رنگ یا خواب پریشاں دیکھنا

آپ نے دیکھا کہ افلاس بذاتِ خود راستہ سے بھٹکانے والی چیز نہیں بلکہ جب وہ بہتات کے مقابلہ میں آتا ہے تو انسان اپنی حالت پر نظر کرکے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ اس جہان میں فلک بوس محلات کے بنانے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم آخرت میں اپنے لئے مقام پیدا کریں۔ تو یہاں کی عارضی خوشیاں اپنی تمام دلکشی کھو دیتی ہیں۔ جب تک ہم اسی جہاں کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے انجام سے غافل ہیں، جونہی ہماری آنکھ کُھلے گی۔ یہ سب چیزیں جو اس وقت چکاچوند پیدا کر رہی ہیں۔ آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگینگی ؎

رنگ و بوئے عارضی سے دل بہلنے کا نہیں　　فکرِ فردا ہے نظر میں خار دامانِ بہار

اس جہاں میں جتنا حُسن ہے تقابل سے ہے۔ ہم ایک چیز کو کریہہ اور بدصورت کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ کسی خوبصورت اور دلکش چیز کا تصور ہمارے سامنے ہے ہم دنیا کی بہترین سے بہترین نعمت سے متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ ہمارے نزدیک اس سے زیادہ دل پسند چیز اور کوئی نہیں۔ لیکن اگر ہم اس لذت سے واقف ہو جائیں جو وصالِ الٰہی اور معرفتِ حقیقی میں ہے تو ہم اسے ان تمام دنیوی نعمتوں پر ترجیح دینے لگیں۔ اس دُنیا کی

اعلیٰ سے اعلیٰ چیز حتیٰ کہ ہمارا قلبِ مصفیٰ بھی اس کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتا ؎

آئینۂ سکندری، جامِ جم اور قلبِ صاف　　آنکھوں سے آج گر گئے روئے نگار دیکھکر

دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک چھلکا ہے دوسرا مغز۔ ایک اصل ہے دوسرا نقل۔ جن لوگوں نے اسکا نظارہ کیا ہے یہ دنیا اُن کی نظروں میں نہیں جچ سکتی ؎

حسنِ معنی کے جو شیدا ہیں اِدھر کیا دیکھیں　　صورت آباد جہاں کم نہیں ویرانے سے

اگر کوئی اس حسن کو لفظوں میں بیان کرنا چاہے۔ تو یہ ناممکن ہے۔ تلسی داس ایک جگہ رام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس زبان سے رام کے حسن کا کیا بیان ہو سکے۔ کیونکہ جن آنکھوں نے اُسے دیکھا ہے۔ اُن کے زبان نہیں کہ جو کچھ دیکھا ہے، بیان کر سکیں۔ اور زبان جو بیان کر سکتی ہے، اُس نے کچھ دیکھا نہیں۔ واقعی دنیا کی کوئی لذت اس سرور کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو انسان کو لقائے خداوندی سے حاصل ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ نہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا مشکل ہے۔ انھیں اس کا کسی طرح اعتبار نہیں آئیگا ؎

نا آشنائے حسن کو کیا اعتبارِ عشق　　اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجئے

(۴)

انسانی روح کے متعلق عقائد میں اختلاف ہے۔ ہندو مذہب اُسے ازلی اور ابدی مانتا ہے۔ اور اس کی ہستی کو اسی وقت سے تسلیم کرتا ہے۔ جب سے خدا اور مادہ ہیں۔ دوسرے مذاہب اس کے حدوث میں یقین رکھتے اور خدا کو اس کا آفرینندہ قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں بھی اس کی پیدائش کا کوئی وقت متعین نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اُسے ازلی قرار نہ دیا جائے۔ تو بھی اس کی قدرت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

روح کا مختلف قالبوں میں پیدا ہونا بھی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ ہندو لوگ آواگون کے قائل ہیں ہی بعض اکابرِ اسلام بھی اسی عقیدہ کے مؤید نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا رُوم علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر ہے ؎

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام　　ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ روح بارہا عالمِ وجود میں آچکی ہے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے مقصدِ حیات کو نہیں پہنچی۔ میرزا یگانہ بھی اسی اصول کے قائل نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر　　ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

روح اپنی فطرت میں آزاد ہے اور جتنی یہ اپنی اصل میں لطیف ہے۔ اتنا ہی یہ جہان مادی اور کثیف ہے۔ لیکن خدا کی شان کہ یہی روح اس جہان کی ظاہری دلکشی سے دھوکا کھا جاتی ہے اور اس پر کچھ اس طرح سو جاتی ہے کہ اپنے مبداء اور مقصد کو بھی بھول جاتی ہے ؎

وحشت آبادِ جہاں کی دل فریبی دیکھئے　　سیکڑوں آزاد پابند سلاسل ہوگیا

روح کی پیدائش کا مقصد تزکیہ کے ذریعہ حُسنِ حقیقی کی طرف صعود اور بالآخر اس سے اتصال ہے۔ جب یہ اس جہان کی آلائشوں میں پھنس کر گمراہ ہوجاتی ہے۔ تو وہ مقصد گویا اس کے سقوط پر حیران ہوتا اور تمسخر اُڑاتا ہے کہ یہ کس کام کیلئے پیدا ہوئی تھی اور کس طرح راہ سے بھٹک گئی ہے ؎

ہنستا ہے عشق مجھ کو گرا نبار دیکھکر　　زندانِ آب و گل میں گرفتار دیکھکر

اگر وہ دنیوی امور میں بھی کامیاب ہوجاتی تو بھی ایک بات تھی۔ لیکن یہاں بھی وہ راہ بھولے ہوئے مسافر کی طرح بھٹکتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہوتے ؎

عجیب بُھول بھلیاں ہے منزلِ ہستی　　بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا

لیکن جب بھی یہ کسی نئی آلائش میں ملوث ہونے لگتی ہے، تو ضمیر اُسے چوکنا کرتا اور اسے اس کی گمراہی کا احساس کراتا ہے ؎

دلِ بیدار نے گھبرا کے مجھے چونکایا　　نفس نے جب کسی مشکل میں پھنسانا چاہا

اصل مشکل اس نفس کو زیر کرنا ہے۔ جب تک یہ ضمیر کے ماتحت نہیں ہوتا۔ روح کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ لیکن نفس کے خلاف جنگ کرنے میں انسان کو کئی طرح کی جسمانی آسائشوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی خواہش سے محنت اور عسرت کی زندگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال ایسا انسان اگر اس جہان میں کوئی ہے، ہر طرح سے داد کا مستحق ہے۔ اس کا مقصد بھی قابلِ تعریف ہے اور اس کی کوشش بھی قابلِ تعریف ؎

زہے مقصد جہادِ نفس کو تیار ہوجانا　　خوشا ہمت خود اپنے دَرپئے آزار ہوجانا

جو شخص دُنیا کے سحر سے آزاد ہوجائے اور اپنی روح کو جسمانی لذتوں سے مستغنی کرنے میں کامیاب ہوجائے اُس نے گویا دوبارہ زندگی پائی۔ کیونکہ مقصدِ حیات تو روح کو منازلِ ترقی پر لے جانا ہے۔ اگر یہ مقصد ہی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ تو اس انسان کا عدم اور وجود برابر ہے ؎

نگاہِ یاس میں گویا دوبارہ زندگی پائی　　جو چونکا خوابِ غفلت کے مزے سے آشنا ہوکر

اس بیداری کی حالت میں روح اُن اوقات کے ضائع ہونے پر سخت پشیمان ہوتی ہے جو اُس نے شیطان کی ماتحتی میں گذارے تھے۔ شیطان کی تقلید کا اس کے سوا اور نتیجہ بھی کیا ہوسکتا تھا۔ کیونکر اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ روح کو معرفت کے کام میں مدد دے۔

نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا　　اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیماں ہونا

وہی روح جو اب تک عیش و عشرت ہی کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے تھی۔ اب چونکتی ہے۔ تو

ہوتا ہے کہ میں جسے بیداری سمجھ بیٹھی تھی وہ خوابِ غفلت سے بھی سوا تھی۔ اب وہ عمرِ رفتہ پہ ہاتھ ملنے لگتی ہے۔ کہ میں نے کیوں قیمتی وقت ضائع کیا ؎

عمرِ بیداریِ موہوم کے دھوکے میں کٹی   اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلا کرتے ہیں

جب تک اِنسان حیاتِ دنیوی ہی کو معراجِ زیست خیال کرتا ہے۔ وہ موت کے نام سے کانپ اٹھتا ہے لیکن جونہی اُسے اِس امر کا احساس ہوتا ہے کہ روح لافانی ہے اور جب تک یہ اِس جسدِ عنصری میں قید ہے، ترقی نہیں کر سکتی تو وہ زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اُسے ہر وقت ملاءِ اعلیٰ میں پرواز کی خواہش اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن کئے رکھتی ہے۔ اب وہ اِس انتظار میں رہتا ہے کہ کب مجھے اس قیدِ جسم سے چھٹکارا ملے کہ میں اپنے خالق کے وصال سے مستفیض ہوں ؎

تصور سے کبھی خوابِ اجل کے کانپ کانپ اُٹھنا   کبھی تعبیر سُن کر جان سے بیزار ہو جانا

ہوسِ عالمِ بالا نے کیا ہے دِل تنگ   روح گھبرا گئی اب جسم کے کاغذنے سے

اب وہی موت جو دوسروں کے لئے رنج و غم کا مقام ہے۔ ایسے شخص کیلئے مقامِ شکر بن جاتی ہے ؎

موت آئی، آنے دیجئے، پروا نہ کیجئے   منزل ہے ختم، سجدۂ شکرانہ کیجئے

روح اپنی خصوصیات میں اَمر اور لافانی ہے۔ اُسے بھلا جسمانی موت سے کیا ڈر۔ موت تو اُسے اِس دنیا کی مادّی آلائشوں سے پاک کرکے اپنے اصل کے قریب لے جانیوالی چیز ہے۔ وہ اس سے کیوں گھبرائے۔ گویا وہی موت جو ایک دُنیا کے کیڑے کیلئے فنا کا پیغام ہے۔ بیدار روح کے لئے حفاظت کی ضامن ہے۔ وہ اِس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کیونکہ اِس دُنیا میں اس کی صلاحیتوں کو میدانِ ترقی نہیں ملتا اور اب اُسے عالمِ بالا میں پرواز کا موقع ملے گا ؎

اجل[1] سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا   خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا

اب اپنی روح ہے اور سیرِ عالمِ بالا   کوئیں سے یوسفِ گم گشتہ کارواں نکلا

جہنم اور جنت تو ہماری اصطلاحیں ہیں۔ روح کے لئے یہ مقامات بےمعنی ہیں۔ وہ خود لامکاں ہے، اور اِس جسم کی قید سے آزاد ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیوں کی طاقت رکھتی ہے ؎

جہنم ہو کہ جنت، طائرِ جاں تھم نہیں سکتا   کہیں پرواز کی حد مل سکے گی لامکاں ہوکر

اس کی ہستی کی معراج یہ ہے کہ وہ پھر مبداء حقیقی سے مل جائے اور مسافر جو بہت دِن باہر بھٹکتا رہا ہے۔ آخر اپنے مستقر میں پہنچ جائے۔ وہ اس کا ایک کٹا ہوا حصّہ تھی اور وہیں آ پہنچ گئی۔ وہی روح جو جسم کی

---

[1] "اجلک حافظک" (قول حضرت علیؓ)

قید میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اس نئی غلامی میں انتہائی مسرت محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ اور سب کچھ برداشت کرلے گی لیکن پھر ایک بار اس سے مفارقت اسے سخت شاق گذرتی ہے۔ دیکھئے یہ مفہوم کس والہانہ انداز سے ادا ہوا ہے ؎

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر　　مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

نہ صرف روح ہی قدیم ہے۔ بلکہ مادہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنی روح، اور نہیں معلوم کہ اسکا کیا انجام ہوگا

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا　　چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

دُنیا بھی عجیب کارخانہ ہے۔ روح تو لافانی ہے۔ لیکن ہم جسے جسمانی موت سمجھتے ہیں، وہ بھی ایسی نہیں اگر ایک جگہ موت آ رہی ہے۔ تو دوسری جگہ آثارِ حیات پیدا ہو رہے ہیں۔ آج تک سیکڑوں ہزاروں شہر بسے اور اُجڑے، اور پھر انھیں کے کھنڈرات پر نئے شہر آباد ہوئے۔ بعض اوقات بستیوں کی بستیاں دریا بُرد ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی وسیع قطعاتِ زمین پانی سے باہر آ جاتے ہیں۔ غرض بسنا اور اُجڑنا توام ہے ؎

کارگاہِ دُنیا کی نیستی بھی ہستی ہے　　اک طرف اُجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے

آج جو مادّہ ہمیں انسانی جسم کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ کل وہی جسم اور روح کی مفارقت کے بعد راکھ اور مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر گردباد کی شکل اختیار کرلے گا ؎

خاک کا پُتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا　　مٹ کے بھی ایک پیکرِ نشو و نما ہو جائیگا

(۵)

خداوند تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ انسان اُسکا بندہ ہے۔ بندہ کا فرض بندگی کرنا ہے۔ اگر یہ بندگی اور خدمت مالک کے معیار پر پوری اتری، تو وہ چاہیگا تو حسنِ خدمت میں اظہارِ خوشنودی کرے گا۔ لیکن ہم اس معیار کے متعین کرنیوالے کون؟ یہ تو اسی کے اختیار کی بات ہے۔ بندہ کے دم مارنے کی مجال نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ پر اللہ تعالیٰ کی رضا بطورِ حق حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اس لئے انسان کو اعمال کے ساتھ دُعا پر بھی زور دینا چاہئے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی کوشش کرکے اللہ کریم کے آگے گر جائے۔ کہ اے غفور الرحیم! میں نے اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق حقِ بندگی ادا کرنے کی کوشش کی، اُسے شرفِ قبول بخشنا تیرے اختیار میں ہے۔ میرا حق نہیں کہ میں مانگوں کیونکہ یہ صلاحیتیں بھی تیری ہی عطا کردہ تھیں۔ لیکن تیرے غیر محدود فضل و کرم سے مجھے ایسی اُمید ہے۔ یہی فلسفہ بانیٔ اسلام نے ع "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند" میں بیان فرمایا ہے۔ یگانہ لکھتے ہیں ؎

سعادتِ ابدی ہے مشیّتِ ازلی　　ہوس فضول بھروسے پہ حُسنِ خدمت کے

اس کے لئے سب سے پہلے گذشتہ گناہوں سے توبہ لازم ہے۔ توبہ کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنے اعمال سئیہ پر اظہارِ ندامت کرے اور آیندہ اُن کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ یہ نہیں کہ آج توبہ کرلی اور کل پھر وہی فعل سرزد ہوا، اور پرسوں پھر توبہ کرلی۔ یہ توبہ خدا سے گستاخی ہے۔ توبہ یہ ہے کہ احساسِ گناہ کے بعد اس پر اظہار افسوس کیا جائے اور آیندہ اس فعل کا اعادہ نہ ہو۔ ایسا ہو تو کیا کہنا ؎

شکستِ نشۂ وکیفِ ندامت واہ کیا کہنا　　　بجائے سے ٹپکتا ہے زلالِ خشک دامن پر

توبہ واقعی سچے دل سے ہونی چاہئیے۔ محض خشک توبہ سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر دل پر خشیت طاری ہوجائے تو انسان کے روئیں روئیں سے ظاہر ہونے لگتا ہے کہ یہ شخص واقعی پشیمان و نادم ہے۔ اور اس کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے ؎

پسینہ تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا　　　ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر

انسان کو چاہئیے کہ گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگے اور آیندہ کیلئے توبہ کرے ؎

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے　　　آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

سچی توبہ کا انسان کی ظاہری زندگی پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔ وہی انسان جو اپنی طاقت کے نشہ میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور سب اس کے دستِ ظلم سے نالاں تھے، اب انکسار و تذلل کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اسکا ہاتھ جب اُٹھتا ہے تو کسی کو کچھ دینے کیلئے یا خدا سے کچھ مانگنے کیلئے ؎

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس　　　گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دُعا ہو جائیگا

(۶)

دُنیا کی بے ثباتی کا مضمون شعرائے متقدمین و متاخرین کا پامال موضوع ہے۔ مرزا یگانہ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔

دُنیا بظاہر ایسی خوبصورت ہے، جیسے وہ باغ جو بہار میں اپنی رنگینی، اور دلکشی سے جنتِ نگاہ ہوتا ہے۔ لیکن بہار کے ساتھ ہی خزاں کے ڈانڈے بھی ایسے ملے ہوتے ہیں کہ یہ امتیاز مشکل ہے کہ ایک کی حد کہاں ختم ہوئی اور دوسری کی کب شروع ہوئی۔ یہ دُنیا جو آج اپنی آسائشوں کی وجہ سے بہار کیطرح خوبصورت اور مہربان نظر آتی ہے، کل اپنی کلفتوں کی وجہ سے خزاں کی طرح کریہہ اور نامہرباں بن جانیوالی ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار کرکے اگر انسان چندروزہ دولت پر نازاں ہو اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس سے زیادہ دھوکا اُسے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جسوقت انسان نشۂ حُسن و دولت سے مست ہوتا ہے۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ وہ اس گھڑی کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ جب یہ نشہ خمار میں تبدیل

ہو جانیوالا ہے۔لیکن چشم دوربیں سے یہ مخفی نہیں ہوتا۔کہ اس شب عیش کے بعد جو صبح خمار طلوع ہونیوالی ہے، وہ کسقدر فتنہ سامان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ایک بار تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ ایسا کرنے کا خیال بھی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک زندگی کے رنج وغم یا عیش و مسرت ایسی چیزیں ہیں۔ جنکی کوئی حقیقت نہیں۔ آخر دُنیا کیا ہے ؟ آب و گل کا ایک کارخانہ لیکن اتنا حسین اور دلفریب کہ حیرانی ہوتی ہے کہ اتنی بے حقیقت چیز کے نتائج کتنے شاندار اور عالمگیر ہیں۔ جو لوگ اس کی اصل پہچانتے ہیں۔ وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ سطح سے گذر کر تہ کی خبر رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اس کے دھوکے میں نہیں آتے۔ انھیں دُنیا کی بے ثباتی سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں کہیں محفلِ نشاط گرم ہوتی ہے۔ وہ اس کے خمیازہ شکن انجام کا اندازہ کر کے افسردہ دل ہو جاتے ہیں۔ غرض ان کی روشن طبعی ان کے لئے مستقل آزار کا سامان بن جاتی ہے۔ لیکن وہ واقعات کی رفتار پر قابو نہیں رکھتے کہ انھیں حسب خواہش تبدیل کرسکیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی تزرف نگاہی سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ ذہنی اور روحانی کوفت سے بچنے کیلئے دُنیا ہی سے کنارہ کشی میں عافیت دیکھتے ہیں۔ تعجب تو اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو اس دُنیا کا اعتبار کرلیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت ایک بگولہ سے زیادہ نہیں۔ اُن کی آنکھیں کھولنے کے لئے خود دُنیا میں کافی سامان موجود ہے۔ یہاں کسی چیز کو دوام نہیں۔ جتنی زیادہ کوئی چیز دلکش اور نازک ہے اتنی ہی زیادہ وہ کمزور اور ناپائیدار ہے۔

دیکھئے ان حقائق کو شاعر نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

ہوشیار اے چشم نرگس، اے نگہبانِ بہار	ہے زوالِ رنگ وبو دست وگریبانِ بہار
یاس اس چرخِ زمانہ ساز کا کیا اعتبار	مہرباں ہے آج، کل نامہرباں ہو جائیگا
تیور بجھے ہیں صبح کے آثار دیکھکر	آنکھیں کھلی ہیں فتنۂ بیدار دیکھکر
آگ برسائے فلک، یا آبِ حیوانِ بہار	زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمانِ بہار
کس کل پہ ہے بنائے طلسمات آب وگل	اہلِ نظر ہیں نقش بہ دیوار دیکھکر
عبرت سرائے دہر سے منہ موڑنا پڑا	آنکھوں کو اپنے در پئے آزار دیکھکر
لیلیٰ کجا۔ کجا یہ طلسماتِ عنصری	کیا ڈھونڈتا ہے پردۂ گرد وغبار میں
آنکھیں دکھاتے ہیں حباب چشم ہوس کو باربار	محوِ طلسم بندیٔ نقش ونگار دیکھکر
دکھایا گوہر سکندر نے بڑھ کے آئینہ	جو سر اُٹھاکے کوئی زیرِ آسماں نکلا

―――(۷)―――

انسان کے مختار و مجبور ہونے کا مسئلہ بہت پُرانا ہے۔ دونوں فریق اپنی تائید میں وزنی دلائل پیش

کرتے ہیں۔ لیکن دُنیا کے دوسرے متنازعہ فیہ مسائل کی طرح اس کا بھی آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ میرزا صاحب کا رجحانِ طبع جبریہ عقاید کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جسے آپ اختیار کہتے ہیں۔ وہ اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کہ انسان عزم وارادہ میں مختارِ کل ہے۔ اس پہلو سے اُس کی آزادی غیر محدود ہے چاہے تو غیر ممکن اور محال امور کی تکمیل کا ارادہ کرلے۔ لیکن اگر اسی پر انسان کا مختار ہونا منحصر ہے تو اس دعویٰ کی صداقت میں کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن کیا یہ ثبوت کافی ہے۔ طنزیہ انداز دیکھئے ؎

اللہ رے اختیار کہ آمادہ کرلیا ۔۔۔ فکرِ محال پہ دلِ بے اختیار کو

چونکہ ارادہ کا تعلق انسان کے دل ودماغ سے ہے۔ اور یہ چیزیں اس کے اختیار میں ہیں اسلئے وہ مختار ہے کہ بے شک ہوائی قلعے تعمیر کرتا رہے۔ اس کے عجز ومجبوری کا پردہ تو اُس وقت کھلتا ہے۔ جب وہ کسی ارادہ کو فعل میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ اس وقت اسکی تکمیل میں کئی خارجی اسباب سنگِ راہ ہوجاتے ہیں۔ اس لئے اسے اپنے ارادوں کی ناکامی پر سخت کلفت اور حسرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ سینہ سے اس دل کو چیر پھینکا جائے۔ جس نے ہمیں ایک ایسی اُمید موہوم لگاکر مشغلہ روزگار بنایا ؎

ارادہ سے عمل تک کچھ تو اپنا دسترس ہوتا ۔۔۔ بغل میں پالتے کیوں پاس دل سے دشمنِ جاں کو

اِنسان کی مجبوری کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُسے اپنے آپ پر بھی پورا اختیار نہیں۔ باہر کی دُنیا تو خیر بڑی مخالف طاقتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر بعض حالات میں انسان یہاں ناکام رہ جاتا ہے تو اس کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے، لیکن اپنے جسم وجان کے معاملہ میں مجبور اور کسی غیبی طاقت کے رحم پر ہونا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دیکھئے کس دردناک لہجہ میں کہا ہے ؎

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر ۔۔۔ اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

اِنسان کے اصلی ماحول اور دوسرے ساز وسامان بھی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں کو وہ اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کیلئے خود پیدا کرتا ہے۔ لیکن آخر میں انہی کا غلام ہوکر رہ جاتا ہے۔ خارجی مجبوریوں کے ساتھ ان داخلی اور خود پیدا کردہ مجبوریوں کی موجودگی میں بھی اگر کسی شخص کے خیال میں انسان اپنے فعل کا مختار ہے، تو اُسے یہ آزادی مبارک ہو، جو ایک جال سے کم نہیں۔ ہم تو اس سے باز آئے۔ لیکن خود کردہ را علاجے نیست ؎

مبارک نامِ آزادی۔ سلامت دامِ آزادی ۔۔۔ دُعائیں دوں کسے یارب اسیرِ بال وپر ہوکر

اِس مسئلہ میں تنازع اِس لئے پیدا ہوا۔ کہ اِنسان کی طبیعت میں مادۂ ندامت ہے، خواہ کسی وجہ سے اُسے ناکامی ہو۔ وہ ہر کیلئے اِنسان کو ذمہ دار گردانتا ہے۔ حالانکہ جب حالات پر اُسے قابو نہیں تو ان حالات سے

اشدہ نتائج کیلئے بھی وہ ذمہ وار نہیں، پھر ندامت کیسی؟ لیکن ضمیر اس پر بھی کوستے جاتا ہے۔ بہر حال جب انسان مجبوری سے جرم سرزد ہوا تو اس پر پشیمانی اور شرمندگی کی کیا ضرورت ہے؟

بندۂ فطرتِ مجبور ہوں مختار نہیں		ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں

لیکن ستم یہ ہے کہ یہ قید او پابندی بھی مکمل نہیں۔ بعض حدود کے اندر انسان آزاد بھی ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں ایک لمبی زنجیر ہے۔ جہاں تک زنجیر کی حد ہے۔ وہاں تک وہ بے روک ٹوک چل پھر سکتا ہے۔ اگرچہ اس دوران میں اُسے زنجیر کی موجودگی کا برابر احساس رہیگا۔ انسان کی زندگی کی اس سے صحیح ترتفسیر مشکل سے نظر آئے گی ؎

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں		ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

درحقیقت انسان نہایت درجہ عاجز و مجبور ہے۔ بقول غالب ؎

رَو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے		نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اسی طرح یگانہ کے نزدیک ؎

عمر گھٹنے کیلئے ہے۔ وقت کٹنے کے لئے		مُفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

—— (۸) ——

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا۔ گویا آیات وجدانی الہیات و مذہبیات کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اس مختصر مجموعہ میں نفسیات و جذبات انسانی کے بھی ایسے مکمل مرقعے ہیں۔ جن پر بے اختیار احسنت و مرحبا کہنا پڑتا ہے۔

انسانی زندگی کا سہارا اُمید ہے۔ اگر آج ہمیں یقین ہو جائے کہ ہمارا مستقبل تاریک ہے اور ہم اسے کسی طرح روشن نہیں بنا سکتے۔ یا تو خودکشی کرلیں یا زندہ درگور ہو جائیں مگر امید کی بدولت دماغ طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتا رہتا ہے۔ یہ زمین و آسماں اس کے طلسم خیال کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے ؎

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا		عجیب شے یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے

حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

صد جہاں می روید از کشتِ خیال ما چو گل		یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

واقعی شاید ہی کسی خوش قسمت انسان کی کوئی اُمید برآئی ہوگی، ورنہ دُنیا کا خمیر انسانی آرزوؤں کے خون سے تیار کیا گیا ہے۔ پھر بھی ہم ہمیشہ ہی امید رکھتے ہیں کہ آج سے کل زیادہ موافقِ حال ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اسے بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ہمارا مستقبل ہمارے سامنے کھول کر رکھ دے۔ کیونکہ ہمیں

رہوتاہے کہ مبادا یہ ہمارے حسب دل خواہ نہ ہو۔ شاعر نے اِس جذبہ کو کیسے انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے اُمید ہے کہ میری قسمت بہت اچھی ہے۔ اگر اسمیں کوئی بات ناخوشگوار ہے تو وہ اصل میں نہیں بلکہ میری آنکھوں کا قصور ہے۔ اُمید کی اِس سے روشن مثال شاذ ہی کہیں ملے گی۔ ذرا وثوق ملاحظہ ہو ؎

شاید خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں　　اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اِس کی تہ میں بھی وہی جذبۂ امید کام کر رہا ہے۔ یگانہ نے اسی مضمون کو ترقی دے کر یوں ادا کیا ہے ؎

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے　　قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

آشیاں آنکھوں کے سامنے جل رہا ہے۔ لیکن دل اِس حقیقت ناخوشگوار کو ماننے پر تیار نہیں اسلئے بدنصیب زندانی اُسے خواب سمجھ رہا ہے۔ کسقدر حسرتناک اور دردناک نظارہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر غالب کا شعر نہ ہوتا تو غالباً یگانہ بھی یہ شعر نہ لکھ سکتے، لیکن یگانہ کا شعر بلحاظ زبان اور طرز بیان اپنے پیشرو سے بڑھ گیا ہے۔ بہرحال فضیلت پہلے ہی شعر کو ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور شعر بھی سن لیجئے، غالباً مولانا تاجور کا ہے ؎

یہ کیسا خواب دیکھا ہے قفس میں　　الٰہی خیر میرے آشیاں کی

سچ یہ ہے کہ ہمیں دُنیا سے جو دلچسپی ہے۔ وہ اسی وجہ سے قائم ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ یہ حالت بجائے خود کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ لیکن اِس انتظار میں بھی وہ سرور ہے کہ ہم اس پر اصل واقعہ کی سچ لذتیں قربان کرنے کو تیار ہیں ؎

قسم ہے وعدۂ صبر آزمائے جاناں کی　　کہ لذت ابدی ہے تو انتظار میں ہے

زمانہ کی بے ثباتی کی سب شکایت کرتے ہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جو کل محلوں میں رہتے تھے آج نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ یگانہ کا یہ شعر ضرب المثل ہوگیا ہے ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں　　یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

وہ عیش و عشرت کی باتیں کہانیاں بن جاتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سُکھ کے دن کبھی دیکھے ہی نہ تھے ؎

کل کی ہے بات جوش پہ تھا عالم شباب　　یادش بخیر آج اک افسانہ ہوگیا

خدا نہ کرے ایسے برگشتہ بختوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آجائے جو انھیں ان ایام رفتہ کی یاد دلائے۔ بعض اوقات لوگ انھیں خوش کرنے کو ایسی چیزیں مہیا کردیتے ہیں لیکن یہ اُن کے زخموں پر اور نمک چھڑکتی ہیں، اور

خوشی کے بجائے کوفت کا موجب بن جاتی ہیں ؎

پھینکئے سر قفس پہ ہم پھولوں کے ہار دیکھ کر
سیر بہار آخری پھر کہیں یاد آ نہ جائے

موتا تی بُری بلا ہے۔ اگر ہاتھ پھیلانے سے ہمیں مرغن پلاؤ ملے۔ تو اس سے آزادی کی نانِ جویں کہیں زیادہ ملذّذ
آزادانہ زیست کیسی ہی صعوبتوں سے پُر اور آرام سے خالی کیوں نہ ہو۔ اِس زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جسمیں
ظاہری آسائشوں کے سامان کے باوجود ہزار پابندیاں ہیں۔ دیکھئے شاعر کس شوق اور حسرت سے اِس
خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر اسی اُجڑے دیار کو
یاد آئی آشیانہ پرخار کی خلش

اگر اِنسان کو کوئی چیز اس مقدار میں میسر آجائے کہ وہ سیر ہو جائے۔ تو اُسے اور کی خواہش نہیں رہتی۔
تنک بختی سے ہوس اور بڑھتی ہے۔ کیونکہ اس سے اِس کی خواہش کی تکمیل تو ہوتی نہیں مگر منہ کو خون لگ
جاتا ہے۔ جو ہر وقت اس کے سمندِ شوق کے لئے تازیانہ کا کام دیتا رہتا ہے۔

ملتا بھی ہے اک جام تو بھر کر نہیں ملتا
کچھ دل کی لگی اور بھڑک جاتی ہے

اور جب اِنسان کی اسی کیفیت میں بسر ہو کہ کبھی سیر ہو کر دلی خواہش پوری نہ ہوئی ہو۔ تو پھر اس کیلئے
تھوڑی سے تھوڑی مقدار بھی "منّ و سلویٰ" سے کم نہیں ہوتی۔ دیکھئے اِس فلسفۂ حسرت کو کیسی سادگی سے
بیان کر دیا ہے ؎

کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا
پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا مُنہ سے

لیکن اِنسان کی زندگی خواہ کتنی عسیر الحالی میں بسر ہوئی ہو۔ دُنیا بھر اس کے خلاف اور سارا زمانہ
دشمن ہو۔ پھر بھی اس کارخانۂ قدرت میں کچھ ایسے دِل بستگی کے سامان ہیں۔ کہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا
آپ سڑک کے کنارے ایک لُولے لنگڑے فقیر کو بیٹھے دیکھتے ہیں۔ اُسے آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اور ہر
آیند و روند کے آگے ہاتھ پھیلائے پڑا ہے۔ ان میں پیسہ دینے والے کم اور جھڑکی دینے والے زیادہ ہوتے ہیں۔
ہماری نظر میں اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن اس سے پوچھئے، وہ مرنے کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھیگا۔
مریض بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ معالجوں نے زندگی سے نا اُمیدی ظاہر کر دی ہے، وہ اور اس کے لواحقین سب
مصیبت میں مبتلا ہیں کھانے پینے کی کوئی چیز حلق سے نہیں اُترتی۔ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل نہیں۔ لیکن
اُس سے پوچھئے کہ تم مرنا چاہتے ہو؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا ؎

واللہ کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں
دُنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں

لیکن کیا آپ اِس شخص کی بدنصیبی اور حسرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی منزلِ مقصود اس کے سامنے ہو اور تھوڑی سی کوشش سے وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ تھوڑی سی کوشش کرنیکا سامان بھی مہیا نہ ہو ؎

کیا کہیں اُڑ کے جا نہیں سکتے یہ چمن ہے۔ یہ آشیانہ ہے

اگر دل میں ولولہ و جوش ہو۔ تو دنیا کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس وقت تک اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ لیکن اگر دل ہی سرد ہو جائے۔ تو پھر نہ اُمید رہتی ہے نہ شوق۔ جب انسان اس مرحلہ پر پہنچ جائے۔ تو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک ایسا بُت ہے جس میں روح نہیں ؎

ذوق جبتک ہے جبھی تک ہے بہار رنگ و بو دل ہے جبتک دل جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں

اُمید و بیم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا چراغ گُل ہوا جب آستانۂ دل کا

ایسے لوگوں کے لئے بہار اور خزاں۔ یسرت اور عسرت بےمعنی الفاظ ہیں ؎

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا کُنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

جس طرح کوئی دوا ایک مدت تک استعمال کی جائے تو وہ دوا نہیں رہتی بلکہ خوراک بن جاتی ہے اسی طرح ایک دائمی مصیبت بھی مصیبت نہیں رہتی ع "مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی رنج پہنچانا چاہے۔ تو وہ کہاں کامیاب ہو سکتا ہے ؎

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

اگر اسے کسی وقت کہا جائے کہ اب تیرے دن پھرنے والے ہیں۔ تو اُسے اعتبار نہیں ہوتا۔ مایوسی اور نااُمیدی اس کی حیات کا جزو لازمی بن جاتے ہیں۔ اُسے یقین ہی نہیں آسکتا۔ کہ میرے لئے بھی اس عجوزۂ روزگار کے پاس کوئی پہلوئے مسرت ہے ؎

آنکھ اُٹھا کر نہ کسی سمت قفس میں دیکھا موسمِ گُل کی خبر سُنتے رہے کانوں سے

وہ زندگی کے ہاتھوں تنگ آجاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح روح کو اس جسم کے کاشانے سے آزادی ملے ؎

آگ برسائے فلک یا آبِ حیوانِ بہار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمانِ بہار

اگرچہ انھیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی چین نہیں۔ غالبؔ کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن کا شعر ہے ؎

چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

یعنی ان دونوں کو اُمید بلکہ یقین ہے کہ اِس حیاتِ چند روزہ کے بعد غم کا نام و نشان نہیں رہے گا۔
لیکن ذوق کو اسمیں شک ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسے یہ خوف مارے جارہا ہے کہ اب تو اس اُمید پر جی رہے ہیں کہ موت کے ساتھ ان مصیبتوں کا خاتمہ ہے
لیکن اگر خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہوا تو پھر ہم تو کہیں کے نہ رہتے۔ لیکن یگانہ کو یقین ہے کہ یہ "بندِ غم" اس
"قیدِ حیات" سے ہی وابستہ نہیں۔ کہ موت کے ساتھ ٹوٹ جائے گا۔ اسے "مرکے بھی" چین پانے کی کوئی اُمید نہیں
اس کے نزدیک موت سے پہلے کی زندگی اور اُس سے بعد کا زمانہ ایک ورق کے دو صفحے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے
کہ ایک صفحہ پر ایک مضمون ہو اور دوسرے پر اور۔ یہ موت تو ورق اُلٹنے کے مترادف ہے۔ یاس کی انتہا ہے ؎

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا؟ رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا

مضمون کافی لمبا ہوگیا ہے۔ حالانکہ کئی ایک موضوع ایسے ہیں۔ جن کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یگانہ نے
فلسفۂ خودی پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اُنھوں نے جزئیات تک کو بیان کیا ہے۔ ان کے کلام کا ایک
بڑا حصہ دعوت و درسِ عمل پر بھی مشتمل ہے۔ جس کی ایک محکوم مُلک کیلئے اشد ضرورت ہے۔ اسمیں اُنھوں نے
ابنائے وطن کو نتائج سے لاپروا ہوکر منجدھار میں کود پڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ یگانہ کی زبان اور طرزِ ادا کا
تذکرہ خود ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ اُنھوں نے اُردو زبان میں کئی نئے الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ
کیا ہے۔ غرض کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔ "دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار"۔ البتہ ایک موضوع ایسا ہے۔
جس پر چند لفظ لکھنے کے بعد اِس مضمون کو ختم کردینا چاہتا ہوں۔

کسی نے کہا ہے ؎

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے چندیں سُخنِ نغز کہ گفتی کہ شنودے؟

مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے اور دیکھئے کہ یگانہ نے حُسن و عشق کی مختلف کیفیات کو کس عمدگی سے
بیان کیا ہے ؎

جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصور میں کوئی حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں
چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہوگیا رنگ چہرے کا اُڑا۔ رازِ دلِ مضطر کھلا

آ جائے تیرا نام زباں پر تو کیا عجب | اب اپنے اختیار میں درد جگر نہیں
کہاں تلک دل غمناک پردہ دار رہے | زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے
پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک | حقیقت کھُل نہ جائے اضطرابِ رازداں ہوکر
تابِ نگاہ کی نہیں آنکھوں سے چشم داشت | کیا لَو لگائیں وعدۂ دیدارِ یار سے
عشق کا حسنِ طلب اک معنئ بے لفظ ہے | ٹکٹکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعت بہزاد دیکھ کر | آئینہ رکھ دے سامنے تصویر دیکھنا
پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی | دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھکر
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا | چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے
دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے | آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے
وفا پر بدگمانی کا گماں اب تک نہیں ہوتا | ہنوز اک حسنِ ظن ہے اپنے دل کو حسنِ بدظن پر
خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز | بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا
اسی نے خاک کیا تھا، اسی نے پاک کیا | خوشا نصیب جو پالے پڑے محبت کے

(۵)

بہر نوع یگانہ فطرت کی طرف سے ایک شاعر کا دل و دماغ لے کر آتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں زبان پر بھی ایسی قدرت حاصل ہے کہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضامین کو اردو میں وہ نہایت آسانی سے بیان کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم نے آج تک اپنے اس جوہر کی قدر نہیں پہچانی۔ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کی طرف سے شعر الہند شائع ہوئی ہے۔ اسمیں دورِ حاضر کے کئی معمولی شعراء کا ذکر موجود ہے۔ لیکن یاس یگانہ کا نام تک نہیں ملتا۔ حالانکہ یگانہ کے متعلق اسی دارالمصنفین کے صدر محترم مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے:۔

"یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں۔ ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری، ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے، کہ لکھنؤ کے طرزِ شاعری میں اُن کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے"۔ (معارف اپریل ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۱۳)

نگار لکھنؤ نے جنوری ۱۹۳۵ء میں "اردو شاعری" کے متعلق ایک خاص نمبر نکالا۔ جس میں لکھنؤ اور بیرونِ لکھنؤ کے بیسیوں شاعروں کے نام گنوائے گئے۔ لیکن اگر کسی کو جگہ نہ ملی، تو وہ میرزا یاس یگانہ کو۔

لیکن کیا اس سے یگانہ کا نام مٹ جائے گا۔ یادش بخیر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم و مغفور نے "آبِ حیات"

کی پہلی اشاعت میں مومن کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور غالب کا بھی کچھ یونہی سا ذکر کر کے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کیا مومن اور غالب جس تعریف کے مستحق تھے، اُس سے محروم رہ گئے ؟ ذوق کا تو آج کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے یگانہ میں لاکھ عیب ہوں گے اور ہم میں سے کون عیب سے پاک ہے۔ بے شک اُنھوں نے غالب کی نکتہ چینی میں ناروا سختی سے کام لیا ہے۔

عربی زبان کی مشہور مثل ہے۔ اُنْظُرْ اِلیٰ مَا قَالَ وَ لَا تَنْظُرْ اِلیٰ مَن قَالَ۔ کہنے والے پر مت دیکھو۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے حسن و قبح پر غور کرو۔ ہم آج میر و درد۔ آتش و انیس۔ غالب و مومن کے سوا اور کسی کو در خور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جہاں ان پچھلے اساتذہ کے کمال کے معترف ہیں، وہاں اپنے زمانہ کے باکمالوں کو بھی داد دیں۔ جس کے وہ جائز طور پر مستحق ہیں۔ غالب کو بھی یہی شکایت تھی میں نے اس مضمون کو غالب ہی کے ایک شعر سے شروع کیا تھا اور غالب کے ہی شعر پر اس کو ختم کرتا ہوں۔ جو اُنھوں نے اپنے معاصرین کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ اور جو آج یگانہ بھی اپنے معاصرین سے کہہ سکتے ہیں ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

ہمارا وطن

ہر ذرّہ ہے زمینِ وطن کا مہِ تمام — ہر ذرّہ ہے زمینِ وطن کا فلک مقام
ہر ذرّہ اس زمیں کا ہے جنّت سے ہم کلام — اللہ رے وطن کی یہ صبح اور وطن کی شام

ہر سانس اس زمیں پہ بقائے دوام ہے
اس کے بہشت ہونے میں کس کو کلام ہے

کشمیر اس زمیں پہ ہے دُنیا میں انتخاب — پنجاب اور دکن کا نہیں دہر میں جواب
بنگال اور اودھ کا ہر اک ذرّہ آفتاب — گنگ و جمن میں بہتا ہے شہد اور شیر ناب

اس کا ہمالہ میرے لئے رشکِ طور ہے
ہر سنگ اس کا غیرتِ صد کوہ نور ہے

محمد عمر بابر (ہمایوں)

دیکھ رہا ہوں

(از حضرت ظفر دہلوی بی۔اے)

گمراہ ہوں اور راہِ خضر دیکھ رہا ہوں
آغاز میں انجامِ سفر دیکھ رہا ہوں

ہیں آج ہوا میں تری آمد کے ترانے
گلشن کو بہ اندازِ دگر دیکھ رہا ہوں

پھر آج تقاضائے تسلی نہیں دل میں
ہر آہ کو میں زود اثر دیکھ رہا ہوں

منہ دھویا ہے پھر غنچۂ نورس نے دمِ صبح
پھر سلسلۂ سنبل تر دیکھ رہا ہوں

مشتاق چہکتی ہوئی شاخوں پہ ہیں طائر
پھر دیدۂ نرگس میں بصر دیکھ رہا ہوں

چکر میں ہے پھر گردشِ گردوں ز تحیر
پھر سینۂ گیتی میں حذر دیکھ رہا ہوں

پھر جشن منایا تری آمد پہ گلوں نے
پھر سجدہ کناں شمس و قمر دیکھ رہا ہوں

پھر تیرا بیاں سنتا ہوں سوسن کی زباں سے
پھر وجد کے عالم میں شجر دیکھ رہا ہوں

پھر آگئی روندے ہوئے گلزار میں رونق
پھر آج چمکتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں

پھر نقدِ زر و لعل بدامن ہے گلِ سرخ
پھر سبزہ کے ہلتے ہوئے پر دیکھ رہا ہوں

پھر آج طرب خیز زمانہ ہے مرے ساتھ
تو مجھ سے ہے پھر شیر و شکر دیکھ رہا ہوں

پھر ساقیِ گلرنگ نے پیمانہ سنبھالا
پھر کالی گھٹاؤں کی نظر دیکھ رہا ہوں

پھر آج مغنی نے اسی ساز کو چھیڑا
دنیا ہے مری دست نگر دیکھ رہا ہوں

پھر کس نے کہا مجھ سے کہ وہ آئے وہ آئے
پھر آج میں کیوں جانبِ در دیکھ رہا ہوں

پھر بارگہِ حسن سے دیکھا مجھے تو نے
پھر مبدلۂ عہدِ حجر دیکھ رہا ہوں

پھر دھوم مچی ہے کہ زمانے میں تو ہی ہے
پھر آج جہاں زیر و زبر دیکھ رہا ہوں

ہاں تھام ذرا دیکھ دھڑکتے ہوئے دل کو
کب سے میں تری راہ گزر دیکھ رہا ہوں

آ! میری طرف آ کہ کروں تجھ پہ نچھاور
دو حلقۂ دیدہ میں گہر دیکھ رہا ہوں

پھر کھیل رہا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
پھر حوصلۂ قلب و جگر دیکھ رہا ہوں

کچھ کھو سا گیا ہوں کہ خبر تک نہیں مجھکو
میں دیکھ رہا ہوں تو کدھر دیکھ رہا ہوں

اللہ رے یہ بارشِ انوارِ تبسم کچھ دیکھ نہیں سکتا مگر دیکھ رہا ہوں
ہاں ڈال دے پردے مری آنکھوں پہ مرے اشک انجام تمنائے نظر دیکھ رہا ہوں

اُکھڑی ہوئی سانسوں میں ہے ہستی کی کہانی میں خوبیٔ اظہارِ بشر دیکھ رہا ہوں
دیکھے جو کوئی اور تو کیا جانیے کیا ہو
جو کچھ کہ ظفر شام و سحر دیکھ رہا ہوں

شاعر اور خطیب

(از حضرت اسد ملتانی)

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ڈھونڈتے رہتے ہیں لذت سخن آرائی میں
عملی کام کا چسکا نہ تجھے ہے نہ مجھے

مست رکھتا ہے ہمیں نشۂ صہبائے سخن
حاجتِ ساغر و مینا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ہمہ تن قال ہی رہنا ہے کہاں کی دانش
مان لیتا ہوں کہ سودا نہ تجھے ہے نہ مجھے

اپنی اُن باتوں کو ہم چاہتے ہیں منوانا
جن پہ الہام کا دھوکا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ہے وہ مسحور فقط سن کے ہماری باتیں
قوم نے غور سے دیکھا نہ تجھے ہے نہ مجھے

یہ تو سوچیں کہ بھلا دین کی کیا خدمت کی
میں نے مانا غمِ دنیا نہ تجھے ہے نہ مجھے

فکر پر فخر مجھے اور تجھے نطق پہ ناز
دست و بازو پہ بھروسا نہ تجھے ہے نہ مجھے

میرا چلتا ہے قلم اور تری چلتی ہے زباں
حوصلہ جنبشِ پا کا نہ تجھے ہے نہ مجھے

تجھکو تقریر سے مطلب مجھے اشعار سے کام
حالتِ قوم کی پروا نہ تجھے ہے نہ مجھے

جاں نثاری کا سبق دیتے ہیں سب کو لیکن
اپنی تکلیف گوارا نہ تجھے ہے نہ مجھے

لاکھ اسد ہم کو دکھائے رہِ میدانِ عمل
اپنے کوچے سے نکلنا نہ تجھے ہے نہ مجھے

اُردو رسالوں کے سالانہ نمبر

رسالہ **دلگداز** لاہور کا سالنامہ بابت ۱۹۳۶ء بڑی تقطیع کے ۴۰۲ صفحات پر بہت آب و تاب کیساتھ شائع ہوا ہے۔ اسمیں ایکسو چھ مضامین نظم و نثر ہیں۔ جنمیں سے بعض مشہور شعراء و اہلِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

گزشتہ نمائش لاہور کے موقعہ پر انجمن اردو پنجاب نے زیر اہتمام ۱۹۳۶ء کی ابتدائی تاریخوں میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی پہلی نشست کی صدارت دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ نے، دوسری و تیسری نشستوں کی آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی جس میں ہندوستان کے مشہور و نامی گرامی شعراء نے شرکت فرمائی تھی جس مشاعرہ کا انتظام مسٹر بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں جیسے سرگرم پرجوش خادم ادب کے سپرد ہوا۔ جسمیں حضرت جوش ملیح آبادی۔ [illegible] صدیقی۔ احسان بن دانش۔ کیفی دہلوی اور تاجور نجیب آبادی جیسے نامور شعراء شریک ہوں اُسکی کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ معزز معاصر ہمایوں نے اپنا ایک پورا نمبر اس یادگار مشاعرہ کے لیے وقف کر دیا ہے جس سے وہ لوگ بھی جنھیں شریک مشاعرہ ہونے کا موقعہ نہیں ملا لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں غزلوں کے علاوہ دلچسپ موضوعات پر نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ چنانچہ ہمایوں میں منتخب غزلیات کے علاوہ بہت سی خاص خاص نظموں کو بھی شائع کر دیا ہے۔ انہیں سے تین نظمیں [illegible] پر۔ مشاعرہ کی تاریخ جناب راحل ہوشیارپوری نے نہایت برجستہ لکھی ہے یعنی "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور" اور شعرائے مشاعرہ کا [illegible] بھی اس مجموعہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جو [illegible] شاعری کے قدر دانوں کے لئے خود ایک قابل قدر چیز ہے۔ بہرحال معزز ہمایوں نے اس مجموعہ کو شائع کر کے جو ادبی خدمت انجام دی ہے اُس کے لئے ہم مکرم ایڈیٹر صاحب ہمایوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ نمبر آٹھ آنہ قیمت پر منیجر صاحب ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے۔

[illegible] حصہ کا تعلق ہے، ہم مولانا نیاز کی کوششوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔ رسالہ کا حجم ۱۰۸ صفحات ہے قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ نگار لکھنؤ

سالنامہ "بیسویں صدی" لاہور

سالنامہ اڑتالیس مضامین نظم و نثر اور چند بڑے مقالات کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جنمیں افسانوں کا حصہ [illegible] ہے۔ بعض بعض مضامین نثر اور بعض غزلیں اور نظمیں واقعی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ دو تین [illegible] ہیں جو انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں "حالات بعد المرگ" پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بعض افسانوں کی زبان میں اصلاح کی گنجائش ہے اور ہمیں یہ بھی تعجب ہے کہ بعض معمولی شاعروں کی پھسپھسی غزلوں پر اُن کے ناموں کے ساتھ ایسے ایسے خطابات دیدئے گئے ہیں، جن کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہیں بہرحال سالنامہ کو دلچسپ بنانے کی خاص کوشش کی گئی ہے۔ غالباً عام طبقہ کے ناظرین کے تفنن طبع کے لئے ہندوستان کی مشہور ایکٹرسیوں کی ایک درجن تصویریں دی گئی ہیں۔ اور بعض نظمیں بھی اسی طبقہ کے متعلق درج رسالہ کی گئی ہیں۔ شاید انھیں تصاویر و مضامین کی بدولت پونے دو سو صفحات کا رسالہ صرف آٹھ آنے میں ملسکتا ہے۔ شائقین دفتر بیسوین صدی پرانی میوہ منڈی لاہور سے طلب فرمائیں۔

نیسان الہ آباد (جوبلی نمبر)

الہ آباد یونیورسٹی اُردو ایسوسی ایشن کی طرف سے "نیسان" نامی ایک ادبی رسالہ ہر تیسرے یا چوتھے ماہ پروفیسر محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے، صدر شعبہ اُردو والہ آباد یونیورسٹی کے زیرادارت شائع ہوتا ہے۔ جسمیں اکثر طلبا اور اساتذہ کے قابل قدر مضامین نظم و نثر شائع ہوا کرتے ہیں۔ زیرنظر پرچہ اسی رسالہ کا "جوبلی نمبر" ہے جو الہ آباد یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ "گولڈن جوبلی" کی تقریب پر خاص اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں سینتالیس مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں پروفیسر سید ضامن علی [illegible]

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، سید وقار عظیم ایم۔ اے جیسے مشہور شعراء داخل ہیں۔ اس کے بعض مضامین واقعی قابل قدر ہیں۔ اس نمبر میں الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ اور خاص خاص طلباء کی جنھیں اُردو سے خاص ذوق ہے بہت سی مختلف تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں جن سے یونیورسٹی طلباء کیلئے یہ رسالہ خاص طور پر دلچسپ ہوگیا ہے۔ لکھائی، چھپائی نہایت روشن، کاغذ عمدہ، ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت دو روپیہ۔ شائقین سید اعجاز حسین صاحب ایم۔ اے لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی و جنرل سکریٹری دوالیہی اشین سے طلب فرمائیں۔

ہمایوں لاہور (مشاعرہ نمبر)

گذشتہ نمائش لاہور کے موقع پر انجمن اُردو پنجاب کے زیر اہتمام ۱۹۳۷ء کی آخری تاریخوں میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی پہلی نشست کی صدارت دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ نے، دوسری اور تیسری نشستوں کی آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی جس میں ہندوستان کے مشہور اور نامی گرامی شعرائے شرکت فرمائی تھی جس مشاعرہ کا انتظام مسٹر بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں جیسے سرگرم، پُرجوش خادم ادب کے سپرد ہوا اور جس میں حضرت جوش ملیح آبادی، روش صدیقی، احسان بن دانش، کیفی دہلوی اور تاجور نجیب آبادی جیسے نامور شعراء شریک ہوں اُسکی کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ معزز معاصر ہمایوں نے اپنا ایک پورا نمبر اس یادگار مشاعرہ کے لیے وقف کر دیا ہے جس سے وہ لوگ بھی جنھیں شریک مشاعرہ ہونے کا موقع نہیں ملا لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں غزلوں کے علاوہ دلچسپ موضوعات پر نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ چنانچہ ہمایوں میں منتخب غزلیات کے علاوہ بہت سی خاص خاص نظموں کو بھی شائع کر دیا ہے۔ انمیں سے تین نظمیں انعامی ہیں۔ مشاعرہ کی تاریخ جناب رتن ہوشیارپوری نے نہایت برجستہ لکھی ہے یعنی "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور" (۱۳۵۶ھ) ور شعرائے مشاعرہ کا ایک گروپ فوٹو بھی اس مجموعہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جو اُردو شاعری کے قدر دانوں کے لئے خود ایک قابل قدر چیز ہے۔ بہرحال معزز ہمایوں نے اس مجموعہ کو شائع کر کے جو ادبی خدمت انجام دی ہے اُس کے لئے ہم اپنے مکرم ایڈیٹر صاحب ہمایوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ نمبر آٹھ آنہ قیمت پر منیجر صاحب ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے۔

نیرنگ خیال (افغانستان نمبر)

حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور رسالہ زمانہ کے پُرانے مضمون نگاروں میں ہیں چنانچہ آپکے کئی قابل قدر افسانے اس رسالہ کی پُرانی جلدوں میں ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں اب آپ کے ذوق ادب، حُسن انتظام اور اولوالعزمی کی بدولت رسالہ نیرنگ خیال کو پنجاب کے اُردو رسائل میں ایک خاص ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے آپکو رسالہ کے خاص نمبر نکالنے کا بے پناہ شوق عشق کے درجہ کو پہونچ گیا ہے چنانچہ اسی عشق کا ایک تازہ نمونہ "افغانستان نمبر" ہے

جو کچھ ایسا لمبا چوڑا تو نہیں ہے، مگر جس موضوع پر یہ نمبر مرتب کیا گیا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے۔ افغانستان ہمارے وطن عزیز کا قریبی ہمسایہ ہے۔ اس لئے اس کے حالات و واقعات ہمارے لئے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس نمبر میں تقریباً دو درجن مضامین ہیں جن سے افغانستان کے جغرافیائی حالات کے علاوہ اسکی زمانۂ حال کی تاریخ اور موجودہ ارباب حکومت کے حالات زندگی پر بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ موجودہ بادشاہ اور اُن کے امراء و سرداروں کے فوٹو اور افغانستان کے پرانے بادشاہوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ غرض اس نمبر کی کامیابی پر ہم ایڈیٹر صاحب "نیرنگ خیال" کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اسکی لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی ہے۔ ٹائیٹل پر ہز مجسٹی ظاہر شاہ کی تصویر اور طغرا درج ہے۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر "نیرنگ خیال" لاہور۔

سب رس

یہ ماہوار رسالہ جو "ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن کا آرگن ہے، صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش کی ایڈیٹری میں جنوری ۱۹۳۶ء سے جاری ہوا ہے۔ اس کے نگراں سید محی الدین قادری زور ہیں جو زبان اردو میں بہت سی قابل قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ "سب رس" کا یہ پہلا نمبر تینتالیس دلچسپ اور قابل قدر مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کے مضمون نگاروں میں خواتین کی تعداد بھی کافی ہے۔ مضامین میں ہر مذاق کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہے، جس کی بدولت یہ رسالہ ہر قابلیت کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ جو کچھ کمی کہیں کہیں رہ گئی ہے، وہ اُمید ہے کہ ڈاکٹر زور کی آیندہ ہدایتوں سے بہت جلد پوری ہو جائیگی ہم اپنے اس جدید ہمعصر کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس کی لکھائی، چھپائی بھی عمدہ ہے۔ ضخامت تقریباً سو صفحات ہے سالانہ چندہ ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر "ادارۂ ادبیات اُردو" رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

سالنامہ ساقی دہلی

رسالہ "ساقی" جو مسٹر شاہد احمد بی۔اے دہلوی کی ایڈیٹری میں کئی سال سے شائع ہو رہا ہے۔ دہلی کا سب سے کامیاب اور قابل قدر رسالہ ہے۔ شاہد صاحب کو پرچہ مرتب کرنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی کا سالنامہ یا کوئی خاص نمبر درکنار اس کا معمولی پرچہ بھی اُترا ہوا نہیں ہوتا۔ آجکل خاص نمبر یا کم از کم سالنامہ نکالنے کی کچھ ایسی ہوا چل گئی ہے کہ اس سے بہت ہی کم پرچے بچے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ساقی کا سالنامہ صحیح معنی میں "سالنامہ" ہوتا ہے۔ جس کے لئے شاہد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ساقی کا زیر نظر نمبر جو ۱۹۳۶ء کا سالنامہ ہے ہر مذاق کی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ترتین دلچسپ اور قابل قدر مضامین نظم و نثر کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے جسمیں سنجیدہ علمی و ادبی مضامین، دلچسپ فسانوں، شگفتہ نظموں اور مزاحیہ مضامین کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مضمون نگاروں میں شمس العلماء مولانا عبدالرحمن، مولانا عنایت اللہ دہلوی بی۔اے سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن، مولانا صادق الخیری

ایم-اے، مولانا لطیف الدین احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم-اے پی ایچ ڈی، مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ جیسے مسلّم ادیب اور اہل قلم ہیں۔ مضامین نثر میں "اُردو کی کہاوتیں اور ان کی کہانیاں"، "میکبتھ"، "فن فسانہ"، "اور حاضرہ اور اُردو غزل گوئی" پڑھنے کے قابل ہیں۔ نظموں میں "اسرار و معارف"، "تجلیات"، "ساقی کلفام" وغیرہ بہت پیاری نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ صفحہ ۲۳۴ سے شروع ہو کر خفی قلم سے لکھی ہوئی جو نظم نے "ہ ادرسیما" کے نام سے تین صفحے سیاہ کیے ہیں وہ کون سی زبان میں ہے۔ بایں ہمہ یہ سالنامہ اپنے طور پر بہت اچھا ہے۔ خصوصاً "میکبتھ" میں تو مولوی عنایت اللہ صاحب نے ترجمہ نگاری کا خوب کمال دکھایا ہے۔ شائقین ادب کو اس سالنامہ کی قدر کرنا چاہیئے۔ ضخامت تقریباً دو سو صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ "ساقی" دہلی۔

سالنامہ شاہکار گورکھپور

اس نام سے ایک اور رسالہ پروفیسر تاجور صاحب کی ایڈیٹری میں لاہور سے بھی بڑی تقطیع پر شائع ہوتا ہے لیکن اس وقت جس "شاہکار" کا سالنامہ ہمارے سامنے ہے، وہ ۱۹۳۴ء سے حکیم عارف بلگرامی صاحب کے زیر اہتمام گورکھپور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ سالنامہ ۳۴ مختلف مضامین نظم و نثر کا ایک دلچسپ گلدستہ ہے جس کا ہر غنچہ متبسم اور ہر پھول شگفتہ ہے۔ ان ۳۴ مضامین میں تقریباً بیس نظمیں یا غزلیں ہیں۔ مضامین نثر میں "جدید اُردو کے رجحانات"، "ایک علمی حقیقت کا انکشاف"، "بغداد و خاتون"، "ضمیات ہند" اور "فلسفۂ سیاسیات کا ایک رخ" قابل قدر مضامین ہیں۔ متعدد فوٹو بھی رسالہ کی شان میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ مگر سب سے اہم چیز اس سالنامہ کا سرورق ہے جس پر تقریباً چالیس مشہور ادیبوں اور نامی شاعروں کے انگشتی فوٹو دیدئے گئے ہیں۔ شاہکار کی یہ دلپذیر جدت قابل ستائش ہے کہ اس نے ایک ہی ورق میں اتنے اہل قلم کے علیحدہ علیحدہ فوٹو قرینے سے جمع کر دئے ہیں۔ اس کا حجم ۱۶۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ شاہکار گورکھپور

"ایشیا" میرٹھ

ہمارے کرمفرما حضرت ساغر نظامی تقریباً تین سال سے "ایشیا" نام کا ایک ادبی رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ اب یہ رسالہ سہ ماہی کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۴ء کا مجموعہ ہے۔ ہمیں کیا ہر صاحب ذوق اور قدر دان ادب کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ساغر صاحب کی نگرانی میں جو کتاب یا رسالہ شائع ہوتا ہے۔ وہ ادبی خوبیوں کے علاوہ محاسن ظاہری سے بھی ہر طرح آراستہ ہوتا ہے۔ یہی حال اس نمبر کا بھی ہے جو متعدد علمی مضامین نثر اور گرانمایہ غزلوں اور نظموں کا دلپذیر مجموعہ ہے۔ مضامین نثر میں پروفیسر فاروقی ایم-اے کا "کمال انگورہ"، مولوی محمد یحییٰ تنہا وکیل کا "اُردو زبان کی تاریخ"، سید عسکری طباطبائی لکھنوی کا "اُردو شاعری میں فقدان جدت اور فارسی کے تتبع کا الزام"۔ اور سید محمد یحییٰ میرٹھی کا "لارڈ کلائیو کے سیاہ کارنامے" گرانقدر تحقیقی مضامین ہیں۔ اُس کی نظمیں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ آخری حصہ میں مسائل حاضرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:- ادبی مرکز مکتبہ ساغر میرٹھ

جذباتِ فراق

(حضرت فراق گورکھپوری، ایم اے)

بیفِ عشق اثرِ دورِ کائنات نہیں
غمِ حیات نہیں کاوشِ ممات نہیں

اتِ عشق کے ہاتھوں کبھی حیات نہیں
غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

ما کے بعد ندامت بھی عشق کو نہ ملی
نگاہِ ناز یہ کہتی ہے "کوئی بات نہیں"

ے قربتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ
جو اپنی ضد نہ ہو وہ نظمِ کائنات نہیں

ہی کی شوخیٔ پنہاں ہے کارگر ناداں
مٹانے والے دلوں کے مقدرات نہیں

یامِ عشق ہے اس زلفِ خم بہ خم سے یہی
ترے اسیر نہ کاٹیں جسے وہ رات نہیں

با بچا کے ہوئی کاوشِ نگاہ اس کی
مٹانے مٹنے کے اے دل یہ سانحات نہیں

ے کھلے ہیں عذاب و ثواب کے مفہوم
رموزِ عشق ہیں اے شیخ دینیات نہیں

بت بڑھا کے نہ کر شکوۂ تلونِ حسن
سنا ہے غمِ محبت کو بھی ثبات نہیں

پوچھ، سوچ کے میں کیا اداس رہتا ہوں
جو غم نصیبِ محبت تھے اُنکی بات نہیں

بہاں میں کوئی بھی تیرے سوا نہیں لیکن
یہ تیری ذات نہیں یہ ترے صفات نہیں

ہزار رخ سے ملی ہے کسی کے حسن کو شہہ
کرامات گنجفۂ عاشقی میں مات نہیں

ہر ایک گردشِ جام و سبو ہے کیفِ دوام
رہینِ دورِ فلک میکدے کی رات نہیں

یہی ہوا کہ ترے بیکسوں پہ کچھ نہ ہوا
جو آ گئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا بدل گئی وہ نگاہ
وہی ہیں لطف و کرم اب مگر وہ بات نہیں

یہ کیا مجاز و حقیقت کی بحث چھیڑی ہے
صفات کون ہیں تیرے جو عین ذات نہیں

نشاطِ حسنِ ازل کو بھی وجد آجاتا
دکھی ہوئی مگر اپنی رگِ حیات نہیں

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا
میں چپ رہا تو برا ماننے کی بات نہیں

فراق عہدِ وفا برطرف۔ یہ کیا کم ہے
کہ وہ نظر۔ وہ عنایت۔ وہ التفات نہیں

رفتار زمانہ

یورپ کی سیاسی حالت

جو لوگ یورپین واقعات کی رفتار پر نظر رکھتے ہیں انھیں معلوم ہے۔ جب سے اٹلی نے ملک حبش پر حملہ کیا ہے یورپ کے بین الاقوامی تعلقات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے دو جتھے ہیں۔ ایک جہاں ڈکٹیٹری یا مطلق العنان حکمرانی کا دور دورہ ہے۔ جیسے اٹلی، جرمنی اور جاپان۔ دوسرے جمہوریت پسند جیسے برطانیہ، فرانس اور امریکہ۔ دونوں گروہ امپیریلسٹ ہیں۔ لیکن دونوں کے طریق عمل میں نمایاں فرق ہے جمہوری سلطنتیں بین الاقوامی تنازعات کو باہمی سمجھوتے سے طے کرنا چاہتی ہیں، لیکن اپنے پلّہ سے کچھ کھونا نہیں چاہتیں۔ دوسری طرف فسطائی سلطنتیں یعنی اٹلی، جرمنی اور جاپان اپنے اغراض و مقاصد کو لڑ بھڑ کر اور جبر و اکراہ سے کام لے کر حاصل کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ یہ سلطنتیں دوسری ہمسایہ سلطنتوں پر اپنا قبضہ و تسلط جمانا چاہتی ہیں۔ مثلاً جاپان چین پر، اٹلی اسپین اور البانیہ پر اور جرمنی زیکوسلاویکیہ و روس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ان تینوں سلطنتوں نے کمیونزم کے خلاف جہاد کرنے کا بہانہ تراش رکھا ہے۔

ابھی تک یورپ کی اندرونی سیاسیات کی صورت مبہم سی تھی، لیکن جب سے آسٹریا کے چانسلر اور ہٹلر کی ملاقات ہوئی ہے اور ہٹلر نے جرمن پارلیمنٹ میں اپنے ملک کی خارجی سیاست کی وضاحت کی اور اٹلی و برطانیہ کے معاملہ پر برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ایڈن اور ان کے نائب لارڈ برابنورن مستعفی ہوگئے ہیں۔ یورپ کی حالت کافی روشنی میں آگئی ہے۔ چنانچہ آج ہم یورپین قوموں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔

اٹلی و برطانیہ اٹلی و برطانیہ کے تعلقات میں اُسوقت سے کشیدگی شروع ہوئی ہے جب اٹلی نے لیگ اقوام اور خصوصاً دولت برطانیہ کی مخالفت کے باوجود لیگ کے ایک ممبر ملک حبش پر حملہ کرکے اُسے فتح کرلیا۔ ان دنوں برطانیہ میں مسٹر (اب لارڈ) بالڈون وزیر اعظم تھے۔ جنکی رہنمائی میں حکومت برطانیہ نے اٹلی کے خلاف شور و شر تو بہت کیا لیکن واقعی طاقت کا کوئی زور نہیں ڈال سکی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جن لوگوں کے سر پر فتوحات اور جہانگیری کا جن سوار ہوتا ہے وہ باتوں سے نہیں مانتے، اور جبتک اُنکے خلاف طاقت سے کام نہ لیا جائے، کسی کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ برطانیہ نے زبانی جمع خرچ تو بہت کیا لیکن قرار واقعی طاقت کا کوئی دباؤ نہ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی حبش پر قابض ہوگیا۔ اور اُس نے اُلٹے برطانیہ کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کردیں۔ بدقسمتی سے پارسال اسپین میں بھی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ایسا عمدہ موقعہ اٹلی کب ہاتھ سے جانے دیسکتا تھا۔ اُس نے فوراً باغیوں سے خفیہ معاہدہ

کرکے اُن کو فوج، اسلحہ، سامانِ جنگ اور رسد سے مدد دینا شروع کر دیا۔ اُدھر برطانیہ اور فرانس کو اسپین کی جمہوری سلطنت سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ اس سے بھی اٹلی، فرانس اور برطانیہ میں مزید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اسی اثناء میں اٹلی نے شمالی افریقہ کی بندرگاہ سیوطہ پر جو جبرالٹر کے عین مقابل ہے۔ اژدرِ دام توپیں چڑھا دیں جس سے بحیرۂ روم میں برطانوی راستہ کو خطرہ پیدا ہوگیا۔ غرض برطانوی، فرانسیسی اور روسی جہازوں پر حملے ہونے لگے، برطانوی جہازوں کو خاص نقصان پہونچایا گیا۔ اور اسطرح رفتہ رفتہ اٹلی نے بحیرۂ روم میں برطانوی اقتدار کو زک پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ چونکہ بحیرۂ روم ہی میں ہوکر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خصوصاً ہندوستان کا قریب ترین راستہ ہے اور تقریباً دو تہائی برطانوی تجارت بھی اسی سمندر سے گذرتی ہے۔ اس لئے برطانوی مفاد کو اٹلی سے سخت اندیشہ پیدا ہوگیا۔ اٹلی نے افریقہ اور عربی ممالک میں بھی ریڈیو سے برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانیہ کی طرف سے بدظن کر دیا جائے۔ ان سب باتوں پر بھی بالڈون گورنمنٹ کو ہوش نہ آیا۔ اور وزراء برطانیہ زبانی پروٹسٹ کرنیکے سوائے کچھ نہ کرسکے جس سے برطانوی اقتدار کی ہوا خیزی ہوگئی اور جاپان بھی برطانیہ کا موجودہ رُخ دیکھکر بیخوف ہوگیا۔ اور چین پر اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دیا۔ بالڈون صاحب کی کنارہ کشی پر مسٹر چیمبرلین وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے بھی اُسی بزدلی کی پالیسی پر عمل کیا اور زبانی احتجاج کے سوائے اٹلی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی بلکہ الٹے اٹلی کی تالیفِ قلب کے موقعہ کی تلاش میں رہے۔

مسٹر ایڈن وزیرِ خارجہ اس پالیسی کے خلاف تھے، اُن کی رائے تھی کہ جب تک اسپین کا معاملہ سیدھا نہ ہوجائے اٹلی سے کسی قسم کی گفتگو شروع نہ کی جائے مگر مسٹر چیمبرلین اٹلی سے ڈرے ہوئے ہیں اور اٹلی کیساتھ جلد سے جلد مصالحت کرنے کی طرف ہیں۔ اسوقت واقعہ یہ ہے کہ اٹلی کی اندرونی حالت کچھ قابلِ اطمینان نہیں ہے اور اُسے مالی امداد کی سخت ضرورت ہے لیکن بقول مسٹر لائیڈ جارج مسولینی کو دھمکیاں دینا خوب آتا ہے۔ وہ دھمکیوں ہی میں برطانیہ سے کام نکالنا چاہتا ہے۔ انگلستان کا متمول طبقہ اور لندن کے مالدار تجار کسی حالت میں انگلستان کو کسی لڑائی میں پھنسانا نہیں چاہتے ہیں اور اُن کو خوف ہے کہ لڑائی سے ذاتی طور پر وہ بالکل تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ چنانچہ چاہے انگلستان کے سیاسی وقار کو کچھ دھکا لگ جائے لیکن وہ اپنے طبقے کی خوشحالی برقرار رکھنا چاہتے ہیں بہرحال اس طبقہ کا موجودہ وزراء برطانیہ پر اسقدر اثر ہے کہ مسٹر ایڈن وزیرِ خارجہ کو مستعفی ہونا پڑا پارلیمنٹ میں اس استعفیٰ پر خوب لے دے ہوئی۔ موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ملامتی ووٹ کی تحریک تو کامیاب نہیں ہوسکی ... جہاں ۱۶۰ ممبران نے ایڈن کی پالیسی کی تائید کی اس کے برعکس ۳۳۰ ممبران نے وزیرِ اعظم کا ساتھ دیا ... پارلیمنٹ میں منجملہ ۴۱۵ ممبران کے ۴۲۵ ممبران گورنمنٹ کے طرفدار ہیں۔ اسمیں سے کم سے کم ...

عام رائے موجودہ وزارت کے خلاف ہے۔ انگلستان میں بھی اتنا اثر تو ضرور محسوس ہوا ہے کہ شاید بحالت موجودہ اٹلی کو برطانیہ سے کوئی بھاری قرضہ نہ مل سکے جیسا کچھ ہو اسوقت تو اٹلی و جرمنی نے گھڑ گھی کے چراغ جلا گئے کیونکہ دونوں مسٹر ایڈن کو اپنے پہلو میں خار سمجھتے تھے۔ لیکن تمام دنیا کی نگاہ میں مسٹر ایڈن کا استعفا جمہوریت سے سر پر مطلق السنانی کی ایک ضرب کاری ہے۔

ہم تو یہی اُمید کرتے ہیں کہ عنقریب ہی برطانیہ عظمیٰ کی وزارت میں کوئی سیاسی انقلاب آنے والا ہے، اور جلد یا دیر میں رائے عامہ کو متمول تاجروں کی خود غرضانہ اور کوتاہ اندیشانہ پالیسی پر فتح حاصل ہوگی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی کمزور پالیسی کا خود اٹلی میں مضحکہ اڑایا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسولینی کے معتمد علیہ فارینا سیاسی نے اطالوی اخبار "ریجیم فاشسٹا" (Regime Fascista) میں ایک مضمون میں اٹلی کے ساتھ برطانیہ کے موجودہ میلان کو ایک شاطرانہ چال قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"پہلے تو برطانوی دفتر خارجہ برلن سے اظہار ناز و نیاز کر رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی جرمنی کی خارجی پالیسی کی باگ ڈور ہر فان ربن ٹراپ کے ہاتھ میں آئی، جو اٹلی اور جرمنی کے دوستانہ تعلقات کا زبردست حامی ہے، ویسے ہی گورنمنٹ برطانیہ نے سمجھ لیا کہ اب جرمنی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے وہ روم کی طرف مائل ہوئی ہے۔ لیکن برطانیہ کو اپنی غلط فہمی جلد معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ اٹلی اور برطانیہ کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ اسپین کا حائل ہے۔ جہاں روس، فرانس اور برطانیہ کے بہم پہنچائے ہوئے سامان جنگ سے ہزاروں اطالوی سپاہی کھیت رہے ہیں۔ چنانچہ محض زبانی نیازمندی سے اس نقصان عظیم کی تلافی نہیں ہو سکتی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اٹلی اپنی دوستی کا زبردست معاوضہ مانگتا ہے اور وہ بقول ایک فرانسیسی اخبار یہ ہے کہ:-

(۱) بحیرۂ روم میں اٹلی و برطانیہ کے جنگی بیڑوں کی مساوات کا اصول تسلیم کیا جائے۔

(۲) اٹلی کو نہر سویز کی نگرانی کا حق دیا جائے۔

(۳) اٹلی کو جزائر بلیارک میں بھی قدم رکھنے کی جگہ دیجائے اور اس کے ساتھ ہی دوسری سلطنتوں کیساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(۴) اٹلی کو تین کروڑ پاونڈ کا قرضہ دیا جائے۔

(۵) حبش کی فتح اور اٹلی سے اس کا الحاق تسلیم کر لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ انمیں سے پہلی چار شرطوں کا پورا کرنا برطانیہ کے لئے محال ہے۔ البتہ آخر مطالبہ ضرور ایسا ہے جسکو

برطانیہ اپنی سیاسی سوائی سے قطع نظر آسانی سے تسلیم کرسکتا ہے مگر پچھلے چار مطالبات کا پورا کرنا موجودہ وزراء برطانیہ کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے، اور اگر چیمبرلین گورنمنٹ نے انھیں تسلیم کرلیا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سلطنت برطانیہ کا زوال شروع ہوگیا۔ کیونکہ جس روز نہر سوئیز پر کسی غیر ملک کا دخل ہوگیا تو وہ جب چاہے انگریزی جہازوں کو روک سکیگا۔ جزائر بلیارک میں بھی اطالوی مستقر قائم ہونے سے جبرالٹر کی اہمیت جاتی رہیگی اور آبنائے جبرالٹر کا راستہ مخدوش ہوجائیگا۔ رہا قرضہ کا معاملہ تو وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر دیا نہیں جاسکتا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ پارلیمنٹ اس کو منظور نہ کرے گی۔ اسکا کیا اطمینان ہے کہ اس رقم سے جو سامانِ جنگ تیار ہوگا وہ کسی وقت خود برطانیہ کے خلاف استعمال نہ کیا جائے گا۔ غرض اسوقت معاملہ الجھن میں پڑا ہوا ہے۔ آگے دیکھئے برطانیہ کا سیاسی اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

جرمنی و برطانیہ جب سے جرمنی کی عنانِ حکومت ہرہٹلر کے ہاتھ میں آئی ہے، اُس نے رفتہ رفتہ اپنی طاقت اسقدر بڑھالی ہے کہ ہمسایہ قوموں کو اس سے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اگرچہ برطانیہ کی جغرافیائی حالت اور اسکا محلِ وقوع ایسا ہے جس کی وجہ سے یورپ کی دیگر قومیں آسانی سے اُس پر حملہ آور نہیں ہوسکتیں، مگر ہوائی جہاز ایک بے پناہ چیز ہے۔ جس کے حملوں سے بچنا دشوار ہے اور جرمنی کے پاس اب فوجی طیاروں کی اسقدر کثرت ہوگئی ہے۔ کہ وہ اسپین میں جنرل فرانکو کو بھی طیارے بہم پہونچارہا ہے غرض برطانیہ پر ہوائی تاخت کے سوا حملہ کا خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے جرمنی کی مخالفت یورپ اور دیگر ممالک میں برطانیہ کے لئے تشویش انگیز ثابت ہوسکتی ہے۔

جرمنی کو فرانس و برطانیہ سے اس کے سوا اور کوئی شکایت نہیں ہے کہ جنگ عظیم کے بعد اس کی تمام افریقی نوآبادیاں فرانس و برطانیہ ہی کے قبضہ میں آگئی ہیں، جنھیں اب وہ واپس لینا چاہتا ہے۔ فرانس اور جرمنی کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اس لئے فرانس کو وہ ہر وقت پریشان کرسکتا ہے اور اگر جرمنی فرانس پر حملہ کربیٹھے تو برطانیہ کو مجبوراً فرانس کا ساتھ دینا پڑے گا۔ کیونکہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہیں کہ ایک پر حملہ دوسرے کیلئے خطرۂ عظیم کے مرادف ہے۔ بہرحال جرمنی نے برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ شاطرانہ چال کھیلی ہے کہ اُس نے اٹلی اور جاپان سے اتحاد کرلیا ہے تاکہ اگر اٹلی برطانیہ کو یورپ خصوصاً بحیرۂ روم میں پریشان کرے تو جاپان برطانیہ کے مفاد کو چین میں نقصان پہونچائے۔ جرمنی کا یہ مقصد پوری طرح حاصل ہورہا ہے۔ اب اگر فرانس و برطانیہ چاہتے ہیں کہ جرمنی سے صلح رہے تو اس کی صورت افریقہ کی جرمن نوآبادیوں کی واپسی ہے۔ لیکن باوجود بار بار کے تقاضہ کے فرانس و برطانیہ جرمن نوآبادیاں واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

جاپان کی طرح جرمنی کی آبادی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے اُسے نوآبادکاری اور اپنی صنعت وحرفت کیلئے خام اجناس حاصل کرنے کے لئے مزید علاقہ کی ضرورت ہے اور جرمنی کی یہ ضرورت دو صورتوں سے پوری ہوسکتی ہے

یعنی یا تو اُس کی سابق نوآبادیاں واپس کردی جائیں یا اُسے یورپ کے مشرق میں پھیلنے دیا جائے۔ پہلی صورت میں تو فرانس و برطانیہ ابھی تک رضامند نہیں ہوئے، اور نہ غالباً ہوں گے۔ لیکن دوسری صورت میں اُن کے ہاتھ سے کوئی علاقہ نہیں جاتا۔ مگر اس صورت میں سب سے اہم اور زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ تمام وسطی اور مشرقی یورپ پر جرمنی کا فوجی اقتدار قائم ہوجائے گا۔ جس سے نہ صرف یورپ کا توازنِ قوت درہم برہم ہوجائیگا، بلکہ فرانس اور بلجیم کو اپنی جان کے لالے پڑجائینگے۔ لیکن جرمنی کے دل میں ابھی تک اپنی جرمن نوآبادیوں کا ارمان باقی ہے۔ چنانچہ ۲۰ فروری کو ریشتاغ میں تقریر کرتے ہوئے ہر ہٹلر نے جرمنی کی سیاست خارجیہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"جرمنی بالشویزم کی توسیع و ترقی کا سخت مخالف ہے اس لئے وہ جاپان کا ساتھ دے رہا ہے کیونکہ چین و جاپان کی موجودہ جنگ میں اگر جاپان کو شکست ہوگئی تو اس سے یورپ و امریکہ کو کوئی فائدہ نہ پہونچیگا بلکہ جو کچھ نفع ہوگا وہ بالشویزم کو ہوگا۔ مگر چین میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ عرصہ تک جاپان کی مزاحمت کرسکے جرمنی مشرقِ اقصیٰ کی طرف غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیال میں جاپان کی فتح بالشویکوں سے کم خطرناک ہوگی۔ بواسطے اٹلی اور جاپان سے جرمنی اپنے تعلقات زیادہ مستحکم کرے گا۔ اور ریاست مانچوکو کو تسلیم کرے گا۔ جرمنی کو اسپین میں کسی علاقہ کی تمنا نہیں ہے، لیکن اگر وہاں بالشویک پارٹی کی فتح ہوئی تو جرمنی کے نزدیک یورپ کا توازنِ قوت متزلزل ہوجائیگا جسے جرمنی گوارا نہیں کرسکتا۔ اٹلی اور جرمنی دونوں کے مقاصد اسپین میں یکساں ہیں۔ علاقہ سار کی واپسی کے بعد جرمنی فرانس سے کسی علاقہ کا طلبگار نہیں نہ اُسے نوآبادیات کے علاوہ برطانیہ سے کوئی مخالفت ہے"۔

اس بیان کے آخری فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہٹلر کے دل میں جرمن نوآبادیوں کی، جن پر برطانیہ قابض ہے بہت زیادہ خلش ہے اور وہ یہ خلش مٹا کر رہیگا۔ اگر برطانیہ نے فی الحال جرمن نوآبادیاں واپس کرنیکے بجائے جرمنی کو مشرق میں پاؤں پھیلانے دیا، تو ممکن ہے کہ نوآبادیوں کا تقاضا کچھ عرصہ کیلئے رُک جائے لیکن جب مشرقی یورپ میں فتحمند ہوکر جرمنی زیادہ طاقت کے ساتھ اُبھرےگا تو برطانیہ کو نئی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اور اُسوقت نوآبادیاں واپس کئے بغیر کچھ بن نہ پڑے گا۔ اس طرح موجودہ سیاسی صورتِ حال دولتِ برطانیہ کے لئے تشویش انگیز ہے۔ اور یہ صورت محض فرانس کی غداری سے پیش آئی ہے جس نے جنگ حبش کے زمانہ میں برطانیہ کا ساتھ نہ دیا۔ اور جو اٹلی کے ہاتھوں اب خود بھی پریشان ہے۔

جرمنی و آسٹریا جرمنی اور آسٹریا دونوں ہمسایہ ملک ہیں۔ آسٹریا جرمنی کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ جرمنی و آسٹریا میں تعلقات ہمسائگی کے علاوہ سب سے بڑا تعلق نسلی ہے یعنی مغربی آسٹریا کی آبادی میں جرمن عنصر سب سے زیادہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ جرمنی کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے بھی جرمنی و آسٹریا کی

خارجی پالیسی ایک ہی تھی - اور اسی وجہ سے دونوں اتحادی ملکوں سے نبرد آزما ہوئے تھے - لیکن جنگ کے بعد جب سلطنت آسٹریا کا شیرازہ منتشر ہوگیا - اور جرمنی بھی جنگ میں خستہ و خراب ہوکر اپنا گھر درست کرنے میں مصروف ہوگیا - تو کچھ عرصہ کے لئے دونوں ایک دوسرے سے غافل ہوگئے - لیکن جب جرمنی از سرِ نو طاقتور ہوگیا - تو اسکی توجہ پھر آسٹریا کی طرف مبذول ہوئی - چنانچہ سابق چانسلر آسٹریا ڈولفس مقتول کے زمانہ میں جرمنی نے آسٹریا کو اپنے زیرِ اثر لانا چاہا اور آسٹریا کے نازیوں نے ملک میں اودھم مچایا تو خونریزی تک نوبت پہونچ گئی اور اٹلی نے بھی جرمنی کے خلاف اپنی فوجیں آسٹروی سرحد کی طرف بھیجدی تھیں - لیکن جب سے اٹلی اور جرمنی کا دوستانہ ہوگیا ہے - اٹلی آپنا پہلا رویہ چھوڑ کر جرمنی کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے - جرمنی کی قدرتاً یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے تمام مشرقی ہمسایوں کو زیرِ اثر لے آئے - اسکی وجہ کیا ہے؟ اس کیلئے ناظرین کو یورپ کا نقشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہئیے -

آجکل مسولینی اور ہر ہٹلر فرانس و برطانیہ کو دھمکیاں دے رہے ہیں، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ انمیں سے کوئی اتنا طاقتور نہیں ہے، جو فرانس و برطانیہ کا جنگ میں مقابلہ کر سکے، جرمنی کو اس بات سے مایوسی ہے کہ برطانیہ یا فرانس سے اس کی افریقی نو آبادیاں واپس مل سکیں - مگر اپنی بڑھتی ہوئی آبادی بسانے اور اپنی صنعت و حرفت کے لئے خام اجناس حاصل کرنیکے لئے جرمنی کو مزید علاقہ کی ضرورت ہے - ظاہر ہے کہ مغربی یورپ میں اُسے قدم رکھنے کی کہیں گنجائش نہیں ہے - البتہ اگر کوئی علاقہ ملسکتا ہے تو مشرقی یورپ کی طرف ملسکتا ہے - جہاں کی سلطنتیں چھوٹی چھوٹی اور کمزور ہیں - اسی لئے جرمنی نے بالشویزم کے خلاف جہاد کرنے کا بہانہ ڈھونڈا ہے، تاکہ جنوبی روس کا علاقہ یوکرینیہ فتح کرلے

لیکن یوکرینیہ اور جرمنی کے درمیان تین سلطنتیں یعنی آسٹریا، زیکوسلاویکیہ اور رومانیہ حائل ہیں - رومانیہ میں تو فسطائی گورنمنٹ قائم ہوگئی ہے جس کے معنی ہیں کہ رومانیہ اٹلی اور جرمنی سے ملگیا ہے - اب صرف آسٹریا اور زیکوسلاویکیہ کو زیرِ اثر لانا باقی ہے - چنانچہ پچھلے دنوں آسٹریا کے موجودہ چانسلر شوشنیگ سے ہر ہٹلر نے ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کردئے اور مزید زور ڈالنے کی غرض سے مصنوعی جنگ کے بہانہ سے سرحدِ آسٹریا پر جرمن فوجیں جمع بھی کردیں -

اِس کاروائی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور آسٹریا کے چانسلر کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا - گو یہ ایک ماہ پہلے نازیوں کی مخالفت میں بہت بلند آہنگ تھا - مگر اب اُس کو دل پر جبر کرکے اُن تمام نازیوں کو چھوڑنا پڑا جنھوں نے آسٹروی گورنمنٹ کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی تھی - اس کے علاوہ ڈاکٹر شمڈٹ کو جو جرمنی کا حد درجہ طرفدار ہے - وزیرِ خارجیہ اور ہر سیسن کوارٹ کو جو خود نازی لیڈر ہے، وزیرِ داخلیہ مقرر کرنا پڑا - محکمہ پولس بھی اب اسی کے قبضہ میں ہے -

اِس طرح ایک ادنیٰ - ظاہرہ طاقت سے گویا ہٹلر نے آسٹریا کی تمام سیاسیات خارجیہ و داخلیہ پر قبضہ کرلیا ہے - واقعہ کو جرمنی کی اس کاروائی سے پریشانی اور اٹلی کو خوشی ہوئی - اسکو مارکس و جرمنی کے درمیان جو

تین بڑی رکاوٹیں موجود تھیں اُن میں سے دو بالکل دُور ہوگئی ہیں البتہ تیسری رکاوٹ زیکوسلاویکیہ کی ہنوز باقی ہے، شاید چند روز میں وہ بھی دُور ہوجائے۔ فی الحال ہر ہٹلر نے آسٹریا کی آزادی و خود مختاری برقرار رکھنے کا وعدہ کیا ہے لیکن یہ آزادی برائے نام ہوگی کیونکہ آسٹریا کی خارجی و داخلی سیاست جرمنی کے قبضہ اقتدار میں آگئی ہے۔ اور اس طرح ہٹلر کا پورا تسلط قائم ہوگیا ہے۔

جرمنی اور روس اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ جرمنی کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے بسانے اور اپنی صنعت و حرفت کے لئے خام اجناس بہم پہونچانے کیلئے مزید علاقہ کی ضرورت ہے۔ اور جب سے جرمنی کو فرانس و برطانیہ کی طرف سے نو آبادیات کے متعلق مایوسی ہوچکی ہے۔ اُس نے اطالیہ سے دوستی کی پینگ بڑھانے شروع کر دئے ہیں۔ اسمیں دو مصلحتیں اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اٹلی اور فرانس ہمسایہ سلطنتیں ہیں۔ اس لئے اٹلی سے دوستی ہونیسے فرانس پر اور زیادہ دباؤ پڑے گا۔ جرمنی نے جنگ حبش میں اٹلی کی حمایت کی اور اسپین کی خانہ جنگی میں بھی اُس کا ساتھ دیا۔ جس کا صلہ یہ ملا کہ پچھلے دنوں جب ہٹلر نے آسٹریا کو اپنے مطالبات منظور کرنے پر مجبور کیا تو اٹلی نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ مغربی یورپ کا علاقہ بہت محدود ہے جو جرمنی کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے۔ دوسرے اس طرف اگر جرمنی پاؤں پھیلاتا ہے تو فرانس و برطانیہ اور شاید امریکہ سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لئے جرمنی اب روس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے اسی غرض سے اُسنے بالشویزم کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے۔

لیکن جرمنی یہ بھی جانتا ہے کہ فرانس و برطانیہ کا رُخ روس سے اتحاد کرنے کی طرف ہے، اس لئے اگر روس کے مغربی حصے پر حملہ کیا تو ممکن ہے کہ فرانس اس کو گوارا نہ کرے اور وہ روس کی امداد میں جرمنی پر حملہ کر دے۔ اسی کے توڑ کے لئے جرمنی نے اٹلی سے یارانہ گانٹھ لیا ہے اور دونوں کا معاہدہ ہوگیا ہے کہ اگر فرانس نے جرمنی و روس کی لڑائی کے وقت جرمنی پر حملہ کیا تو اٹلی بھی دوسری طرف سے فرانس پر حملہ کر دے گا۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ روس کا علاقہ مغرب میں بحیرۂ بالٹک سے لیکر مشرق اقصیٰ میں بحر الکاہل تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق اقصیٰ میں جاپان اور روس کے مفاد میں تصادم ہے اور جاپان شمالی چین میں اندرونی منگولیا پر قبضہ کرنیکے بعد بیرونی منگولیا پر بھی جو روس کی زیر حمایت ہے قبضہ کرنیکا خواہشمند ہے۔ جرمنی اور جاپان دونوں روس کے مخالف ہیں۔ اس لئے جرمنی اور اٹلی نے جاپان سے دوستانہ معاہدہ کرلیا ہے تاکہ اگر کبھی جرمنی روس پر مغرب کی طرف سے حملہ آور ہو تو جاپان بھی مشرق سے روس پر حملہ کر دے اور روس کو دو طرفہ مدافعت کرنا پڑے۔

حال ہی میں برطانیہ نے اٹلی سے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ برطانیہ بحیرہ روم کے اقتدار میں اٹلی کو بھی شریک کرنیکے لئے آمادہ ہے۔ غالباً اسی سلسلے میں برطانیہ حبش پر اٹلی کی فتح بھی تسلیم کرلیگا اور اُس کے ساتھ ہی ممکن ہے جرمن نو آبادیوں یا روس پر جرمنی حملہ کا معاملہ بھی غیر رسمی طور پر طے ہوجائے۔ روس

پر حملہ سے برطانیہ کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہے اور نہ حبش میں اطالوی قبضہ تسلیم کرنے یا نہ تسلیم کرنے کا اسپر کوئی خاص اثر پڑے گا۔ لیکن اس سے لیگ اقوام کا رہا سہا وجود ضرور باضابطہ طور پر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے ان باتوں کا لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر برطانیہ آسٹریا زیکوسلاویکیہ وغیرہ وسطی یورپ سے دست بردار ہو کر جرمنی وہاں آزاد چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا تو ۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ برطانیہ کو روس کیطرف زیادہ رجوع ہونا پڑے گا یورپ اسی حالت پر پہونچ جائے گا۔ جہاں پر وہ ۱۹۱۴ء میں تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اٹلی کے بارے میں اب نہ یقین کیسا تھ کہا جا سکتا ہے کہ آیندہ جنگ میں وہ جرمنی کا ساتھ دیگا۔ اور ۱۹۱۷ء کی طرح برطانیہ اس کو جرمنی جدا نہ رکھ سکیگا۔ اسوقت برطانیہ نے اٹلی سے جو سلسلہ جنبانی شروع کی ہے اُسکی تہ میں یہی خواہش ہے کہ اٹلی سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن ہم کو اسکا بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ اٹلی جرمنی کا ساتھ چھوڑ دے۔ برطانیہ کے بھی اٹلی کے مطالبات پورا کرنا دشوار ہے۔ حالانکہ نہر سویز کے متعلق مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں اس بات سے انکار کیا ہے کہ اٹلی نے اسکا کوئی مطالبہ کیا ہے۔

موجودہ وزارت کے علاوہ عموماً مدبرین برطانیہ اٹلی کے جا و بیجا مطالبات پورے کرنیکی پالیسی کے قائل نہیں ہیں فرانس بھی انگلستان کے ساتھ ہر حالت میں وابستہ رہنا چاہتا ہے اور اٹلی و برطانیہ کے درمیان سمجھوتہ کے خلاف نہیں ہے اور یورپ میں صلح قائم رکھنے کا حامی ہے لیکن اُس نے صاف کہدیا ہے کہ امن کی خواہش کے باوجود وہ صلح کیا صرف مناسب قیمت ہی ادا کرنے کو تیار ہے۔ بہرحال اسوقت یورپ کا سیاسی مطلع بہت غبار آلود ہے معاملات پیچیدہ صورت اختیار کر رہے ہیں۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا؟ اسکی پیشگوئی کرنا مشکل ہے۔

ہمارا نیا سرورق

زمانہ کی نئی جلد جنوری اور جولائی سے شروع ہوتی ہے لیکن اسکا پہلا نمبر فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اسلئے فروری ہی اسکی سالگرہ کا مہینہ ہے جس سے اسکی زندگی کا نیا سال شروع ہوتا ہے، چنانچہ اس ماہ سے ہم زمانہ کے سرورق میں ایک اہم تبدیلی کر رہے ہیں۔ جس معیار کو سامنے رکھ کر زمانہ پینتیس سال سے ملک کی ادبی خدمت کر رہا ہے اسکی ایک دھندلی سی تصویر اس سرورق میں پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے۔ کال کا چکر گھوم رہا ہے۔ زمانہ کی گردش جاری ہے۔ وقت کا پہیہ برابر چل رہا ہے اسکی مستعدی میں نہ کوئی فرق آیا ہے اور نہ آئے گا۔ دنیا کی سچائیاں بھی لافانی ہیں۔ گلہائے رنگ رنگ سے اس چمن کی زینت ہے۔ ہندو مسلم۔ عیسائی۔ جین۔ سکھ۔ بودھ سبھی ہمارے ملکی بھائی ہیں۔ اور سب کے تعاون باہمی پر ہماری ملکی ترقی کا دار مدار ہے۔

ہندوستانی تہذیب و اخلاق پر سبھی مذاہب کا اثر پڑا ہے اور ہمارا مستقبل انھیں تمام اجزا کے اتفاق و اتحاد سے وابستہ ہمارا کلچر بھی انھیں مختلف اجزا کی تہذیب و روایات کا بہترین مجموعہ ہے۔ اسی کو ترقی دینا ہمارا ملکی فرض ہے، جس کو اس ناچیز رسالہ نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اسلیئے مسجد۔ مندر۔ گرجا۔ گوردوارہ سبھی ہمارے نئے سرورق میں جلوہ افروز ہیں۔ انھیں

کے سایۂ عاطفت میں ملک کو امن و صلح کیساتھ زندگی بسر کرکے اپنا شاندار مستقبل بنانا ہے۔ خدا ہمارے عزم میں برکت دے اور
نیا سرورق ہمارے مطالب و مقاصد کو واضح کرتا ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

۱۹۳۶ء میں انگلستان میں ۱۶ ہزار سے زائد نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سے پہلے برطانیہ میں اسقدر تصانیف کبھی شائع نہ ہوئی تھیں۔ ہر صنعت کی کتابوں میں اضافہ ہوا، لیکن افسانوں کی تعداد میں نسبتاً کم اضافہ ہوا۔ اس پر بھی ہر ہفتہ اوسطاً ۴۰ ناول شائع ہوتے۔ بقول ایک ریویو نگار ان کثیر التعداد کتابوں کی اشاعت سے یہ ثابت ہوتا ہے انسانی دلچسپی کے سلسلہ میں خاصی ترقی ہو رہی ہے اور انگلستان میں کتابوں کی اشاعت کا کام نفع بخش ہے۔ ورنہ اس قدر اولوالعزمی سے کام نہ ہوتا۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں کی عام قدردانی کا حال بھی سن لیجئے۔ حضرت جگر مرادآبادی کا بہترین اردو شعرا میں شمار ہے۔ وہ تغزل کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں طبع ہوا تھا۔ اب کامل چودہ سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی ٹھیک تعداد تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ایک ہزار سے زائد نہ چھپا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گو مشاعروں میں جگر کا کلام سنکر ہزارہا سامعین سر دھننے لگتے ہیں اور واہ واہ کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن ان کے مجموعہ کلام کو قیمت دیکر خریدنے والے ہزاروں میں دو ہی ایک ہیں۔

ہمارے دوست حضرت سحر ہتگامی نے منشی پریم چند کے آخری ناول "گئو دان" کے اردو ترجمے کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی۔ آپ نے اس کا مکمل ترجمہ کرکے پبلشر کے سپرد کر دیا ہے اور "گئو دان" کا اردو ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوگا۔
سحر صاحب نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا ہے جسے حال ہی میں انڈین پریس الہ آباد نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

حال میں مسرز لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور نے "سولہ سنگار" کے نام سے اردو ہندی کے مشہور افسانہ نگار مکرمی سدرشن صاحب کے سولہ مختصر افسانوں کا ایک دلکش مجموعہ شائع کیا ہے۔ پریم چند صاحب کے بعد سدرشن صاحب ہی ایسے مصنف ہیں جنکو اردو و ہندی دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ آپ نے پریم چند کی طرز تحریر کو بھی بہت کچھ اپنایا ہے۔ اس معنی سے ہم آپ کو ان کا جانشین سمجھ سکتے ہیں۔

---

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور۔ راولپنڈی۔ حیدر آباد۔ میسور و مدراس وغیرہ ملک کے خاص خاص مقامات میں قدر دانان ادب نے "اقبال ڈے" منا کر ملک کے شاعر اعظم کے ساتھ اپنی عقیدت و قدر دانی کا اظہار کیا۔ جابجا دھوم دھام جلسے ہوئے اور ہر جگہ کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی اور بڑے بڑے نکتہ شناس حضرات نے داد سخن دی۔ لاہور میں ایک قدر دان نے علامہ ممدوح کے صاحبزادے کو چار مربعہ اراضی کے بھی نذر کر کے ملک کے بڑے بڑے رئیسوں کے سامنے ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔

ہم زمانہ کے آیندہ نمبر میں ممدوح کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر رہے ہیں

لیتھو چھپائی میں کتابت کی غلطیوں کا رونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر اس نقص کی سب سے بڑی بلکہ اصلی وجہ اُردو پریس کی بے بضاعتی ہے۔ مطابع میں عموماً تصحیح کا کوئی خاص انتظام نہیں رہتا۔ اور لیتھو چھپائی میں ہر قدم پر نئی غلطیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ زمانہ کا پریم چند نمبر بھی اِس نقص سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ بلکہ کتابت کی جسقدر غلطیاں رہ گئی ہیں اُنھیں دیکھکر طبیعت نڈھال ہو جاتی ہے۔ "حالات" کی جگہ "حالت"۔ "لیکن" کی جگہ "کہیں" وغیرہ وغیرہ بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اکثر الفاظ کا اِملا بھی غلط ہو گیا ہے، جو اس نمبر کے روئے زیبا پر ایک نہ مٹنے والا داغ ہے۔ مگر جب تک پریس اور اُردو رسالوں کی مالی حالت بہتر نہیں ہوتی ہے۔ ان نقایص سے مفر نہیں۔ ایک پریم چند نمبر اور زمانہ کے پرچے ہی نہیں بلکہ اُردو کی ہر کتاب اِس نقص کا شکار ہوتی ہے

ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مضمون نگار صاحب اپنے مضامین ایک سے زیادہ جگہ بھیجنے کے عادی ہیں حالانکہ کسی ایک رسالہ کے پاس مضمون بھیجنے کے بعد اُسے دوسری جگہ بھیجنے سے پہلے مضمون نگار کا اخلاقی فرض ہے۔ کہ اسکی اطلاع پہلے رسالہ کو دیدے۔ زمانہ میں مضامین کا کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ اکثر مضمون نگار صاحبان کو کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض مضامین خاص موقعوں کے لئے قصداً روک لئے جاتے ہیں۔ اِس لئے اُن کا دیر میں شائع ہونا باعث شکایت نہ ہونا چاہئے۔ بہرحال ہم اپنے معاونین سے باادب یہی گذارش کرتے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ ان کا سلوک "نیکی کن بہ دریا انداز" کے اصول پر ہونا چاہئے۔ اور جو مضامین ہمارے پاس اشاعت کیلئے بھیجے جائیں وہ ہماری اطلاع کے بغیر کسی دوسری جگہ ہرگز نہ بھیجے جائیں تاکہ رسالہ کو پریشانی نہ ہو اور اُنھیں بھی خفت اُٹھانا نہ پڑے۔

کویراج سرس سین صاحب وید مالک گیتا پرچار و بھاگ سنیاسی فارمیسی، گاندھی اسکوائر لاہور، ناظرین زمانہ کو شریمد گیتا کا ہندی ترجمہ مفت نذر کرنے کو تیار ہیں۔ جن اصحاب کو شوق ہو کویراج موصوف سے طلب فرمائیں

ضعفی دور کرنے کی تدابیر

مع ۲۴ تصاویر

ضعیفی کو تو کوئی روک نہیں سکتا لیکن امریکہ کے سائنسدانوں نے ضعیفی دور کرنے کی ترکیب نکال ہی ڈالی۔ صبح چارپائی پر پڑے کچھ اعضائ کو حرکت دیتے رہتے، پھر نہ قبض کی شکایت ہوگی اور نہ کبھی دیگر بیماریوں کا اندیشہ رہے گا۔ اور اعضا کو کس طریقہ پر حرکت دینی چاہئے۔ اس کیواسطے کتاب میں چوبیس تصاویر دی ہوئی ہیں کسی اُستاد کے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر ان پابیوں کیواسطے نہایت مفید ہے جو کہ گھومنے پھرنے ورزش کرنے وغیرہ کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے بدہضمی۔ بواسیر و دیگر امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم نے خود اس کے مطابق ورزش کرکے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ واقعی اس کتاب کے بموجب کرنے سے بوڑھاپا دُور ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کی صفات کو دیکھتے ہوئے بھی ہم نے برائے نام اس کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔ ڈاک خرچ ۹ ۔ نوٹ:۔ زمانہ کا حوالہ تحریر کرنیوالے کو یہ کتاب نصف قیمت پر ملیگی۔

ملنے کا پتہ:۔ **سُکھ سنچارک کمپنی متھرا** (یو۔پی)

---
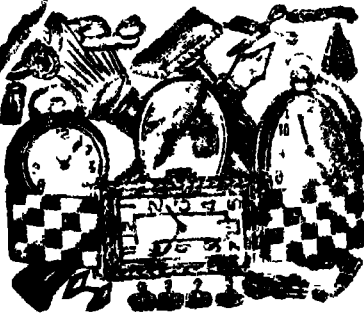
۵ گھڑیاں اور ۲۸۹۰ دیگر انعامات

صرف ایک روپیہ میں

ہمارے خوشبودار "اوٹو روز" کی بارہ شیشیوں یا "برنگ ورم آئنٹ منٹ" کی سترہ شیشیوں کے خریدار کو ایک ریلوے پاکٹ ڈمی واچ۔ ایک ملمع کی ڈمی رسٹ واچ، ڈیو گلٹ کے سیفٹی ریزر۔ ایک عدد شیونگ برش۔ ایک پیکٹ پاوڈر۔ ایک عدد آئینہ۔ ایک عدد کنگھا۔ ایک عدد فاونٹین پین مع سُنہری نب چودہ قیراط طلائی۔ ایک ملمع کی انگوٹھی۔ ایک ہولڈر۔ ایک عدد سیٹی۔ ایک عدد گیند۔ ۱۹۰۰ فیٹ فوکس والی ایک عدد ٹارچ یا دس سال کی گارنٹی کی ایک ہی ٹائم پیس اور دیگر انعامات جنکی تعداد ۲۸۹۰ ہے۔ پوسٹیج اور پیکنگ ۱۴ علاوہ۔

ملنے کا پتہ:۔ **ایسٹرن ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۰۴ کلکتہ**

The ZAMANA. April 1938.

اپریل ۱۹۳۸ء	مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔	جلد ۷۰ نمبر ۴

فہرست

فی پرچہ سات آنہ	دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا	قیمت سالانہ: پانچ روپیہ

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں سنہ ۱۹۰۳ء سے پرانے فائل موجود ہیں، زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور باتصویر رسالہ پینتیس سال سے اردو زبان و ادب کی گرانقدر مسلسل خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ پرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی:

۱۔ گیارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے عہ۲۸ مع محصول ڈاک

۲۔ چار سال کے خریدار سے علاوہ محصول بحساب عہ۳ فی فائل

۳۔ ایک سال کے خریدار سے عہ۴ علاوہ محصول۔

نوٹ: آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئے۔ فائل سنہ ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے سنہ ۱۹۳۴ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

مینجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

منشی پریم چند کے تیرہ۱۳ افسانوں کا مجموعہ نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ قیمت ایک روپیہ محصول علاوہ

ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

برلن کے اولمپک کھیلوں کے

ڈچ ایسٹ انڈیز چیمپین ہیں [illegible]

ہانس ہاسمین سے ملاقات

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ دنیا بھر کے نوجوان کھلاڑی برلن کے اولمپک کھیلوں میں جمع ہوئے تھے شور و غل سے بھرے ہوئے ٹھاٹھیں مارنیوالے شہر برلن سے چند میل کے فاصلہ پر ایک خاص قسم کی سکون بخش اور آرام دہ تخلیہ کی جگہ "موضع اولمپک" کے نام سے قائم کی گئی تھی، جو تمام اطراف سے آنیوالے چار ہزار کھلاڑیوں کے لئے مخصوص تھی۔

موضع مذکور کے عظیم الشان آہنی پھاٹک کے سامنے، جہاں سے موضع میں داخل ہوتے تھے دن کو ہر وقت درجنوں آدمی کھڑے رہتے تھے جو لوگوں کے دستخطوں کے شوقین تھے، اور جب کبھی موقعہ ملتا تھا تو لوگ دنیا کے مشہور چیمپین لوگوں کے قریب سے درشن کرنیکے مشتاق رہتے تھے۔ میں بھی ہاتھ میں نوٹ بک اور پنسل لئے ادھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ اور اس فرحت بخش موضع میں جاکر میں نے کئی لوگوں سے بات چیت کی۔ ہاکی کے ہندوستانی کھلاڑیوں سے میں نے گفتگو کی، فرانسیسی کھلاڑیوں سے جاکر ملا اور جاپانی پیراکوں سے بات چیت کی غرض اس طرح میں نے دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کے نمائندوں سے ملاقات کی۔

میں نے ڈچ جزائر شرق الہند کے مشہور پیراک ہانس ہاسمین سے بھی دو دو باتیں کیں، جو ایک طول طویل سیاحت طے کرکے اولمپک کھیلوں میں آئے تھے۔

سب سے پہلا سوال میں نے ان سے یہ کیا:۔ کہ یہ تو فرمائیے کہ آپ پورے طور سے تندرست ہیں؟

ہانس نے مسکرا کر جواب دیا کہ "یقیناً اب سے پہلے میں کبھی اس سے زیادہ تندرست تھا۔"

میں نے کہا کہ "یہ درست ہے لیکن جزائر شرق الہند اور یہاں کے ٹمپریچر کے فرق کا تو آپ پر یقیناً اثر ہوا ہوگا میرا مطلب یہ ہے کہ آب و ہوائی تبدیلی کا اثر تو لازمی ہے؟"

اُس نے ہنس کر کہا کہ "دوست من! اسکا کوئی تردد نہ کیجئے ہندوستان میں بھی ہمیں اس قسم کی مشکلوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مجھے کبھی مطلق کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے"۔ اس کے بعد وہ کسی قدر سنجیدگی سے کہنے لگا کہ "اس کیلئے تو ہمیں خود اپنا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اور مجھے اس کے کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ اگر مجھے اس ملک میں جاڑے بھر مشق کرنیکی ضرورت ہو تو اس موسم میں جو انفلوئنزا کیلئے مشہور بلکہ بدنام ہے، مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا اور مجھے اسکا کوئی خوف ہوگا۔ آپ کچھ سمجھے بھی؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بالکل محفوظ ہیں، ہم معمولی طور پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خوراک یا کسی بات میں بھی تبدیلی نہیں کرتے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات ہر اسپورٹسمین کو ضرور معلوم ہونی چاہئے، ہم روزمرہ تھوڑی سی مقدار کونین کی ضرور استعمال کرتے ہیں، بالکل تھوڑی سی، یعنی روزانہ تین گرین سے زیادہ نہیں کھاتے مگر اسکا خوب اثر ہوتا ہے، یہ انفلوئنزا اور زکام سے محفوظ رکھنے والی اصلی چیز ہے۔ اگر ہر ملک کے اسپورٹسمین انفلوئنزا کے موسم میں ایسا ہی کریں، تو صاحب فراش ہونیکے بجائے، بہت سے نوجوان زکام یا انفلوئنزا کی حالت میں کھیل کے میدان میں آتے دکھائی دیں گے۔ بہرحال ..... مگر معاف فرمائیے اب اسٹیڈیم جانیکی میری باری آگئی۔

یہ کہکر ہانس قدم بڑھاتے ہوئے چلا گیا۔

اطلاعنامہ بغرض اعلان و اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ ۱۹۳۴ء)

بعدالت اسپیشل جج صاحب بہادر ضلع کھیری درجہ دویم مقام لکھیم پور

انکمبرڈ دیوانی مقدمہ نمبری نمبر ۶ ۱۹۳۶ء

گنگا دھر ولد باجی لال قوم برہمن ساکن موضع بھڑسریا پرگنہ و ضلع کھیری قرضدار سائل

بنام مہابیر پرشاد وغیرہ قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ گنگا دھر ولد باجی لال برہمن ساکن موضع بھڑسریا ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہٰذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ گنگا دھر سائل مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے

اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعوی رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونیکی تاریخ سے تین ۳ ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۲۶ اپریل ۱۹۳۶ء جاری ہوا۔

مہر عدالت — دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دویم ضلع کھیری

تنبیہ:- فہرست ہائے (الف) و (ب) اور جوڈیشل فارم نمبر پی ۲۹ پارٹ ۲ (الف) ہمراہ اس اطلاعنامہ کیساتھ بھیجی جاویگی۔
اوقات حاضری عدالت دس بجے دن سے ۴ بجے شام تک۔

فہرست ہائے جائداد پیش کردہ قرضدار حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۸ و پیش کردہ قرضخواہ حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۱۰ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

فہرست (الف) — قرضدار کے حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی

نمبر شمار	ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل قابل وراثت و قابل انتقال حقیقت کی تصریح	وسعت حقیقت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیقت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	کیفیت
۱	کھیری	زمینداری	محال لکرہا موضع کیرت پور پرگنہ کھیری	قابل وراثت و قابل انتقال	حقیت اعلیٰ مندرجہ کھیوٹ رجسٹر نمبر ۳ تعدادی مع ایکڑ ۹۲ ۲/۳ ڈسمل و حصہ منجملہ محال لکرہا موضع کیرت پور پرگنہ کھیری	۵ مالگذاری ۱۲ ابواب	
۲	"	باغ	موضع بھڑسریا پرگنہ کھیری	"	درختان باغ بلا اراضی ۵ قطعہ کا حصہ	بلا لگان	
۳	"	مکان مسکونہ	"	"	یک قطعہ مکان مسکونہ پختہ و خام کا حصہ	بلا لگان	

فہرست ب اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

فہرست (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثنا حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی دفعہ ۶ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرقی اور نیلام ہوسکتی ہے

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیت درخواست دہندہ	کیفیت
۱	گائیں	دو راس	
۲	تختہ چوبی شکستہ	یک عدد	
۳	ڈگریات بقایا لگان خلاف مسمیان جگن سنگھ جھاڑو و گھسیٹے و گیارو وغیرہ	۴ قطعہ	

تفصیل جائداد مندرجہ بیان تحریری مہاجنان (دندا ر د)

(مہر عدالت) دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

۵۰۶

اطلاعنامہ بغرض اعلان و اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ ۱۹۳۴ء)

بعدالت جناب پنڈت برجناتھ ذوتشی اسپیشل جج صاحب بہادر کھیری درجہ دوم مقام لکھیم پور

مقدمہ نمبر ۵۶ ۱۹۳۶ء پیشی ۲۲ جولائی ۱۹۳۸ء

(۱) رام چرن لال ولد شنکر لال
(۲) سوامی دیال ولد رام چرن لال } قوم کایستھ ساکن پسگوان پرگنہ پسگوان ضلع کھیری قرضدار سائل

بنام

(۱) بہادر لال
(۲) بچو لال } پسران لال جی } قوم کایستھ
(۳) مادھو رام ولد شادی لال
(۴) بابو رام
(۵) گنگا دھر
(۶) سوامی دیال } پسران شیو چرن لال قوم کایستھ
(۷) گوکل ساہ ولد سوبھا رام قوم کلوار

} ساکن پسگوان پرگنہ پسگوان ضلع کھیری قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ رام چرن لال ولد شنکر لال و سوامی دیال ولد رام چرن لال قوم کایستھ ساکن پسگوان ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا حسب دفعہ ۱۱ (ضمن ۱) ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ رام چرن لال وغیرہ مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعویٰ رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی

زمانہ

جلد ۷۰ — اپریل ۱۹۳۸ء — نمبر ۴

اُردو ہندی ہندستانی

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے)

افسوس کا مقام ہے کہ اس زمانہ میں آکر ایک کثیر التعداد جماعت میں اُردو کا وہ مفہوم ہوگیا ہے جس سے ہندوؤں کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اُردو کا یہی مفہوم اس مخالفت کی بنا ہے جس نے اُردو ہندی کا قضیہ پیدا کر رکھا ہے۔ اُردو کا یہ مفہوم کیوں پیدا ہوا؟ اس کے اسباب تشریح طلب ہیں۔

اُردو زبان کا خمیر جس طرح تیار ہوا اُس کی بحث یہاں کسی محققانہ صراحت کی محتاج نہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ اس زبان کے عناصر کی ابتدا فارسی، عربی اور دیسی بھاشاؤں کے میل جول سے ہوئی، اس کے ابتدائی نمونے لفظاً و معنیً ظاہر کرتے ہیں کہ اس زبان کے بننے میں ہندو مسلم ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی زندگیوں کا میل جول ہو رہا تھا، ایک مدت تک اُردو کی یہی صورت رہی بہت تھوڑی سی ارتقائی اصلاح کے ساتھ ابتدائی مصنفین کے یہاں سے بہت سی شہادتیں اس قسم کی پیش کی جا سکتی ہیں جن سے دونوں قوموں کی باہمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور عربی فارسی کے ساتھ ہندی الفاظ بھی بکثرت مستعمل پائے جاتے ہیں اس لئے کہ ہندوؤں کی معاشرت و مذہب کے اظہار کے لئے ہندی یا بعض اوقات مقامی

نوٹ: اگر کوئی صاحب اِس مضمون کا جواب تحریر فرمائیں تو مجھے رسالہ میں اشاعت کے لئے بھیجیں تاکہ میں اُن کے خیالات سے اپنی معلومات کی جانچ کر سکوں، اور اگر کسی دوسرے پرچہ میں اشاعت ہو تو اُسکے ایڈیٹر براہ کرم اسکی ایک کاپی میرے پاس بھیجیں۔ منشی شیام موہن لال جگر بریلوی

بھاشاؤں سے امداد لینا ناگزیر ہے۔ سودا، میر اور انشا کے زمانہ تک اُردو نے اپنی یہ خصوصیت قائم رکھی۔ ان بزرگوں کے یہاں ایسے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں جو براہ راست نیز ضمنی طور پر ہندوانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں، اس خصوص میں نظیر اکبرآبادی سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس نے اس زبان سے وہ کام لیا ہے جو ایک شاعر کو بہ حیثیت ایک بڑی قوم کے نزدیک انجام دینا چاہیئے۔ اُس نے ہندو اور مسلمان دونوں کے رسم و رواج میلوں، ٹھیلوں، تقریبوں اور تیوہاروں، نبیوں اور اوتاروں، مذہبی عقیدوں، غرض بے شمار حالات کو اپنی نظموں کا جامہ پہنا کر اور اُنھیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرکے ایک تاریخی حیثیت عطا کردی ہے، اور اُردو زبان کو صحیح معنی میں ہندوستانی شاعری سے مالا مال کیا ہے۔ اس کے قلم نے اس زبان سے تمام لسانی فرائض ادا کرائے ہیں، یعنی اُس کا کلیات ہندو مسلم معاشرت کا مشترکہ طور پر آئینہ دار ہے۔

زبان اور ادب کے یہی معنی ہیں کہ وہ اپنی قوم کے ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی، دماغی اور روحانی کیفیتوں کے امین، اور اُن کی تدریجی نشو و نما کے ضامن و معاون ہوں۔ اُردو اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اس کو بھی ہندوستان جیسے وسیع ملک کی زبان بننے کے لئے دونوں قوموں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنا ہوگا۔ جب اس اصول کے پیش نظر اُردو کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ انشا کے بعد اُردو کی اصلاح کچھ اس طریقہ پر شروع ہوئی کہ ہندو عناصر اُس سے خارج ہوتے گئے۔ مستقل طور پر اور براہ راست اس طرف کس کو توجہ ہوتی کہ ہندو زندگی کے کسی پہلو کو مطمح نظر بنایا جائے۔ ہندی الفاظ کے ذریعہ ضمنی طور پر اس معاشرت کی جو بو باس بھی کہیں آجاتی تھی وہ بھی ترک و اخراج کی زد میں آگئی۔ علامہ کیفی اپنی کتاب منشورات کے صفحہ ۱۳۵ پر لکھتے ہیں:-

> "اُب تک ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ فلاں لفظ فلاں ترکیب فصحا یا اکثر فصحا نے ترک کردی۔ کوئی پوچھے کہ حضرت آخر اس ترک کی وجہ؟ تو جواب ندارد، یہ کبھی ظاہر نہ ہوا کہ فصاحت و فصیح کی تعریف کیا قرار دی گئی ہے؟ اس کا معیار کیا ہے؟ اس کے موازنہ کے کیا اصول ہیں؟ مزاج کی سودائیت نے ایک حساسی کیفیت پیدا کرکے قوت ممیزہ کو ماؤف کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہر شے میں آدم بو کا مضمون صورت پذیر ہوگیا۔ نہ لفظ کی صرفی ماہیت پر نظر کی گئی نہ اُس کی معنوی اہمیت کا لحاظ ہوا اور خرج بخرج ترک پیر کسی گردان شروع ہوگئی۔"

ہندی الفاظ بہت زیادہ اس گردان کا نشانہ بنے، مولانا حالی اپنے مقدمہ "شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں:-

"ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیم نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی تو اسی وقت قدرتی طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق اور فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان میں فوقیت حاصل کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی دلی کی زبان میں کوئی مابہ الامتیاز پیدا کرے........ خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا"

مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند حصہ اول کے صفحہ ۱۹۱ پر "متوسطین کا پہلا دور" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"جہاں تک ممکن ہوا فارسی اور عربی زبان کے الفاظ استعمال کئے اور ہندی اور بھاکا کے الفاظ کو چھوڑ دیا"

ایک طرف تو یہ کوشش رہی، دوسری طرف یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اُردو کی داغ بیل ڈالنے اُس کو پروان چڑھانے اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلانے کے لئے جو خدمتیں انجام دیں اُن کا کسی نے اعتراف نہیں کیا۔ اور جو تصانیف اُن کے قلم سے نکلیں اور عظیم الشان مذہبی کتابوں کے جو ترجمے اُنھوں نے کئے جن کی بدولت اُردو کی غیر متوقع طور پر اشاعت ہوئی وہ سب دریا بُرد ہو گئے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو ادب کلیتہً ہندوؤں کی قومی خصوصیات سے خالی ہو گیا ایک زمانہ سے اُردو ادب جس چیز سے عبارت ہے وہ چند ناموں پر ختم ہو جاتا ہے نظم میں میر، سودا، غالب۔ ذوق۔ مومن۔ آتش۔ ناسخ۔ امیر۔ داغ۔ انیس۔ دبیر۔ اور نثر میں شرر۔ حالی۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ سر سید وغیرہ۔ اب بتایا جائے اِن حضرات کی کونسی تصنیف سے ہندوؤں کی خصوصیاتِ زندگی کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑتی ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اُردو کا وہی مفہوم صحیح ہے جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا یہ جواب کوئی معقول پسند آدمی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوؤں میں اس پایہ کے مصنف نہیں ہوئے جن کا شمار اِن حضرات کے ساتھ کیا جائے۔ ہندوؤں میں بھی ہر دور میں صفِ اول کے اور نہایت بلند پایہ شعرا اور انشا پرداز ہوئے ہیں اور اس وقت بھی

موجود ہیں، لیکن وہ سب برادرانِ وطن کی بے اعتنائیوں اور تعصبات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ایک ہندو شاعر رابندرناتھ ٹیگور کالیداس کی طرح مشہورِ آفاق ہے اور دنیا کے چند بہترین شعرا میں ممتاز خصوصیت رکھتا ہے، کیا اُردو میں آکر جس کو بعض مقامات میں انھیں اپنی مادری زبان کہنے کا حق حاصل ہے، ہندوؤں کی فطری ذہانت و ذکاوت اس قدر ضعیف ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ پست اور ناقابلِ توجہ حیثیت اختیار کئے رہیں۔ ہندوؤں نے جب فارسی اور انگریزی میں، جو ان کی زبانیں نہیں ہیں، عظیم المرتبت مشاہیر پیدا کئے تو اُردو میں قدرت وکمال حاصل کرنے کے لئے کون سے امور مانع ہو سکتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ اپنے طرز میں لکھتے ہیں جس میں ہندویت کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کس مپرسی اور بے اتفاقی کا شکار ہو کر بے نام و نشان ہو جاتے ہیں۔

ادھر ہندوؤں کی تصانیف کو دائرۂ ادب سے خارج کر دیا گیا، اُدھر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں سے ہندو مصنفوں کو نظر انداز کر دیا۔ ابتدائی جو تذکرے لکھے گئے اُن میں کہیں کہیں ہندوؤں کی خدمات کا ذکر بھی ہے، اگرچہ اجمالاً، مثلاً "گلشنِ بےخار" میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے صد ہا مسلم شعرا کے ساتھ پچیس تیس ہندوؤں کو بھی نام نیک سے یاد کیا ہے لیکن ان کتابوں کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اُس میں اردو کو واحد موجد و مدون ماننے کی تمام بحث کی گئی ہے۔ اس بارہ میں محمد حسین آزاد صاحب "آبِ حیات" نے جو بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا وہی بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں کے لئے شمعِ ہدایت بن گیا۔ نسیم کا نام جو آبِ حیات سے [illegible] گیا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے بالکل بے موقع ہے جو آزاد کا مقصود تھا۔ اسی لئے ابتدا میں اسے متروک کر دیا گیا تھا[1] لیکن بعد کو کچھ سوچ سمجھ کر داخل کر لیا گیا۔ آبِ حیات اپنی دلکش [illegible] کے باعث بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے ساتھ یہ خیال بھی پھیلتا گیا کہ اُردو میں [illegible] ان چند شعرا کے جن کا ذکر اس کتاب میں ہے اور کوئی صفِ اول میں آنے کے قابل نہیں۔ "گلِ رعنا" بھی اسی قسم کا تذکرہ ہے۔ اس میں بجائے ایک کے تین چار ہندوؤں کے نام آ گئے ہیں۔ مگر محض ضمنی اور سرسری طور پر۔ مولانا عبدالسلام ندوی مؤلف "شعر الہند" نے بھی دو چار ہندوؤں کا ذکر [illegible] وہ اس طرح کہ تخلص ہے تو نام ندارد، لیکن اُنھوں نے جو کچھ تمہید کتاب میں لکھا [illegible] ایک حد تک اُن کے سر سے الزام جاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں

[1] ملاحظہ ہو آبحیات مطبوعہ وکٹوریہ پریس سنہ [illegible] اس میں نسیم کا [illegible]

قومی شاعری کے ضمن میں مسلمانوں کے تمام مشہور مذہبی، ملکی اور علمی کارنامے آ گئے۔ اس طرح اجمالی طور پر تاریخ اسلام کے تمام تاباں ابواب اُردو شاعری میں آ گئے"

حقیقت یہ ہے کہ عبدالسلام صاحب نے وہ بات صاف صاف کہہ دی جو آزاد اور ایسے ہی بہت سے تذکرہ نویس دل میں رکھتے ہیں، مگر جانب داری کے الزام سے بچنے کے لئے کسی ایک آدھ ہندو مصنف کے متعلق سرسری طور پر چند جملے یا دو چار سطریں لکھ کر یہ گمان پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مثالیں مستثنیات سے ہیں۔ گویا عام طور پر ہندوؤں کو اُردو سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اگر ہے بھی تو کوئی خاص فضیلت حاصل کر نا تو جا۔

مسٹر عبدالقادر سروری کی کتاب جدید اُردو شاعری میں تنقیدی نظر سے انکار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف اپنی کتاب انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آن اُردو لٹریچر میں فرماتے ہیں "اُردو ادب خالصتہً مسلم سرمایہ ہے"۔ ایسی ہی کتابوں سے ڈاکٹر بیلی نے اپنی کتاب ہسٹری آف اُردو لٹریچر مرتب کی اور ہندوؤں کی حق تلفی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ صرف چند کتابوں کا سرسری طور پر ذکر کر دیا گیا ورنہ یہ کس مپرسی کی داستان بہت طولانی ہے۔

ایک طرف زبان اُردو کے تذکرہ نویسوں اور ادب کے علم برداروں کا ہندوؤں کے ساتھ یہ سلوک ہے۔ دوسری جانب ہندوؤں میں اپنے دعوؤں کے پیش کرنے اور منوانے کا مادہ بہت کم ہے۔ اور اگر کسی نے ایسی جرأت کی بھی تو اس کا حشر وہی ہوتا ہے جس کی ہوس ناک تمنا ہے۔ تقسیم ہے۔ بد قسمتی سے جب کبھی ہندو مسلم شاعروں کے مقابلہ کی بات چھڑ جاتی ہے تو یہی بحث چھڑ جاتا تنقیدی شعبہ میں کثرتاً گزرے ہے تو جو حالت پیش آتی ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ سب سے قطع نظر یہ کہ کھلے الفاظ میں کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو اُردو لکھنا نہیں آتا۔ ابھی چند سال ہوئے نیاز فتحپوری نے ہندستانی اکیڈمی کی مطبوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ادھر اُردو ادب نے ہندوؤں سے زبردستی قطع تعلق کر لیا۔ اُدھر سیاسی بیداری کے ساتھ ہر فرقہ میں اپنی انفرادی اجتماعیت قائم رکھنے کے خیالات و جذبات موجیں مارنے لگے

The influence of English Literature on Urdu L...
by Dr. Syed Abdul Latif. 1924.
Urdu Literature is essentially a Mohammedan...
History of Urdu Literature by T. Grahame Bailey

ہندو مسلمان دونوں کو جدا جدا اور بجا طور پر یہ احساس ہونے لگا کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو اپنی زبان، تمدن اور مذہب کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مسلمانوں نے جب اُردو کو اس نظر سے دیکھا تو بڑے اطمینان کی سانس لی۔ اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معاشرتی اور مذہبی راہوں پر اس کی ترقی میں منہمک ہو گئے جس کو اُس طبقہ کی سرگرمیوں نے دوبالا کر دیا جو مسلم انڈیا اور پان اسلامک تحریکوں کا موید و حامی ہے اور جو اقبال کی طرح مولانا عبدالحق کے الفاظ میں ہنود سیرت مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتا۔ ہنود سیرت بہت معنی خیز لفظ ہے جس میں تمام ہندوانی عناصر معہ زبان کے شامل ہیں۔ اسی معنی میں آجکل "بندے ماترم" کے خلاف شورش پیدا ہو رہی ہے۔ ایسے رجحانات نے ایک گروہ کو اُردو میں عربی فارسی کے سنگین الفاظ لکھنے پر مستعد و مصروف کیا ہے یہ لوگ بھوک ہڑتال کی جگہ "مقاطعہ جوعی" تھرمامیٹر کی جگہ "مقیاس الحرارت" وھائٹ پیپر کی جگہ "قرطاس ابیض" اخبار کی جگہ "جریدہ" رسالہ کی جگہ "مجلہ" وغیرہ وغیرہ لکھنے اور بولنے کو اپنا دین و ایمان سمجھنے لگے۔ اسی تعلق سے اخباروں کے نام بھی تجویز کئے جانے لگے، مثلاً الہلال۔ الخلیل البشیر۔ البدر۔ الامان۔ الناظر۔ الواحد وغیرہ وغیرہ۔

ہندوؤں نے جب اُردو ادب کو اپنے معاشرتی خصوصیات کے اعتبار سے جانچا تو میدان صاف نظر آیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی علم ہوا کہ اُن کے اسلاف کی ساری کمائی خاک میں ملا دی گئی تو ایک طرف رنج اور دوسری طرف غصہ سے بیتاب ہو گئے۔ اتنی توفیق اور ہمت تو ان کو ہوئی نہیں کہ جن بزرگوں نے اپنی ساری عمر صرف کر کے اُردو کو رواج دیا، اُس کے شعر و ادب کی ترقی میں برادران وطن کے دوش بدوش اور صف بہ صف منہمک کار رہیں، اُن کے ادبی کارناموں کو زندہ کریں اور اُن کے مراتب و حقوق دنیائے ادب میں تسلیم کرائیں۔ اب جو غم و غصہ کا غلبہ ہوا تو فرمانے لگے "بی اُردو ہم نے تم سے قطع تعلق کیا تم اب دوسرے کی ہو گئیں" اس بھولے پن کے قربان اور اس رقابت کے تصدق! لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا، اس جوش غضب میں ہندی کے ساتھ آپ کی محبت کے پینگ بڑھنے لگے۔ ہندی اپنی رنگینی و لطافت سے اپنے پریمیوں کو لبھانے میں محو تھی، اب جو آپ کی نظر التفات ادھر منعطف ہوئی تو چند ہی دن میں اُس کی خوش قامتی بدہیئتی سے بدل گئی اور اس کے جسم پر موتیوں اور پھولوں کے ہار کی جگہ سونے کے ڈھیلے لٹکتے نظر آنے لگے جب دونوں طرف سے افراتفری شروع ہوئی اور ہندی اور اُردو ایسے قالب میں ڈھالی جانے لگی جس میں ڈھلکر دونوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ اتنے وسیع ملک

کی واحد زبان بن سکے تو مدبرین سیاست نے ایک ایسی زبان کی طرح ڈالنے کی تجویز نکالی جو ہندوستان سے مختلف الحالات خطہ کی زبان ہو سکے۔ اگر وہ اس کو اُردو کا نام دیتے ہیں تو اُردو کے ہاتھوں ستم رسیدہ ہندوؤں کے زخم پر نمک چھڑکتے ہیں، اور اگر اسے ہندی کہتے ہیں تو مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ لہذا اس کا ایک تیسرا نام یعنی "ہندوستانی" تجویز کیا گیا۔ اس تجویز سے اُردو ہندی کا قضیہ تو مٹ سکتا ہے لیکن کیا اس سے وہ اسباب بھی مٹ جائینگے جن کے ذریعہ اُردو ادب سے ہندوؤں کا اخراج ہوا۔ اور جن کو اب فرقہ وارانہ بقائے حیات کی جدوجہد سے تقویت پہونچ رہی ہے۔ بہرحال اگر ہندو اُردو سے اپنا تعلق قطع کرنا چاہتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ اپنے بزرگوں کی بہت بڑی کمائی کو دریا میں ڈال رہے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ ابھی تک بعض حضرات یہی دخوش کن الاپ الاپے جاتے ہیں کہ

"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

اُردو زبان پر ہندوؤں کا اتنا ہی حق اور دعویٰ ہے جتنا مسلمانوں کا اور انصاف پسند اہل اسلام اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت احمد علی شوق مرحوم مباحثہ گلزار نسیم میں لکھتے ہیں:

"اُردو زبان جہاں رواج پائے ہوئے ہے وہاں فطرتاً ہندو اور مسلمانوں میں مشترکہ ہے۔ ہندو اس کے مقلد نہیں ہیں بلکہ جس طرح مسلمانوں کو اس پر دعوے کا حق حاصل ہے اسی طرح ہندوؤں کو بھی حاصل ہے۔ فارسی جو مسلمانوں کی زبان تھی اور ہنود جس کے مقلد تھے اس میں بھی ٹیک چند بہار، سارعجم، رائے رایان آنند رام مخلص، موص رائے عشرت، چندر بھان برہمن، بھوپت رائے بیغم نیز اور ارباب کمال نے کیسی کیسی بلند نامیاں حاصل کی ہیں۔ آخر کس کس کے کمال پر پردہ ڈالا جائیگا۔"

حقیقت کو ماننے والے کم ہیں، اور علانیہ اس کا اظہار کرنے والے تو النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں، ورنہ آج کوئی یہ نہ کہتا کہ اُردو میں ملکی زبان ہونے کی صلاحیت نہیں اور اُس کو ملک کی عام زبان نہ بنایا جائے۔

مجھے یہی ذوق آباواجداد سے ورثہ میں ملا اور کم و بیش بیس پچیس سال سے اُردو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ قدرتی طور پر میں اُردو زبان کا حامی ہوں اور رہونگا۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ خود ہندو اُسے دریا میں ڈال دینے کو تیار ہو گئے ہیں تو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ میرا

ملاحظہ ہو مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ نولکشور پریس۔

عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہندو مشاہیر ادب کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کیا جاتا، اور اُن کے
حقوق و مراتب کشادہ دلی کے ساتھ تسلیم کئے جاتے رہے ہوتے اور اُردو ادب اُن کی معاشرت
تمدن اور مذہب کا بھی سرمایہ دار ہوتا تو آج اُردو کی جگہ کسی دوسری زبان کی ضرورت لاحق نہ ہوتی
اور یقیناً یہ وہ زبان ہوتی جس کے ذریعہ دونوں قوموں کے باہمی میل جول، خلوص اور یگانگت کو
تقویت پہونچتی اور قدرتی طور پر ایک طرف "عربیرانی" کے غلبہ سے یہ محفوظ رہتی اور دوسری طرف
سنسکرت کی منشین بھرمار سے۔ اس کے اصول و قواعد بھی اس قدر تنگ نہ ہوتے جتنے کہ اُردو
کے ہیں۔ اُس وقت اُردو وہی اُردو ہوتی جس کا ہیولا اُن کے ہاتھوں نے تیار کیا تھا اور اگر
میری سمجھ غلطی نہیں کرتی تو یہی اُس زبان سے مراد ہے جس کو "ہندوستانی" نام دیا جارہا ہے۔

یہاں تک تو وہ واقعات بیان کئے گئے جن کے باعث اُردو نے ہندوؤں سے اپنا رشتہ
ہی کمزور نہیں کرلیا بلکہ اُن کے حقوق تسلیم کرنے سے بھی انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر ہندوؤں کو
کسی دوسری زبان کا دامن پکڑنے کی مجبوری پیش آگئی۔ ادھر یہ مجبوری اُدھر روزافزوں اقتصادی
اور سیاسی سرگرمیوں نے اُس زبان کو جس سے اُردو ادب عبارت ہے بہت تنگ و کوتاہ پایا۔
آزادی کی تحریک، خودمختارانہ حکومت کا احساس، ہندوستان کی بین الاقوامی حیثیت، سائنس
کے انکشافات، صحافت کی توسیع، تجارتی جدوجہد، ریڈیو اور ٹاکیز کی دلچسپیاں وغیرہ وغیرہ، یہ
تمام باتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بحیثیت قوم ہندوستانیوں کا ایک متحدہ مفاد قائم ہو،
جس کی تشکیل و ترقی سارے ملک کی ایک زبان مقرر ہوئے بغیر بالکل ناممکن ہے۔ یہ ضروریات
ایسی زبان چاہتی ہیں جو ہر صوبہ میں بولی اور لکھی جاسکے۔ اور جو بڑھتی ہوئی جمہوری بیداری کی
ہر قسم کی ترقی کا آسان ذریعہ بن سکے یعنی مُلکی ترقی کی جو راہیں آئندہ کُھلیں اُن کو ہر گوشے کے
لوگ ایک ہی زبان میں بیک وقت سمجھ لیں اور محسوس کرلیں۔ ایسی زبان کو مقامی
بھاشاؤں سے بھی بہناپا نباہنا شرط ہے اور انگریزی کو بھی چھوت نہ ماننا ہوگا۔ اس لئے کہ
موجودہ دنیا کی ہنگامہ آرائی کی جو کچھ خفیف سی لہر بھی ہمارے یہاں آئی ہے وہ اسی زبان کا
صدقہ ہے۔ جس کے بہت سے الفاظ اور تراکیب یا تو اُردو یا ہندی میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتے۔
اور اگر ہو جاتے ہیں تو عام فہم نہیں رہتے۔ جس روپ میں اُردو ہمارے سامنے اب تک آتی رہی
ہے ظاہر ہے کہ اُس روپ میں وہ تمام وطنی مطالبات پورے نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ارباب حل وعقد نے
روزافزوں قومی ارتقائے تقاضے سے مجبور ہو کر ایک ایسی زبان تجویز کی جو ان تمام مطالبات کو

پورا کر سکے اور اس کا نام ہندوستانی رکھ دیا۔ اب رہا رسم الخط کا سوال اس کا مفصل جواب تو ایک جداگانہ مضمون کا محتاج ہے۔ لیکن اردو سے متعلق بحث کے سلسلہ میں یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ فارسی رسم الخط سے ہندی رسم الخط زیادہ آسان ہے اور آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے لیکن میں فارسی طریقہ کا بھی حامی ہوں کہ وہ بھی ایک چیز ہے۔

یہاں تک تو اردو کے متعلق تھا، اب ہندوستانی کے متعلق بھی چند معروضات ہیں۔ جو ارباب حل وعقد کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی کو ہندو مسلم رہنمایانِ ملک کے اتفاق رائے سے ملک کی عام زبان بنایا جانا طے کر دیا جائے۔ تو چند امور فوری غور و توجہ کے محتاج ہیں۔

اوّل یہ کہ ہندوستانی کے ساتھ ساتھ اردو بھی ملک میں رائج رہیگی۔ مسلم برادران وطن کی ایک جماعت انھیں راہوں پر اس کی ترقی میں سرگرم رہیگی جن کا ذکر "مقیاس الحرارت" وغیرہ الفاظ کے ساتھ کیا گیا۔ یہ طبقہ کبھی ہندوستانی کو رواج دینے کا حامی نہ ہوگا۔ بلکہ اُن کی مساعی ہندوستانی کے خلاف ہونگی، اُن کی جد و جہد یہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی کو بھی اردو نما عربی یا عربی نما اردو میں جذب کر دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی ملک کے لئے کوئی نئی زبان تجویز کر دینا بہت آسان ہے لیکن اس کے ضوابط و قواعد مرتب کرنا اور رواج دینا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی کوئی نئی زبان نہیں، یہ وہ زبان ہے جو اردو اپنے ابتدائی عہد میں تھی اور کہلاتی بھی تھی، اور جس کو ہندی اور اردو جاننے والے دونوں عام طور پر بولتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن جن ضروریات نے مدبرین سیاست کو آج اسے اردو سے جداگانہ نام اور نوعیت دینے پر مجبور کیا ہے وہی اس بات کی بھی مقتضی ہیں کہ اس کے ضوابط و قواعد بھی از سر نو مرتب کئے جائیں، ورنہ اس میں ادب کیونکر پیدا ہو سکے گا۔ اور اگر اس میں علم ادب نہ ہوگا تو یہ زبان کس مصرف کی ہوگی محض کونسل اور اسمبلی یا پلیٹ فارموں کی تقریروں تک اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کا ادب بھی مدوّن ہوگا جیسا کہ لازمی ہے تو یقیناً اردو کی صرف ونحو اور فنِ شعر کی یہ کلیتہً ماتحت نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے بعض صورتوں میں خصوصاً شعر میں اردو کے اصول ہندوستانی کے لئے بہت تنگ اور مانعِ ترقی ثابت ہونگے۔

تیسری بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندو ادیب اور شعراء بھی

اہل زبان کی حیثیت سے اپنی تصنیفات کا اعتماد کریں اور اس کی مدرجہ بدرجہ ترقی کی تاریخ سے اپنی خدمات کو محو سہوتے دیں، جیساکہ اُردو کی تاریخ میں اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں کے لئے جو نصاب مرتب ہوں وہ دونوں قوموں کی مشترکہ خصوصیات کے اعتبار سے مرتب ہوں اور ہندو و مسلم دونوں مصنفوں کے مضامین اُن میں برابر شامل ہوں۔ جو ادارے اور انجمنیں اس زبان کی ترویج و ترقی کے لئے حکومت کی جانب سے قائم ہوں اُن کی پہلی غرض و غایت متحدہ قومیت کا مفاد ہو اور مشترکہ مقصد اُن کا مطمح نظر۔ دونوں قوموں کے ادیبوں اور مصنفوں کی نمایندگی اُس میں پُورے طور پر ہو، اگر یہ نہ ہوا تو چند ہی دَور گزر جانے کے بعد ہندوستانی بھی اُسی راہ پر چلتی نظر آئیگی جس پر اُردو چل کر ہندوؤں سے بالکل غیر ہوگئی۔ اور کارکنان سیاست کو پھر کسی تیسری زبان کی فکر دامنگیر ہو گی۔

رندِ لااُبالی

(شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

(حال میں ہماری خوش نصیبی حضرت جوشؔ کو دو روز کے لئے کانپور کھینچ لائی تھی، یہ چند اشعار اسی کرم فرمائی کی یادگار ہیں۔ ایڈیٹر)

تجھے کیا فصلِ گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ اِک دولتِ بیدار ہے ساقی

تری خدمتگذاری کا شرف حاصل ہو جب تک
یہ سُنتا ہوں کہ بیداری بہت دشوار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مدارا کر
کہ عقلِ انسان کی اِک عمر سے بیمار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اِک لرزہ براندامِ بے دینی
مرا اقرار اِک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لااُبالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

داغِ دل

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے ایل ایل بی، وکیل)

آہ یہ داغِ دلِ دیوانہ ہے — یا خمارِ بادۂ مستانہ ہے
میکدے کی ہے صدائے بازگشت — یادگارِ شورشِ رندانہ ہے
عیشِ رفتہ کا کوئی پیغام ہے — یا غم و اندوہ کا پروانہ ہے
زیست ہے ناکامیوں کی داستاں — داغِ سوزاں سرخیِ افسانہ ہے
آہ اے داغِ دلِ حسرت نصیب — تو خزف ہے یا دُرِ یک دانہ ہے
اک گُلِ عشرت ہے مرجھایا ہوا — یا شرابِ عشق کا پیمانہ ہے
دوست ہے یا دشمنِ جانِ حزیں — آشنائے دل ہے یا بیگانہ ہے
گو کیا ہے تو نے خونِ آرزو — دل نشیں تو صورتِ جانانہ ہے

جلوہ گر ہے یوں دلِ بیمار میں
پھول ہو جیسے کوئی گلزار میں

اے شبیہِ لطفِ ایامِ نشاط — ابتدائے رنج و انجامِ نشاط
یاد آجاتی ہے تجھکو دیکھ کر — لذتِ صہبائے گلفامِ نشاط
جی میں آتا ہے کہ صحنِ باغ میں — باندھیئے پھر چل کے احرامِ نشاط
حسرت آباد جہاں میں کس قدر — دل رُبا ہے حلقۂ دامِ نشاط
ہے یہی بہتر کہ بزمِ دہر میں — گوش ہوں مہجورِ پیغامِ نشاط
مستیِ رنج و الم کے سامنے — ہیچ ہے صہبائے گلفامِ نشاط
شاد زی! اے داغِ سوزاں، شاد زی! — دل نہیں اب طالبِ جامِ نشاط

تیرے ساغر کو دعا دیتا ہوں میں
سوز کے کیا کیا مزے لیتا ہوں میں

اہل زبان کی حیثیت سے اپنی تصنیفات کا اعتماد کریں اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی کی تاریخ سے اپنی خدمات کو محو نہ ہونے دیں، جیسا کہ اُردو کی تاریخ میں اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں کے لئے جو نصاب مرتب ہوں وہ دونوں قوموں کی مشترکہ خصوصیات کے اعتبار سے مرتب ہوں اور ہندو و مسلم دونوں مصنفوں کے مضامین اُن میں برابر شامل ہوں۔ جو ادارے اور انجمنیں اس زبان کی ترویج و ترقی کے لئے حکومت کی جانب سے قائم ہوں اُن کی پہلی غرض و غایت متحدہ قومیت کا مفاد ہو اور چونکہ مقصد اُن کا مطلع نظر دونوں قوموں کے ادیبوں اور مصنفوں کی نمایندگی اُس میں پورے طور پر ہو۔ اگر یہ نہ ہوا تو چند ہی دور گزر جانے کے بعد ہندوستانی بھی اُسی راہ پر چلتی نظر آئیگی جس پر اُردو چل کر ہندوؤں سے بالکل غیر ہو گئی، اور کارکنانِ سیاست کو پھر کسی تیسری زبان کی فکر دامنگیر ہو گی۔

رندِ لاأبالی

(شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

(حال میں ہماری خوش نصیبی حضرت جوشؔ کو دو روز کے لئے کانپور کھینچ لائی تھی، یہ چند اشعار اسی کرم فرمائی کی یادگار ہیں۔ ایڈیٹر)

تجھے کیا فصلِ گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی　　تو خود اپنی جگہ اِک دولتِ بیدار ہے ساقی

تری خدمتگذاری کا شرف حاصل ہو جب تک　　یہ سنتا ہوں کہ بیداری بہت دشوار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو　　کہ سطحِ ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مدارا کر　　کہ عقلِ انسان کی اِک عمر سے بیمار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اِک لرزہ براندامِ بے دینی　　مرا اقرار اِک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاأبالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

داغِ دل

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی، وکیل)

آہ یہ داغِ دلِ دیوانہ ہے — یا خمارِ بادۂ مستانہ ہے
میکدے کی ہے صدائے بازگشت — یادگارِ شورشِ رندانہ ہے
عیشِ رفتہ کا کوئی پیغام ہے — یا غم و اندوہ کا پروانہ ہے
زیست ہے ناکامیوں کی داستاں — داغ سوزاں سُرخیِ افسانہ ہے
آہ اے داغِ دلِ حسرت نصیب — تو خزف ہے یا دُرِ یک دانہ ہے
اِک گُلِ عشرت ہے مرجھایا ہوا — یا شرابِ عشق کا پیمانہ ہے
دوست ہے یا دشمنِ جانِ حزیں — آشنائے دل ہے یا بیگانہ ہے
گو کیا ہے تو نے خونِ آرزو — دل نشیں تو صورتِ جانانہ ہے

جلوہ گر ہے یوں دلِ بیمار میں
پھول ہو جیسے کوئی گلزار میں

اے شبیہِ لطفِ ایّامِ نشاط — ابتدائے رنج و انجامِ نشاط
یاد آجاتی ہے تجھکو دیکھ کر — لذّتِ صہبائے گلفامِ نشاط
جی میں آتا ہے کہ صحنِ باغ میں — باندھیئے پھر چل کے احرامِ نشاط
حسرت آبادِ جہاں میں کس قدر — دل رُبا ہے حلقۂ دامِ نشاط
ہے یہی بہتر کہ بزمِ دہر میں — گوش ہوں مہجورِ پیغامِ نشاط
مستیِ رنج و الم کے سامنے — ہیچ ہے صہبائے گلفامِ نشاط
شادزی! اے داغِ سوزاں، شادزی!! — دِل نہیں اب طالبِ جامِ نشاط

تیرے ساغر کو دُعا دیتا ہوں میں

دیکھنے میں گرچہ داغِ دل ہے تو — درحقیقت زیست کا حاصل ہے تو
سہل کر دیں جس نے سب دشواریاں — وادیٔ ہستی میں وہ مشکل ہے تو
سوزشِ غم سے ہے گو تیری سرشت — عشرتِ جاوید کا حامل ہے تو
رہروِ راہِ محبت کے لئے — اک چراغِ جادۂ منزل ہے تو
غرقۂ بحرِ غم و آلام کو — اک نویدِ راحتِ ساحل ہے تو
لیلیٔ پردہ نشیں کے واسطے — دل ہے محمل، پردۂ محمل ہے تو
مہرِ الفت ہے، نشانِ عشق ہے — سوزِ دل پر شاہدِ عادل ہے تو

محفلِ جاناں کے قابل ہو گیا
دل ترے الطاف سے دل ہو گیا

اعجازِ کلام

(از مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی۔اے)

خوش نقابی کی اتنی خو نہ کریں — آپ توہینِ رنگ و بو نہ کریں
انکھڑیاں خود ہیں مے فروش ان کی — خوگرِ ساغر و سبو نہ کریں
عشق ہے اک نمازِ صدق و خلوص — رند اندیشۂ وضو نہ کریں
اُن کا در ہے مقامِ محویت — کوئی آئیں تو ہا و ہو نہ کریں
وصل ہو یا فراق کچھ بھی ہو — چاہنے والے آرزو نہ کریں
مے کشی سے ممانعت، توبہ! — شیخ جی ایسی گفتگو نہ کریں
خامشی بھی ہے ایک خلوتِ راز — نہ کریں، مجھ سے گفتگو نہ کریں
مر مٹیں، جان دیں، مگر عاشق — کچھ کریں، شرحِ آرزو نہ کریں
میں وہاں ہوں، جہاں کہ میں بھی نہیں — ڈھونڈھنے والے جستجو نہ کریں
روئے رنگیں جو دیکھ لیں اُن کا — گل تمنائے رنگ و بو نہ کریں

آپ ہوں یا کلام یا کوئی اور
آج قضیہ ہی ایک سُو نہ کریں

ہندوستان کے بنک

(۴) مشترک سرمایہ دار بنک

(از مسٹر عبدالرحیم شبلی بی کام)

ہندوستان کی تجارت وصنعت ترقی پذیر ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بنکوں کا فروغ بھی ضروری ہے۔ لیکن گذشتہ اقساط میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پریسیڈنسی اور تبادلہ بنکوں پر بعض ایسی بندشیں لگائی گئی ہیں جو انھیں ہندوستان کی کاروباری ضروریات کو پورا کرنے کے ناقابل بنا دیتی ہیں۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مشترک سرمایہ داری کے اصول پر بنک قائم کئے جائیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ حصوں کی شکل میں عوام کے ہاتھ فروخت کیا جائے، اور تمام کاروبار اُن کے مشورہ سے سرانجام پائے۔

تاریخ اس قسم کا سب سے پہلا بنک ۱۸۶۳ء میں قائم ہوا، جس کا نام بنک آف اپر انڈیا تھا اس کے بعد ۱۸۶۵ء میں الہ آباد بنک اور دیگر کئی بنک جاری کئے گئے۔ جن میں ۱۸۷۴ء کا الائنس بنک آف شملہ جو ۱۹۲۳ء میں دیوالیہ ہوگیا قابل ذکر ہے۔ ۱۸۷۰ء میں اس قسم کے سات بنک موجود تھے، ۱۸۹۴ء میں ان کی تعداد چودہ ہوگئی، ان میں سے اکثر یورپین [illegible] کا نتیجہ تھے۔ اس طرز پر سب سے پہلا ہندوستانی بنک ۱۸۸۱ء میں جاری ہوا جس کا نام اودھ کمرشیل بنک تھا۔ ۱۸۹۴ء میں لالہ ہرکشن لعل مرحوم نے پنجاب نیشنل بنک اور ۱۹۰۱ء میں پیپل بنک آف انڈیا (اب دیوالیہ) جاری کئے۔

۱۹۰۵ء میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی جس کی بدولت بہت سے ہندوستانی مشترک سرمایہ دار بنک قائم کئے گئے، ان میں سے بنک آف برہما، انڈین اسپیشی بنک، سنٹرل بنک آف انڈیا، انڈین بنک (مدراس)، پنجاب اینڈ سندھ بنک، بنک آف میسور،

لہ اس سلسلے کے اول تین مضمون زمانہ جنوری۔ فروری و مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنک آف بڑودہ اور بمبئی بنکنگ کمپنی قابل ذکر ہیں۔

ابتدائی چند سالوں میں یہ بنک خوب پھلے پھولے، لیکن ان میں سے اکثر کا کاروبار اس قدر غیر محفوظ، ورقیاسی تھا، اور ان کے پاس موجبات کے مقابلہ میں زر نقد اس قدر قلیل تھا کہ وہ تباہی و بربادی کے گڑھے سے نہ بچ سکے۔

۲۔ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پیپل بنک آف انڈیا کا دیوالہ نکلا، اس کے بعد کئی بنک یکے بعد دیگرے فیل ہوئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۵ء کے دوران میں قریب پچپن بنکوں کا خاتمہ ہو گیا۔

جنگ، اور مابعد جنگ کی گرانی کی وجہ سے لوگوں نے زیادہ تعداد میں بنک جاری کئے لیکن اس کے بعد بحران آیا تو اکثر ناکامیاں ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں گیارہ، ۱۹۱۶ء میں تیرہ اور ۱۹۱۷ء میں سولہ بنک فیل ہوئے۔

غرض ۱۹۱۳ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک کا عرصہ بنکوں کے لئے نہایت نازک تھا۔ اس دوران میں اکیسو اکسٹھ[۱] بنک دیوالیہ ہوئے، جن کا اداشدہ سرمایہ ۳/۴ ۱۰ کروڑ روپے تھا۔

بعد از جنگ کی ناکامیوں میں الائینس بنک اور پیپل بنک کی ناکامی خاص طور پر قابل ذکر ہے؛ پیپل بنک کے منتظموں پر مختلف الزامات عائد کئے گئے ہیں جن کی تحقیقات ابھی تک لاہور ہائی کورٹ میں جاری ہے۔

اِن ناکامیوں کی وجہ سے روپیہ جمع کرانے والوں کو نقصان کے علاوہ عوام کے اعتبار اور ساکھ کو بھی دھکا پہونچا، نیز لوگوں کی پس انداز کرنیکی عادت اور ان کی صنعتی و تجارتی ترقی پر بھی اس کا بہت ہولناک اثر پڑا۔

ناکامیاں۔ مشترک سرمایہ دار بنکوں کی ناکامی کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ بنک اپنے موجبات کے مقابلہ میں زرِ نقد بہت کم رکھتے ہیں۔ کافی زرِ محفوظ رکھنا مستحکم بنکوں کے لئے امر لازمی ہے، اور تجربہ بتاتا ہے کہ اِس اُصول سے غفلت کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

ہندوستانی بنکوں نے ہمیشہ اس احتیاط کو بالائے طاق رکھا [illegible] ہولناک نتائج بھگتنے پڑے۔ مندرجہ ذیل نقشے میں ہندوستان [illegible] ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ان کے زرِ محفوظ کا تناسب دکھایا گیا ہے

---

[۱] بنکوں کی مرکزی مجلس تحقیقات صہ ۲۹

ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ہندوستانی بنکوں کے زرِ نقد کا تناسب

۳۱ - دسمبر ۱۹۳۳ء

قسم بنک	۱۹۰۴ء	۱۹۰۸ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۱۷ء	۱۹۲۰ء	۱۹۲۳ء	۱۹۲۵ء	۱۹۲۶ء	۱۹۲۹ء	۱۹۳۱ء	۱۹۳۳ء
I - امپیریل بنک آف انڈیا	۴۰	۳۳	۳۱	۳۶	۴۵	۳۰	۱۸	۲۱	۲۶	۱۸	۱۵	۲۳
II (۱) تبادلہ بنک	۲۹	۱۷	۱۶	۱۹	۴۰	۳۰	۱۹	۱۳	۱۴	۱۵	۱۵	۱۲
(ب) تبادلہ بنک	۳۴	۲۷	۲۱	۱۷	۷۰	۵۰	۲۷	۱۵	۱۷	۱۰	۹	۶
III (۱) مشترک سرمایہ دار بنک	۱۰	۱۵	۱۱	۱۸	۲۵	۲۳	۱۷	۱۹	۱۵	۱۴	۱۲	۱۵
(ب) مشترک سرمایہ دار بنک	..	..	..	۱۶	۲۱	۱۰	۱۹	۲۰	۲۴	۱۳	۱۲	۱۷

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ جنگ سے پیشتر زمانہ میں زرِ محفوظ کے متعلق پریسیڈنسی بنکوں کی پوزیشن کیا تھی۔

۱۹۱۳ء کی ناکامیاں عبرت انگیز تھیں، اس لئے زرِ محفوظ کے متعلق اکثر بنکوں کی حالت بہتر رہی، لیکن ابھی اس باب میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے۔

بمبئی بنکنگ [illegible] کمیٹی نے تجویز پیش کی تھی کہ ہر بنک کو قانونی طور پر ایک قلیل ترین [illegible] زرِ محفوظ رکھنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ لیکن سنٹرل بنک انکوائری کمیٹی نے اس تجویز کو [illegible] رد کر دیا کہ بنک اس قلیل ترین معیار کو زیادہ سے زیادہ معیار تصور کرنے لگیں گے [illegible] اس قانون سے بچنے کے اور بھی کئی طریق ہو سکتے ہیں۔ کمیٹی نے اس مسئلہ کو بنکوں کی [illegible] خوش معاملگی پر چھوڑ دیا۔ (بنکوں کی مجلس تحقیقات کی رپورٹ صفحہ)

مشترک سرمایہ دار بنکوں کی ناکامی کی اور بھی کئی وجوہات ہیں جن کو مختصر طور پر درج ذیل [illegible] جاتا ہے:-

[illegible] کھینچنے کے لئے سود کی شرح غیر معمولی طور پر بلند ہوتی ہے جس سے بنک

[illegible] بنکوں کی ایجنسیاں

[illegible] سے زیادہ ہے۔

[illegible] ۱۹۳۳ء [illegible]

کی اندرونی حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ روپیہ جمع کرانے والے شرح سود سے دھوکا کھا جاتے ہیں، اور بعد کو اُنھیں زک اُٹھانے پڑتی ہے۔

(۲) انتظام و انصرام کے لئے قابل منتظمین اور کارکن میسّر نہیں آتے۔ عام طور پر وہی لوگ ساہوکاری شروع کر دیتے ہیں جن کے پاس کافی روپیہ ہوتا ہے، یا جن کا کاروباری لوگوں میں اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے بنکوں کے طرز عمل کا علم اور تجربہ بھی بنہایت ہونا چاہیئے۔ نندا نے شیراز کے الفاظ میں بغیر علم اور تجربہ کے بنکوں کا کام شروع کر دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی فوج جنرل اسٹاف کی ہدایات اور ماہر افسران کی رہنمائی کے بغیر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جائے۔ (ہندوستانی زر اور مالیات صفحہ ۲۲۵)

(۳) بعض ڈائرکٹروں اور منیجروں کی دھوکہ دہی اور جعلسازی۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض منتظمین اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ایک کثیر رقم نکلوا لیتے ہیں، جس کو وہ بعد ازاں ادا نہیں کر سکتے یا بنک کا روپیہ ایسے کاروبار میں لگا دیتے ہیں جس کی کامیابی محض ظنّی اور قیاسی ہوتی ہے۔

پیپلز بنک آف انڈیا کے مقدمہ میں حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ لالہ ہرکشن لال پر تین کروڑ روپیہ کے غبن کا الزام ہے، اور بعض دیگر کارکن بھی اسی قسم کے الزامات کے نیچے ہیں۔

(۴) بعض بنک گوشوارہ میں سرمایہ کو جعلی طور پر بڑھا کر دکھانے کے عادی ہیں۔ اس سے منافع خواہ مخواہ زیادہ معلوم ہوتا ہے اور عوام دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس طرز عمل کو انگریزی میں Watering the Capital. کہتے ہیں یعنی سرمایہ میں پانی ملا لینا، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ فرض کیجئے کسی بنک کا ادا شدہ سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہے، اس پر پانچ فیصدی نفع ہوا ہے، اب نفع زیادہ دکھانے کے لئے یہ کیا جاتا ہے کہ حصہ داروں کے نام فرضی حصّے جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اُن کے بدلہ میں کوئی رقم وصول نہیں ہوتی۔ لیکن رجسٹروں میں یہ رقم وصول شدہ دکھائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے یہ بغیر اثاثہ کے سرمایہ چار لاکھ روپیہ کی مالیت کا جاری کیا گیا ہے۔ تو گوشوارہ میں سرمایہ پانچ لاکھ درج کیا جائیگا، اور اُسی نسبت سے نفع بھی بڑھا کر ۲۵ فیصدی دکھایا جائے گا۔ اس سے عام لوگ سمجھیں گے کہ بنک کی حالت نہایت مستحکم ہے اور وہ کافی منافع حاصل کر رہا ہے، حالانکہ اندرونی حالت نہایت کمزور ہے اور واقعی منافع صرف پانچ فیصدی ہے۔

یہ دھوکہ غور و خوض اور جانچ پڑتال سے دور ہو سکتا ہے۔

(۵) سرکاری یا نیم سرکاری اداروں نے فیل شدہ بنکوں کی امداد نہ کی۔ یورپین بنکوں نے اکثر

تعصب کا برتاؤ کیا۔ اور ہندوستانی بنکوں کی امداد کرنے سے گریز کیا۔ مثلاً بنک آف بنگال نے پیپلز بنک کو سرکاری تمسکات پر بھی روپیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

علاوہ بریں پہلے ریزرو بنک بھی موجود نہ تھا اور ہندوستانی بنکوں کے آپس میں اتحاد واتفاق نہ تھا۔

بعض نکتہ چیں نادانی سے کہہ دیتے ہیں کہ ان ناکامیوں سے بنک چلانے کے متعلق ہندوستانیوں کی نااہلیت ظاہر ہوتی ہے، حالانکہ مشترکہ سرمایہ دار بنکوں کی ناکامیاں محض ہندوستان ہی میں نہیں ہوئیں بلکہ ان کی مثالیں امریکہ اور انگلستان کی تاریخ بنکنگ میں بھی ملتی ہیں۔ جیسا کہ مسٹر ڈوراسوامی رقمطراز ہیں[1] "ہندوستانی بنکوں کی ناکامی کا راستہ یوروپینوں کے منظم اداروں کی تباہی وبربادی سے اٹا پڑا ہے۔" اور وہ اس کے ثبوت میں بنک آف بمبئی ۱۸۶۶ء اور ارتھ ناٹ بنک کی ناکامی کو پیش کرتے ہیں۔ ہم اس کے علاوہ الائینس بنک آف شملہ کی مثال بھی دے سکتے ہیں۔ یہ سب بنک یوروپین انتظام کے ماتحت تھے۔ لیکن بالآخر ٹوٹ گئے۔

پس بنکوں کی ناکامی کو ہندوستانیوں کی نااہلیت سے منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

اگرچہ بعض بنکوں کے معاملہ میں دھوکہ دہی اور جعل سازی بھی ناکامی کا سبب معلوم ہوئی ہے؛ لیکن زیادہ تر اس کی وجہ تجربہ اور علم کا فقدان ہے۔ پس بنکوں کو بہتر بنانے کے لئے قابل منتظمین اور ماہر کارکنان کا انتخاب ضروری ہے۔

جہاں ہندوستان میں بنکوں کی ناکامی سے بہت سے نقصان ہوئے ہیں وہاں اُن سے ایک فائدہ بھی پہونچا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی بنکوں کی کمزوریاں واضح ہوگئی ہیں، جن کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

ترقی | گزشتہ ساٹھ سال سے مشترک سرمایہ دار بنکوں میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے، اس ضمن میں اعداد وشمار مندرجہ ذیل ہیں :-

ہندوستان کے مشترک سرمایہ دار بنکوں کے سرمایہ، زرِ محفوظ امانتوں اور نقد کے متعلق شمار واعداد

قسم اول :- وہ بنک جن کا سرمایہ اور زرِ محفوظ پانچ لاکھ یا اس سے زائد ہے۔

---

[1] ہندوستانی مالیات، زر اور بینکاری۔ ایس۔ وی۔ ڈوراسوامی صد[illegible]

۳۱ دسمبر سنہء	بنکوں کی تعداد	سرمایہ اداشدہ لاکھ روپے	زرِ محفوظ لاکھ روپے	امانتیں لاکھ روپے	نقد لاکھ روپے
۱۸۷۰	۲	۹۶۸	۱۶۸	۱۳	۵
۱۸۸۰	۳	۱۸	۳	۶۳	۱۶
۱۸۹۰	۵	۳۳	۱۷	۲۷۰	۵۵
۱۹۰۰	۹	۸۲	۴۵	۸۰۷	۱۱۹
۱۹۱۰	۱۶	۲۷۵	۱۰۰	۲۵۶۵	۲۰۰
۱۹۱۳	۱۸	۲۳۱	۱۳۲	۲۲۵۹	۴۰۰
۱۹۱۴	۱۷	۲۵۱	۱۴۱	۱۷۱۰	۳۵۳
۱۹۱۵	۲۰	۲۸۱	۱۵۶	۱۷۸۷	۳۹۹
۱۹۱۸	۱۹	۴۳۶	۱۶۵	۴۰۵۹	۹۴۸
۱۹۲۰	۲۵	۸۳۷	۲۵۵	۷۱۱۴	۱۶۳۰
۱۹۲۱	۲۷	۹۳۸	۳۰۰	۷۶۸۹	۱۵۶۵
۱۹۲۲	۲۷	۸۰۲	۲۶۱	۶۱۶۳	۱۲۰۳
۱۹۲۳	۲۶	۶۸۹	۲۸۴	۴۴۵۲	۷۳۷
۱۹۲۴	۲۹	۶۹۰	۳۸۰	۵۲۵۰	۱۱۲۹
۱۹۲۵	۲۸	۶۷۳	۳۸۶	۵۴۴۹	۱۰۰۹
۱۹۲۶	۲۹	۶۸۸	۴۱۹	۶۰۸۴	۷۶۹
۱۹۲۹	۳۳	۷۸۷	۳۶۷	۶۲۷۲	۹۰۵
۱۹۳۱	۳۳	۷۷۷	۴۲۶	۶۲۲۳	۷۷۰
۱۹۳۲	۳۴	۷۸۲	۴۴۰	۷۲۳۴	۹۷۶
۱۹۳۳	۳۴	۷۷۸	۴۵۵	۷۱۶۸	۱۰۹۲

قسم دوم

وہ بنک جن کا سرمایہ اور زرِ محفوظ ایک لاکھ روپیہ سے پانچ لاکھ روپیہ کے درمیان ہے۔

۳۰ دسمبر سنہ ء	بنکوں کی تعداد	سرمایہ اداشدہ لاکھ روپے	زرِ محفوظ لاکھ روپے	امانتیں لاکھ روپے	نقد لاکھ روپے
۱۹۱۳	۲۳	۳۹	۱۱	۱۵۱	۲۴
۱۹۱۴	۲۵	۴۲	۱۳	۱۲۶	۲۷
۱۹۱۵	۲۵	۴۵	۹	۹۱	۲۰
۱۹۱۸	۲۹	۴۸	۱۴	۱۵۵	۳۶
۱۹۲۰	۳۳	۶۱	۱۹	۲۳۳	۴۱
۱۹۲۱	۳۸	۷۷	۲۳	۳۲۶	۴۳
۱۹۲۲	۴۱	۸۳	۲۷	۳۳۷	۵۶
۱۹۲۳	۴۳	۸۰	۳۰	۳۲۹	۶۱
۱۹۲۴	۴۰	۷۲	۳۴	۲۶۶	۳۴
۱۹۲۵	۴۶	۸۰	۳۷	۳۴۱	۶۷
۱۹۲۷	۴۸	۸۴	۲۷	۳۴۵	۵۲
۱۹۲۹	۴۵	۷۵	۴۰	۳۵۸	۴۵
۱۹۳۱	۵۱	۸۳	۴۱	۳۸۴	۴۷
۱۹۳۲	۴۹	۸۰	۴۱	۳۸۲	۶۵
۱۹۳۳	۵۰	۸۲	۴۰	۴۶۴	۷۹

۳۰ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان میں کل چوراسی مشترکہ سرمایہ دار بنک تھے جن کا سرمایہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھا۔ ان کا مجموعی اداشدہ سرمایہ آٹھ کرور ساٹھ لاکھ روپے، زرِ محفوظ چار کرور پچانوے لاکھ روپے، امانتیں چھہتر کرور تیس لاکھ روپے، اور نقد گیارہ کرور اکہتر لاکھ روپے تھے۔

ان میں سے چھ بنکوں کی امانتیں سب سے زیادہ تھیں، بنک آف میسور اور بنک آف بڑودہ کو چھوڑ کر، جن کو ریاست کی سرپرستی حاصل ہے، باقی چار بنک ہندوستان کے مالی نظام میں سب سے اہم ہیں، ان کے نام یہ ہیں (۱) بنک آف انڈیا (۲) سنٹرل بنک آف انڈیا (۳) پنجاب نیشنل بنک (۴) الہ آباد بنک۔ ان میں سے صرف پنجاب نیشنل بنک اور

لہ گنے ۔ صفحہ ۴

سنٹرل بنک آف انڈیا ہندوستانی انتظام کے ماتحت ہیں۔
اوپر کے نقشہ سے ظاہر ہے کہ ۱۴-۱۹۱۳ء کی ناکامیوں کی وجہ سے بنکوں کو ایک صدمہ پہونچا لیکن ۱۶-۱۹۱۵ء سے وہ ترقی کی طرف مائل ہوئے حتیٰ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں امانتوں کی رقم اسّی کروڑ تک پہونچ گئی۔ ترقی زیادہ تر جنگی حالات کی وجہ سے ہوئی۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کے بعد پھر انحطاط شروع ہوا علی الخصوص ۲۳-۱۹۲۲ء بنکوں کے لئے ایک ہولناک سال تھا۔ ۲۴-۱۹۲۳ء کے بعد ترقی محسوس ہوئی ہے، اور عالمگیر کساد بازاری کا بنکوں پر کوئی غیر معمولی برا اثر نہیں ہوا۔
اِن باتوں کے باوجود مشترک سرمایہ دار بنکوں کی حالت چنداں تسلی بخش نہیں ہے۔ حال ہی میں امپیریل بنک اور اس کی شاخوں، تبادلہ بنکوں اور ان کی شاخوں، امداد باہمی بنکوں اور پوسٹل سیونگ بنکوں وغیرہ کی وجہ سے مقابلہ بڑھ گیا ہے۔ مزید برآں اِن بنکوں کی سرکار کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔
تاہم یہ مقابلہ مشترک سرمایہ دار بنکوں کو اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے موقع بہم پہونچا رہا ہے اور اگر ریزرو بنک آف انڈیا کی ہدایت کے ماتحت ایمانداری سے کام کریں تو ترقی کی بہت کچھ گنجائش ہو سکتی ہے
قانونی انضباط۔ مشترک سرمایہ دار بنکوں کی پے در پے ناکامیوں کو دیکھ کر اکثر ماہرین کی تجویز ہے کہ بنکوں کا ایک باقاعدہ ضابطہ مقرر کیا جائے۔ آجکل بنک انڈین کمپنی ایکٹ ۱۹۱۳ء کے ماتحت ہیں، اور اس ایکٹ کی صرف چند دفعات کا بنکوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ بنکوں کے مخصوص طرزِ عمل کے پیش نظر اُن کے لئے ایک علٰحدہ قانون بنانے کی ضرورت ہے۔
بنکوں کی مرکزی مجلس تحقیقات نے سفارش کی تھی کہ ایک بنک ایکٹ پاس کیا جائے جس میں بنکوں کے لئے علٰحدہ ضابطہ تجویز ہو۔ مثلاً اُن کی رائے میں قانون مندرجہ ذیل شقوں پر حاوی ہونا[1]۔

(۱) تنظیم (۲) نظامت (۳) پڑتال اور معائنہ، (۴) دیوالہ اور ادغام

تنظیم:- جو ادارے یا کمپنیاں اپنے آپ کو "بنک" کی حیثیت سے رجسٹر کروائیں وہ مندرجہ ذیل اُمور بھی اپنے قواعد و ضوابط میں درج کریں :-
(۱) بنکنگ کے سوائے وہ اور کوئی کام نہ کریں گے۔
(ب) وہ بنک کے ذاتی اثاثہ کی ضمانت پر قرض نہ دیں گے۔

---
[1] دیکھو سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی رپورٹ باب ۲۵ اور ہندوستان کے بنکوں کا ارتقا، مصنفہ ایم۔ ایل ٹینن

(ج) ڈائرکٹروں منیجروں اور اسٹاف کے ممبروں کو صرف محدود قرضہ دیا جائیگا۔
(د) ڈائرکٹروں اور بنک کے دیگر افسروں کے محاسن، تقرر، استعفیٰ اور حق رائے دہندگی کے متعلق تفصیلی شرائط درج کریں گے۔

تبادلہ بنکوں کے سوا ہندوستان میں کام کرنے والے تمام بنکوں کے ڈائرکٹران ہندوستانی ہونا چاہئیے۔

تبادلہ بنکوں کے سوا جب تک حصہ داروں میں اکثریت ہندوستانیوں کی نہ ہو اور بنک ہندوستانی قانون کے ماتحت رجسٹرڈ نہ کرایا جائے کسی بنک کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت نہ ہو

"منیجنگ ایجینسی سسٹم" کے اصول پر کسی بنک کی تنظیم نہ کی جائے۔ کیونکہ بنکنگ میں اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

کوئی مشترک سرمایہ دار بنک جب تک کہ اس کے ادا شدہ سرمایہ کی رقم پچاس ہزار روپیہ نہ ہوجائے کاروبار شروع نہ کرنے پائے۔ منظور شدہ سرمایہ سرمایۂ حصص کے دگنے سے زیادہ نہ ہونا چاہئیے اور ادا شدہ سرمایہ سرمایۂ حصص کے پچاس فیصدی سے کم نہ ہو۔

نظامت :-

(۱) زر محفوظ :- جب تک "زر محفوظ" ادا شدہ سرمایہ کے برابر نہ ہو، ادا شدہ سرمایہ کا کم از کم ۲ ½ فیصدی حصہ منافع تقسیم کرنے سے پہلے "زر محفوظ" میں منتقل کر دینا چاہئیے۔

(ب) زرِ نقد :- جب ریزرو بنک قائم ہو جائے تو ممبر بنکوں کو زر بدست "Cash in hand" کے علاوہ "عند الطلب" اور وقتی "موجبات" یعنی Demand & Time Liabilities کا کچھ حصہ اس میں جمع کرنا ہوگا۔

(ج) انضباطِ مقروضات :- آڑھتیوں کی کمپنی یا کسی واحد آڑھتیہ کو قرضہ دینا ممنوع قرار دیا جائے۔

پڑتال اور معائنہ :- اگر بنک کے افسر یا ڈائرکٹران کسی ضروری معلومات کے بہم پہونچانے میں غفلت برتیں تو اس کے لئے انھیں موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔

دیوالہ اور ادغام :- مشکلات کے وقت ریزرو بنک کی سفارش پر بنک کو اپنے موجبات کی ادائی سے عارضی طور پر بری قرار دیا جائے تاکہ بنک بے وقت اور مجبوراً دیوالیہ ہونے سے

محفوظ رہ سکے۔

رضاکارانہ دیوالہ کے موقع پر لکویڈیٹر ریزرو بنک کے ڈائرکٹران کی طرف سے مقرر ہو۔
اگر بنک کسی اور بنک کے ساتھ الحاق کرنا چاہے تو ریزرو بنک کا یہ فرض ہوگا کہ وہ
اُسے مناسب مشورہ اور امداد دے۔

ظاہر ہے کہ قانون بنکنگ کی ضرورت نہ صرف اس لئے ہے کہ ہم امانت رکھنے والوں اور حصہ داروں کو بنکوں کے منتظمین کی بدنظمی سے بچانا چاہتے ہیں، بلکہ ہماری غرض یہ بھی ہے کہ بنک خود بھی اپنے استحکام پر کلہاڑی نہ چلائیں۔ ان حالات میں محسوس کیا گیا ہے کہ جب تک علٰحدہ بنک ایکٹ نہ بن جائے موجودہ کمپنی ایکٹ ہی کی ضروری ترمیم کردی جائے گورنمنٹ کے خیال میں ابھی علٰحدہ قانون بنک بنانے کا وقت نہیں آیا، اس لئے موجودہ قانون ہی میں ترمیم مناسب ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اس سلسلے میں وزیر قانون گورنمنٹ ہند کی طرف سے مرکزی اسمبلی میں بعض ترمیمات پیش بھی ہوئی تھیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) بنک "وہ قرار دیا جائے جس کا اوّلین فرض امانتیں جمع کرنا ہو، خواہ وہ قرض دینے سے ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنے، مراسلاتِ قرض جاری کرنے یا قیمتی اشیاء بغرض امانت وصول کرنے وغیرہ کے فرائض بھی انجام دے۔

(۲) اُسے بنکنگ کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرنے دیا جائے

(۳) مینجنگ ایجنٹ مقرر نہ ہوں،

(۴) کام شروع کرنے سے پیشتر کافی سرمایہ (مثلاً پچاس ہزار) جمع ہو جائے، اور اِس مطلب کا ایک سرٹیفکٹ حاصل کرلیا جائے۔

(۵) زرِمحفوظ علٰحدہ کرنا ضروری قرار دیا جائے، اور جب تک وہ ادا شدہ سرمایہ کے برابر نہ ہو مؤخر الذکر کا ½ ۲ فیصدی حصہ "زرمحفوظ" میں منتقل کیا جائے۔

(۶) وقتی موجبات کا ½ ۱ فیصدی اور عندالطلب "موجبات" کا ۵ فیصدی حصہ بطور "زرنقد" رکھا جائے۔ اور اس کے ماہواری تخمینے رجسٹرار کو پہونچائے جائیں۔

(۷) عارضی مشکلات کو پاٹنے کے لئے ایک جبری اعلان برائے التوائے ادائی شائع کیا جائے،

یہ ترمیمات زیادہ تر سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں۔

بچّے

(از ماشہ جیمنی سرشار۔ خیمر نور پر سادات۔ ضلع مظفر گڑھ)

یہ مسرور و خنداں یہ دلشاد بچّے
مسرت کی دنیا میں آباد بچّے

یہ روشن جبینیں یہ مسرور چہرے
وفورِ مسرت سے پُرنور چہرے

یہ دنیائے دوں کے گناہوں سے غافل
زمانے کی چیرہ دستی نگاہوں سے غافل

نہ رنج والم ہے نہ افکار دل میں
تردد نہیں کوئی زنہار دل میں

نہ کچھ فرق ماو شما اُن کے دل میں
نہ کچھ خوف جور وجفا اُنکے دل میں

نہ جھگڑا کوئی کفر و ایمان کا ہے
نہ کچھ فرق ہندو مسلمان کا ہے

نہ ہے رنجِ افلاس و نہ عیشِ امارت
غلامی کا احساس نہ رعبِ حکومت

نہ پابند مذہب کے اور ذات کے ہیں
مکمل نمونے مساوات کے ہیں

انھیں ناسمجھ اور نادان سمجھیں
کہ پہلے زمانے کے انسان سمجھیں

اے ننھے فرشتو! اے معصوم بچّو!
نہیں آہ! تم کو یہ معلوم بچّو!

تمھارا وطن یہ جو ہندوستاں ہے
بہت مضطرب، خستہ و دنیجاں ہے

زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا ہے
مصیبت کے چکر میں آیا ہوا ہے

نہ وہ شان و شوکت نہ حشمت ہے باقی
نہ عزت ہے باقی نہ حرمت ہے باقی

اسے کھا گئے کفر و ایماں کے جھگڑے
کہ جاری ہیں ہندو مسلماں کے جھگڑے

نہ خوفِ خدا ہے نہ ہے نورِ ایماں
فقط نام کے ہیں یہ ہندو مسلماں

نہیں پاسباں کوئی اپنے وطن کا
نہیں باغباں کوئی اُجڑے چمن کا

ہیں مسدود مہر و محبت کی راہیں
تمھیں تک رہی ہیں وطن کی نگاہیں

خدا تم کو توفیق دے نونہالو!
تباہی سے اپنے وطن کو بچا لو

برہمیندر سوامی

(از جناب مائل نقوی، صدر انجمن اردو بھوپال)

اُن قوموں کی سیاسی تاریخ میں جنھوں نے معرکۂ عمل میں داخل ہو کر دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بعض اوقات ایسے مقدس لوگوں کے نام بھی نظر آجاتے ہیں جو مسندِ رُشد و ہدایت پر بیٹھکر اپنی قوم کی روحانی پیشوائی کے ساتھ ساتھ شاہراہِ سیاست میں بھی اُن کی رہنمائی کرتے رہے ہیں یہ ہستیاں اگرچہ خود شمشیر بکف ہو کر میدانِ عمل میں نہیں آتیں، لیکن سیاسی شطرنج کی بساط کے مہرے انھیں کے اشاروں سے نقل و حرکت کرتے ہیں۔ اور اِن کے مشوروں سے وہ کام انجام پا جاتے ہیں جن کے سامنے کہن سال مدبر اور طاقتور جنرلوں کو اپنی تدبیر و فراست کی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

مرہٹہ قوم کی سیاسی تاریخ میں شروع ہی سے ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ سیواجی کی کامیابی کا راز اگر تمام تر نہیں تو زیادہ تر ان کے مذہبی گرُو کا رہینِ منت سمجھا جاتا ہے۔ برہمیندر سوامی کا نام بھی اسی قسم کے بزرگواروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ سوامی جی کو اپنی زندگی میں مرہٹہ طاقت پر جو قابلِ رشک اقتدار حاصل رہا اُس کی مثال بعد کی تاریخ میں تلاش کر لینا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے ان کی قابلِ احترام شخصیت نہ صرف کثیر التعداد عام مرہٹہ افراد کی دینی رہنما سمجھی جاتی تھی بلکہ اُس عہد کے تمام مرہٹہ سرداروں، پیشوا حتیٰ کہ خاندانِ سیواجی کے چشم و چراغ "شاہو" کی روحانی رہبر اور اتالیقِ سیاست تسلیم کی جاتی تھی۔

پیشوا باجی راؤ اوّل کے زمانہ میں مرہٹہ قوت کو جو انتہائی عروج حاصل ہوا، شاہو کو پیشوا پر جو کچھ طاقت حاصل رہی وہ سب سوامی جی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۵ء تک مرہٹہ طاقت سے متعلق کوئی واقعہ ایسا نہ ملے گا جو ان کی مؤثر شخصیت کا زیرِ بارِ احسان نہ ہو۔ سلطنت مغلیہ کو کمزور کرنے کی تدبیریں، دہلی میں مرہٹوں کی سازشیں، نظام الملک کی شکست، پرتگیزوں سے جنگ "بسین" کا محاصرہ، غرض ہر واقعہ میں ان کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ل دفترِ پیشوا، دفتر چہارم و ششم صفحہ ۱۲۱ و ۲۰۵

سوامی جی کا اصلی نام "وشنو" تھا۔ "دھاوڈلیش" کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان عرصۂ دراز سے مذہبی تقدس کے لئے مشہور چلا آتا تھا۔ سوامی جی کو ابتدائے عمر ہی سے دنیا کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی۔ ریاضت اور نفس کشی میں بیشتر وقت بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد سیاحت شروع کی اور شمال میں ہمالیہ کی مقدس چوٹیوں سے لیکر جنوب میں رامیشور تک ہر جگہ پہونچکر زیارت اور تپسیا کی۔ ان تمام باتوں سے فارغ ہوکر وطن کی طرف مراجعت کی۔ علاقہ "تناگری" میں ایک مقام "چیلن" ہے، وہاں ۱۶۶۰ء میں گوشہ گیر ہوکر بیٹھ گئے۔ سنیاس لینے کے بعد اپنا اصلی نام بھی ترک کر دیا، اس کے بجائے "برہمیندر سوامی" کا لقب اختیار کیا۔ چنانچہ تاریخی اور مذہبی دنیا میں آج تک اسی نام سے مشہور ہیں۔

سوامی جی پہلے دنیا کے گرد خود گھومتے تھے۔ اب گوشہ نشینی کے بعد دنیا ان کے گرد آکر جمع ہو گئی۔ ان کے حسن اخلاق اور فیاضی نے اسمیں اور اضافہ کیا۔ معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ لاکھوں تک نوبت پہونچ گئی۔ پیشوا بالاجی وشوناتھ راؤ ان کے اثر اور اوصاف کی شہرت سنکر غائبانہ ملاقات کا مشتاق ہوا، اور جب حاضری کا موقع ملا تو ان کے خداداد اوصاف سے بہت متاثر ہوکر اٹھا۔ ان کے تقدس سے صرف ہندو ہی متاثر نہ تھے بلکہ قرب وجوار کے مسلمان روسا بھی ان کا دل سے ادب کرتے تھے۔ جنجیرہ کے مسلمان فرمانروا نے دو گاؤں ان کے مصارف کے لئے وقف کر دئے تھے۔ مرہٹہ سردار تو ایک بھی ایسا نہ تھا جس پر سوامی جی کا غیر معمولی اثر نہ ہو۔ اس زمانہ کی جس قدر سربرآوردہ مرہٹہ شخصیتوں کے نام تاریخ میں آتے ہیں وہ سوامی جی کی اطاعت کا سب دم بھرتی تھیں[1]۔

سوامی جی اگرچہ دنیا سے دور رہتے تھے لیکن دل کی نگاہ سے سب کچھ دیکھتے تھے، معاملات دنیا کو خوب سمجھتے تھے، تمام نشیب و فراز پیش نظر رکھتے تھے، آنے والے واقعات کا اندازہ کرتے تھے اور ضرورت کے وقت حالات پر اثر انداز بھی ہوتے تھے۔ مرہٹہ سرداروں کی روحانی امداد کے علاوہ مادی اسباب سے بھی مدد کرتے تھے۔ پیشوا اور خود شاہو سے براہ راست خط وکتابت جاری رہتی تھی۔ ان خطوں کی بیشمار تعداد بیان کی جاتی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں مرہٹہ تہذیب کے مرکز "ستارا" سے راؤ بہادر پارسنس آنجہانی نے سوامی جی کی ایک مکمل سوانحعمری شائع کی، جس میں انھوں نے ۲۷۵ مکتوبات کی نقل درج کی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت بمبئی کے زیر اہتمام پیشوا کے دفتر کا ایک حصہ ۵ ضخیم جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اس میں بھی سوامی جی کا نام جابجا آتا ہے۔ خطوط اور حالات کے مطالعہ سے اندازہ

---

[1] لائف آف برہمیندر سوامی ص ۱۵۲

ہوتا ہے کہ سوامی جی اعلیٰ سیاسی قابلیت کے مالک تھے۔ اُن کی شخصیت مرہٹہ طاقت کی روح رواں تھی۔ تمام مہاراشٹر میں اُن کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اور انھیں اُس عہد کا "مہاپرُش" تسلیم کیا جاتا تھا۔

مرہٹوں کے مہاراجۂ اعظم شاہو پر سوامی جی کا جو اثر تھا، شاہو کو ان کی خاطر جس درجہ عزیز تھی، اور جن طریقوں سے وہ ان کی دلداری کی کوشش کیا کرتا تھا، ان تمام باتوں پر مذکورہ تحریروں سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اُسی زمانہ میں دربار یا سرکاری دفتروں سے جو خط کسی کے نام لکھے جاتے تھے اُن میں تکلفات اور رسمی اُمور کا حد درجہ خیال رکھا جاتا تھا، اور ساری تحریر تصنع و عبارت آرائی کا نمونہ بن کر رہ جاتی تھی۔ لیکن شاہو اور پیشواؤں نے جو خط سوامی جی کو لکھے ہیں اُن میں ان فروعات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہر خط کی تحریر نیاز مندانہ و مخلصانہ اور صاف ہے۔ سوامی جی بھی جو خط اِن لوگوں کو لکھتے تھے اُن میں خوشامد اور تکلف سے دُور رہ کر حکیمانہ نصیحتیں، اہم مسائل پر اظہار رائے اور مفید مشورے ہوتے تھے۔ کبھی سوامی جی اپنی ضروریات و تکلیفات کا اظہار بھی "شاہو" سے کیا کرتے تھے، اور وہ ان فرمائشات کو تمام اُمور ریاست پر مقدم سمجھکر اُنھیں انجام دینے میں ہر امکانی کوشش صرف کر دیتا تھا۔

"شاہو" کے زمانہ میں "اودے جی" ایک سرکش مرہٹہ سردار تھا، اُس نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ شاہو اُس کے خلاف کوئی کارروائی علانیہ کرنے میں تامل کرتا تھا۔ جس طرح مرہٹے دوسرے صوبوں سے چوتھ وصول کرتے تھے اُسی طرح اودے جی نے شاہو کو مجبور کر کے خود مرہٹہ صوبوں سے ایک خاص حق وصول کرنے کی اجازت لکھوالی تھی۔

سوامی جی گو خود فقیر تھے مگر ان کے یہاں دولت کا بڑا انبار تھا۔ لاکھوں روپیہ نقد اور اس سے زائد کا سامان جمع تھا، چیلوں کے اخراجات کے لئے بہت سے گاؤں معافی میں تھے، اودے جی اپنا حق وصول کرتا ہوا جب ادھر سے گزرا تو اُن سے بھی مطالبہ کیا۔ اُنھوں نے کچھ فقیرانہ تصرفات سے کام لے کر کچھ چیلوں کا زور دکھا کر اُسے زیر کرنا چاہا، مگر وہ بھی اپنی جماعت لیکر اَڑ گیا اور اثبات حق میں شاہو کا فرمان دکھلایا۔

یہ معاملہ بہت طول پکڑ گیا۔ آخر سوامی جی نے شاہو کو کل کیفیت سے آگاہ کیا۔ شاہو نے اودے جی کے نام ایک مراسلہ لکھا اور بطریق مناسب گوشہ نشین فقیر کے مزاحم ہونے سے روک دیا۔

اس طرف سے اطمینان کر کے ایک خط سوامی جی کی خدمت میں بھیجا، اس میں وہ نہایت لجاجت کے ساتھ لکھتا ہے:-

"میں سوامی جی کی خاطر سے ہر وہ خدمت بجالانے کے لئے حاضر ہوں جو میرے امکان میں ہے، سرداروں کو مناسب ہدایت کر دی گئی ہے۔ آئندہ کوئی مرہٹہ سردار جناب کے خلاف کسی فعل کی جرأت نہ کر سکے گا۔ مجھے آپ کی ذات سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز محبوب نہیں۔"

سوامی جی کی خدمت میں شاہو اکثر تحفے تحائف بھی بھیجا کرتا تھا۔ سوامی جی بہت بڑے شہسوار تھے، اعلیٰ نسل کے گھوڑے تلاش کر کے منگواتے اور اپنی سواری میں رکھتے تھے معتقدین علاوہ دیگر لوازمات کے گھوڑے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہو نے اپنی پائیگاہ کے چار منتخب گھوڑے سوامی جی کے پاس بھیجے اور درخواست کی کہ ان میں سے پسند کر کے قبول فرمالیں۔

سیواجی کے خاندان میں شاہو آخری شخص تھا جسے مرہٹہ حکومت پر کچھ اثر و اقتدار حاصل تھا۔ شاہو جی چونکہ ناز پروردہ تھا اس لئے اہم معاملات سلطنت کو سر انجام دینے سے گھبراتا تھا۔ اپنی عیش پرستی کی وجہ سے پیشواؤں کے خاندان کی بنیاد خود اسی نے ڈالی تھی، اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مرہٹہ حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک وہی لوگ ہوگئے۔ اور یہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ تاہم اپنے خاندان کا یہی آخری شخص تھا جسے باوجود پیشواؤں کے غلبہ کے کچھ قوت نصیب تھی۔

شاہو اور پیشوا کی طاقتیں آپس میں برابر ٹکراتی رہتی تھیں، اور اس کا نتیجہ ہمیشہ پیشوا کی فتح اور شاہو کی شکست کی صورت میں مترتب ہوتا تھا۔ ان متضاد حالات کے درمیان قطعی غیر ممکن تھا کہ کوئی فرد واحد ان دونو شخصیتوں کا معتمد علیہ ہو سکے۔ مگر سوامی جی نے وہ عاقلانہ تدابیر اختیار کی تھیں کہ دونوں انھیں اپنا معتمد سمجھتے تھے، اور ضروری امور میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔

دوسرے پیشوا باجی راؤ کی تو یہ حالت تھی کہ بغیر سوامی جی کے مشورہ کے کوئی کام شروع ہی نہیں کرتا تھا۔ یہی حال "آپا" صاحب" کا بھی تھا۔ پیشوا کے یہاں سے ہندوستان کے دوسرے درباروں کو جو مراسلت ہوتی تھی پہلے وہ سوامی جی کے سامنے پیش کی جاتی تھی، یہ بغور ہر ایک کا مطالعہ کرتے تھے ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ جنگ کے اسباب، صلح کی شرطیں، ریاست کے اصول سب میں ان کی رائے شامل ہوتی تھی۔ گویا پیشوا کے دربار میں جس قدر امور معرض ظہور میں آتے تھے۔

وہ سب انھیں کی عقل کے سرچشمہ سے نکلے تھے۔

سوامی جی کی اعانت صرف صلاح و مشورہ ہی تک ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ کثیر مالی امداد بھی پہنچاتے رہتے تھے۔ ضرورت کے وقت پیشوا کو بیش قرار رقمیں قرض دیتے تھے۔ اکثر اوقات جب جنگ جاری ہوتی تھی اور روپیہ ختم ہو جاتا تھا اور کہیں سے آمد کا کوئی سہارا باقی نہ رہتا تھا تو ایسے نازک وقت میں پیشوا سوامی جی ہی کی عنایت کا طالب ہوتا تھا، اور یہ اُس کی منہ مانگی مراد پوری کر دیتے تھے۔

سوامی جی کے مزاج میں سختی بھی بہت زیادہ تھی، اُن سے مشورہ لینے کے بعد جب کوئی کام اُس کے خلاف ہوتا ہوا دیکھتے تھے تو اُسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بطور احتجاج کے برت رکھنا شروع کر دیتے تھے۔ اپنے مطالبات منوانے کے لئے جس طریق عمل کے گاندھی جی موجد خیال کئے جاتے ہیں، سوامی جی آج سے دو سو سال پہلے اُس پر کاربند ہوتے تھے۔ اس قسم کی صورت حال واقع ہونے پر پیشوا خود سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اُن کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اُس زمانہ میں کسی حکومت کی طاقت فوج کی کثرت اور اس کے نظام پر منحصر تھی۔ پیشوا کو دو کام انجام دینے پڑتے تھے، ایک اپنے حدودِ حکومت کو بڑھانا، دوسرے اپنے مقبوضات کو حریف طاقتوں سے محفوظ رکھنا۔ اِن دونوں کاموں کے لئے کثیر فوج اور فوج کے لئے کثیر رقم کی ضرورت پیش آتی تھی۔ پیشوا کا خزانہ اگرچہ مختلف ذرائع سے روپیہ حاصل کر کے بھرا جاتا تھا لیکن ان اخراجات کی وجہ سے ہمیشہ خالی ہی رہتا تھا۔ مجبور ہو کر ساہوکاروں سے روپیہ قرض لینا پڑتا تھا۔ عرصہ تک ادائگی نہ ہونے پر وہ بھی ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ ان حالات کے دوران میں جب مرہٹہ طاقت کی ناؤ ڈوبنے کے قریب ہوتی تو سوامی جی روپیہ کے زور سے اُسے پھر ترا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ باجی راؤ سوامی جی کا بہت قرضدار ہو گیا تھا۔ باوجود کوشش کے کہیں سے روپیہ نہیں آیا۔ ادھر انھوں نے سختی سے تقاضے شروع کئے۔ پیشوا نے تنگ آکر انھیں ایک خط لکھا۔ اس میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"قرض کا اس قدر بار ہو گیا ہے جس کے برداشت کرنے کی اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اب یہی چاہتا ہے کہ خودکشی کر کے اس زندگی کی کشمکش سے نجات حاصل کر لوں۔"

لہ پیشوا کا دفتر جلد اوّل صفحہ ۱۹ و ۴۸ سلہ صفحہ ۱۱۳ - ۱۶۵ سلہ صفحہ ۲۰ [illegible] ... ۳۷

ایک اور خط میں لکھتا ہے:۔

"میں قرض کے ایسے جہنم میں داخل ہو گیا ہوں جہاں قدرت نے ساہوکاروں کو عذاب دینے کے لئے مجھ پر مسلط کر دیا ہے۔ میں نے اپنے قرضخواہوں کے قدموں پر اس قدر جبیں سائی کی ہے کہ میری پیشانی گھس گئی ہے۔"

یوں تو مرہٹہ حکومت کی ہر تحریک سوامی جی کے دماغ کی تخئیل ہوتی تھی، مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ مرہٹوں کو پرتگیزوں کے خلاف آمادہ کرنا ہے جو جنگ بسین کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ پرتگیز بسین میں آہستہ آہستہ اپنی قوت بڑھا رہے تھے کہ آگے چل کر مرہٹہ طاقت کے لئے مستقل خطرہ ثابت ہوں پیشوا باجی راؤ باوجود اپنی سیاسی تجربہ کاری کے اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ مگر سوامی جی کی دُور رس نگاہ نے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر کے باجی راؤ پر پرتگیزوں کے استیصال کے لئے زور ڈالنا شروع کیا۔ آخر باجی راؤ نے "آپا صاحب" کے ماتحت پرتگیزوں کے خلاف ایک فوج بھیجی۔ اس نے بسین کا محاصرہ کیا اور پرتگیزوں کو شکست ماننا پڑی۔ اس واقعہ سے مرہٹہ حکومت کو ایک قریبی خطرہ سے نجات حاصل ہو گئی۔

سوامی جی کو باجی راؤ سے خاص محبت تھی۔ سیاسی اُمور میں اُن کی سرگرمیاں اُس محبت کا عملی ثبوت تھیں۔ ۱۷۴۰ء میں باجی راؤ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے سوامی جی نے دنیاوی معاملات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپا صاحب نے بھی دنیا کو خیرباد کہا۔ سوامی جی کی عمر بھی کافی زیادہ ہو چکی تھی، اِن صدموں نے ان کی روح کو اور بھی گھلا دیا، آخر ۱۷۴۵ء میں اس عالمِ فانی سے خود بھی رخصت ہو گئے۔

سوامی جی کے حالاتِ زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی قوم کے دینی پیشوا تھے، بلکہ اُس کے سیاسی رہنما، زبردست مُدبّر اور میدانِ عمل کے شہسوار بھی تھے۔ آج جبکہ ہندوستانی قومیت انتہائی نازک دَور میں سے ہو کر گزر رہی ہے، اور سیاست کی راہ میں ہر قدم نہایت احتیاط کے ساتھ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ ملک کے لئے ایسے لیڈر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جو صرف اُمورِ دُنیوی کی اصلاح میں مہارتِ کامل رکھتے ہوں مگر روحانی اور اخلاقی رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں۔ نہ ایسے مقدس بزرگ کارآمد ہو سکتے ہیں جو دین کی تلقین میں دنیا سے قطع نظر کر لیں۔ بلکہ ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے

[illegible]

جو اِن دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم کرکے ملک کی ایسی رہبری کریں کہ سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ صفائے نفس اور پاکیزگیِ اخلاق کے اوصاف بھی مترتب ہوتے رہیں تاکہ ہندوستانی قوم ہر اعتبار سے دوسری قوموں کے سامنے امتیازی درجہ حاصل کر سکے۔ اِسی کی اس وقت کمی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔

واردات

(از حضرت مضطر نعمانی)

کیفیتِ تباہیِ ارماں نہ پوچھئے — کس نے بنا دیا مجھے انساں نہ پوچھئے
اُف حسن ہو رہین حجاب تعینات — دیر و حرم ہیں بے سر و ساماں نہ پوچھئے
اب لے اُڑا ہے شوق دیارِ حبیب کو — ہم سے نزاعِ گبر و مسلماں نہ پوچھئے
مضمر ہیں میری ذات میں لاکھوں تجلیاں — ذرّاتِ دل میں جوشِ بداماں نہ پوچھئے
جس غمزدہ کا بیڑا ہو غرقابِ بیخودی — اُس سے حکایتِ شبِ ہجراں نہ پوچھئے
حیرت سے بن گیا ہوں میں اک پیکرِ سکوت — احباب نے کیا ہے جو احساں نہ پوچھئے
نیرنگیِ حیات نے دیوانہ کر دیا — بس چھوڑ دیجئے مرادِ اماں نہ پوچھئے
دنیائے بے وفا میں مری سادگیِ دل — وہ کر رہی ہے جورِ فراواں نہ پوچھئے
وہ جنبشِ نگاہ ہے اب ضامنِ حیات — ہم سے ہمارا حالِ پریشاں نہ پوچھئے
دامن کرم کا تھام کے بیہوش ہو گئے — یہ دل ہے یا کہ جنتِ عصیاں نہ پوچھئے
بادِ خزانِ آہ سے ہمدم بہارِ دل — جس درجہ ہوتی رہتی ہے ویراں نہ پوچھئے

المختصر کہ مضطرِ بے خانماں سے آپ
جز قصہ ہائے جورِ عزیزاں نہ پوچھئے

نادار طالب علم

(از ابوالفضل راز چاندپوری)

اک طالبِ علم و ہنر جویائے رازِ زندگی
معصوم صورت، خوش نظر جلوہ طرازِ زندگی
جس کی جبیں سے ہے عیاں
فطرت کے اسرارِ نہاں

افسردہ و اندوہ گیں بیٹھا ہوا ہے مضمحل
گویا کوئی ایسا نہیں جو ہاتھ میں لے اُس کا دل
خاموش ہے، دلگیر ہے
حسرت کی اِک تصویر ہے

شمعِ جمالِ علم کا لاریب وہ پروانہ ہے
حسنِ کمالِ علم کا دیوانہ ہے، دیوانہ ہے
مانع مگر ہے مُفلسی
تکمیل ذوقِ علم کی

رہ رہ کے یوں اُس کی نظر اُٹھتی ہے سوئے آسماں
جیسے کوئی بے بال و پر مہجور کُنجِ آشیاں
آمادۂ فریاد ہو
رنجور ہو، ناشاد ہو

اے باغبانِ کم نظر اے خود غرض، اے بے وفا
شاید نہیں تجھکو خبر اے نو بہارِ خوش ادا
یہ لالہ رُخ، یہ نوجواں
ہے آبروئے گلستاں

یہ غنچۂ نورس ابھی واقف نہیں اِس راز سے
باغِ جہاں کی زندگی مملو ہے سوز و ساز سے
گھبرا نہ جائے یہ کہیں!
کمھلا نہ جائے یہ کہیں!

اے مالکِ لعل و گہر یہ وقت ہے ایثار کا
اُٹھ اور کارِ خیر کر جو فرض ہے زردار کا
ورنہ یہ دولت ہیچ ہے
سس کی حقیقت ہیچ ہے

کوئی انیس و آشنا سنتا نہیں آہ و فغاں
اب کیا کروں، تو ہی بتا اے مادرِ ہندوستاں
بچّہ ترا ناشاد ہے!
فریاد ہے، فریاد ہے!!

رباعیاتِ سرمد

(ترجمہ از سید مقبول حسین بی۔اے۔ ایڈیٹر)

در خوابی و از خویش نداری خبرے غفلت ندہد بجز ندامت ثمرے
یاراں ہمہ رفتند و تو ہم در راہی بر ہستیِ موہوم نداری نظرے

(ترجمہ)

اپنے جی کا ہوش نہیں پیارے تم ایسا سوئے چگ گئیں چڑیاں کھیت تو اب پچھتائے سے کیا ہو
سب ساتھی جا لگے ٹھکانے، تم رہے مورکھ بیٹھی مایا کا یا کارن تم کیوں آتم شوبھا کھوئے

(سرمد)

یارب ز منِ زار نہ بندد کارے جز معصیت و غفلتِ بیحد کارے
از کارِ گذشتہ کار آگاہ شدم کارے نشد از من کہ بباید کارے

(ترجمہ)

اے بھگت داتا ہم دکھیا سے کوئی کرم نہ چھوٹا پاپی من کی ڈھیل ڈھال میں بھاگ ہمارا پھوٹا

منشی پریم چند کی تشبیہات

از مسٹر نند لال مظلوم کیتھلوی مصنف "شعورِ متحرکہ"

جس طرح ایک کامیاب افسانے کے لئے اعلیٰ پلاٹ کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پلاٹ کو دلکش بنانے کے لئے عمدہ تشبیہات لازمی ہیں۔ افسانہ ہماری زندگی کا کوئی روشن یا تاریک پہلو نمایاں کرتا ہے، وہ کوئی سبق آموز یا تفریحی واقعہ ہوتا ہے اور نیک یا بد افعال کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جسے افسانہ نویس کا قلم الفاظ کا جامہ پہنا کر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ایک کامیاب انشا پرداز کے دل و دماغ پر جو اثر ہوتا ہے اُس کے بیان کے لئے وہ دل نشین تشبیہات کا محتاج رہتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی وہی چیز ہمارے دماغ پر زیادہ اثر کرتی ہے جسے ہم روزانہ کے واقعات میں محسوس کر سکیں۔ اس لئے قابل انشا پرداز ہمیشہ ایسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جو خواہ بظاہر معمولی ہوں لیکن غائر نظر سے دیکھنے والوں کو ان میں بحرِ معنی پوشیدہ دکھائی دیتا ہے۔

منشی پریم چند جی مرحوم بھی تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے منشی صاحب میں یہ خاص وصف تھا کہ وہ تشبیہات کو نہایت مختصر مگر آسان اور دل نشین الفاظ میں پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عبارت ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے دل و دماغ پر فوری اثر کر کے گھنٹوں محوِ حیرت بنائے رکھتی ہے۔ معمولی الفاظ میں وہ اپنا دلی مدعا اس طرح ادا کر جاتے تھے کہ ایک معمولی انشا پرداز اُس بات کے لئے کئی صفحات سیاہ کرنے پر بھی ایسی خوبی سے ادا نہ کر سکے گا اُن کی تشبیہات حقیقت کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے اپنے ناول "بیوہ" میں بیواؤں کی زندگی کا رقت انگیز مگر بالکل صحیح فوٹو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بیوہ کی عصمت پر الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے؟ ...... یہ وہ سفید چادر ہے جسے ہر شخص داغدار بنا سکتا ہے۔"

چند ہی الفاظ میں منشی صاحب نے ایک زبردست حقیقتِ حال کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، کون نہیں جانتا کہ بیوہ پر کس آسانی سے الزام لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے بیوہ

کی عصمت کو سفید چادر سے تشبیہ دے کر ایک عجیب و غریب اثر پیدا کر دیا ہے۔ جس طرح سفید چادر پر ایک ہلکا سا داغ اُسے بدنما بنا دیتا ہے، اسی طرح بیوہ کے چال چلن پر ایک بے بنیاد شک بھی اُسے لوگوں کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

پریم چند صاحب معمولی معمولی باتوں میں جو لطف پیدا کر دیتے ہیں اُسے دیکھکر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے آندھی کے وقت آسمان پر تنکوں کو اُڑتے ہوئے دیکھکر کچھ سوچا ہو۔ لیکن منشی صاحب "پریم پچیسی حصہ اول" کے ایک افسانہ میں ایک معمولی شخص کے اعلیٰ پوزیشن حاصل کرنے پر لکھتے ہیں:-

"ایک چھوٹا سا تنکا بھی آندھی کے وقت آسمان پر جا پہونچتا ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"کانچ کا ٹکڑا جب ٹیڑھا پڑتا ہے تو تلوار سے زیادہ کاٹ کر جاتا ہے۔"

حقیقت بھی ہے کہ کانچ کا ٹکڑا سیدھا پڑنے پر کاٹ نہیں کرتا مگر جب ٹیڑھا پڑتا ہے تو اپنے لب رنگین کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ تشبیہ ایک ایسے مقام پر دی گئی ہے جہاں یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ انسان اپنے دوست یا رشتہ دار کو کتنے دل سے ہنسی خوشی ہزار باتیں کہہ جائے مگر اس کا کوئی گلہ نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی معمولی بات بھی طنزاً کہہ دی جائے تو سننے والے کا خون غصہ سے کھولنے لگتا ہے۔

میرے خیال میں "رانی سارندھا" منشی صاحب کے بہترین افسانوں میں سے ہے بلکہ میں اسے مرحوم کا شاہکار خیال کرتا ہوں۔ اس افسانہ میں کئی حقائق زندگی کو اس خوبی سے صرف چند لفظوں میں ادا کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں خود بخود مصنف سے ایک دلی عقیدت پیدا ہو جاتی ہے آپ لکھتے ہیں:-

"دُنیا ایک میدان کارزار ہے، اس میدان میں اسی سپاہی کو فتح نصیب ہوتی ہے جو موقع اور محل سے فائدہ اُٹھانا جانتا ہے۔ وہ موقع دیکھکر جتنا آگے بڑھتا ہے خطرے کے وقت اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتا ہے، ایسے ایک ہی حکومتوں کی بنیادیں ڈالتے ہیں اور تاریخ اُن کے نام پر صدیوں تک تعریف کے پھول نچھاور کرتی رہتی ہے۔"

اِن چند الفاظ میں آپ نے دنیوی کامیابی کا ایک سب سے بڑا راز بے نقاب کر دیا ہے یعنی ہر دنیوی فتح و شکست کے لئے دانشمندی کی ضرورت ہے۔ محض طاقت کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی جس طرح میدان جنگ میں اندھا دھند آگے بڑھنے والا سپاہی شکست کھا بیٹھتا ہے اسی طرح دنیا کے نشیب و فراز

کی پروانہ کرکے سرپٹ دوڑنے والا شخص بھی اکثر زمین پر آگرتا ہے۔ اسی کہانی میں آپ نے ایک قریب المرگ بہادر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"جس طرح طائر گولی کھا کر پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا زمین پر آ رہتا ہے، اسی طرح جیت رائے پلنگ سے اُچھلے اور پھر بے جان ہو کر گر پڑے۔"

طائر کے پر پھڑپھڑانے اور ایک بہادر شخص کی آخری مگر ناکام کوشش میں کس قدر زبردست مشابہت ہے۔ یہ صرف زود فہم اصحاب ہی سمجھ سکتے ہیں، پرندہ گولی کھاتا ہے گو اُسے علم ہے کہ اب میرا زندہ رہنا امر محال ہے لیکن اس کے باوجود اپنے پر پھڑپھڑا کر بے رحم شکاری کے ہاتھوں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک بہادر شخص اپنے آپ کو موت کے بے رحم مگر مضبوط ہاتھوں میں پاکر بھی دشمن سے بدلہ لینے کے لئے اپنی آخری کوشش کئے بغیر نہیں رہتا۔

پریم چند صاحب میں ایک بہت بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ صفحات کا مطلب چند الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ آپ اپنے افسانہ "آسرا" میں افسانے کے کردار کو انتہائی مصیبت میں دکھانا چاہتے ہیں مگر اس کے لئے صرف یہی لکھ دیتے ہیں کہ

"تارا کی جان اس وقت تلوار کی دھار پر تھی"

آپ عام افسانہ نویسوں کی طرح اس کے مصائب کا ذکر کرکے اپنے ناظرین کے دماغ پر بار نہیں ڈالتے بلکہ اپنے مطلب کو صرف چند لفظوں میں واضح کر دیتے ہیں۔ ایک سمجھدار انسان سمجھ جاتا ہے کہ جس شخص کی جان ہمیشہ تلوار کی دھار پر ہوا سے ہر وقت کن کن مصائب کا سامنا رہتا ہوگا۔

چند بہادر آرام پرستوں کی طبیعت میں بہادری کا خیال دکھانے میں آپ ان الفاظ سے کام لیتے ہیں

"جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی سلگ جاتی ہے اسی طرح تکلیف کے دھیان سے ان میں بہادری کا سویا ہوا جذبہ بیدار ہو گیا۔"

اس تشبیہ میں بہادری اور آگ، آرام پرستی اور خاک، ہوا اور تکلیف کا رشتہ قابل غور ہے بہادری اور آگ ایک دوسرے سے اس لئے مشابہ ہیں کہ دونوں میں تیزی ہوتی ہے، دونوں دشمن کو خاک میں ملا دیتے ہیں جواب نہیں رکھتیں۔ آرام پرستی اور خاک دونوں چیزیں ایسی ہیں جن میں بہادری اور آگ ایسی متضاد چیزوں کے دبا دینے کی قوت موجود ہے، اور دونوں چیزیں اتنی قوت کی حامل ہونے کے باوجود اس قدر لطیف ہیں کہ تکلیف اور ہوا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہیں۔

منشی صاحب کو منظر نگاری کا بھی بڑا زبردست ملکہ تھا، اس کے ثبوت میں یہاں پر صرف ایک

تشبیہ پیش کی جاتی ہے جو یہ ہے :-

"درختوں کی کانپتی ہوئی پتیوں میں سے سرسراہٹ کی آواز نکل رہی تھی گویا کوئی فرقت زدہ روح پتیوں پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہو"

اس تشبیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ پتیوں میں سے ہوا کی سرسراہٹ اور فرقت زدہ روح کی سسکیوں کی مطابقت نے ہماری آنکھوں کے سامنے دونوں چیزیں اس کمال سے پیش کردی ہیں کہ سرسراہٹ اور سسکیوں میں چولی دامن کا ساتھ ہوگیا ہے۔ ایک ندی میں پانی کی کمی بیان کرنے کے لئے لکھتے ہیں :-

"ندی اونچے اونچے کناروں میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھی جس طرح کمزور دلوں میں جوش اور جرأت کا برائے نام جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے"

اونچے اونچے کناروں کو کمزور دل اور ندی کے پانی کی کمی کو جوش اور جرأت کا برائے نام جذبہ بتاکر خوبی پیدا کرنا صرف منشی صاحب ہی کا کام تھا۔

چونکہ منشی پریم چند کو اپنی زندگی میں کئی بار انتہائی مایوسی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں مایوسی میں گرفتار لوگوں کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں اُن میں حد سے زیادہ حسرت پائی جاتی ہے۔ دنیا کی بے قدری سے تنگ آئے ہوئے شاعر کے ان لفظوں میں کتنا درد ہے :-

"میں چراغ ہوں اور جلنے کے لئے بنا ہوں"

بیکس، غریب انسان پر جب ناجائز رعب ڈالا جاتا ہے اُس وقت اس کی حالت اور منشی صاحب کے الفاظ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ہے :-

"بیچارہ غریب آنکھوں میں آنسو بھرے چپ چاپ مورت کی طرح گالیاں سُن رہا تھا، جیسے کسی نے اُسے قتل کردیا ہو"

یعنی قتل ہوجانے کے بعد انسان جس طرح پتھر کی مورت کی طرح بے حس وحرکت ہوجاتا ہے۔ بیچارہ غریب اسی طرح خاموش تھا

عورت کی آزادی کس قدر خطرناک ہوتی ہے، اُسے جدید تہذیب کے دیوانے نہیں سمجھ سکتے منشی اس کی بابت لکھتے ہیں

"وہ آزاد تھی، دریائے سندھ کی طرح جس کی روانی کے سامنے عالی شان شہر ... ہوجاتے ہیں"

یہ تشبیہ کس قدر سبق آموز اور آئے دن رونما ہونے والے واقعات کا صحیح نقشہ

عورت کے اوسان کس قدر جلد خطا ہو جاتے ہیں ان کا نقشہ منشی صاحب نے اپنے افسانہ "جواں مرگی" میں کھینچا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے "شکرے کے چنگل میں پھنسی ہوئی فاختہ کی طرح کامنی کے ہوش اڑ گئے۔" کیسا پُر معنی فقرہ ہے جس نے چند ہی لفظوں میں پُورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔

انسان کس قدر خود غرض واقع ہوا ہے اس کا ذکر بھی منشی صاحب نے اپنے ایک افسانہ میں اس مقام پر کیا ہے جہاں ایک عورت کے بوڑھی ہو جانے پر اس کے خاوند کی بے التفاتی قلمبند کی ہے فرماتے ہیں:-

"لالچی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے نقطہ ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب تک دودھ دے سکتی ہے اور نہ کچھ بڑے تو اس کے لئے گئوشالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں:"

یہ تشبیہ نہیں ہے بلکہ تازیانہ ہے جو منشی پریم چند نے مردوں کی خود غرضی پر لگایا ہے۔ عیب کو اگر عیب کہا جائے تو ہم لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، کونین کی گولی جب شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے تو آسانی سے حلق کے نیچے اتر جاتی ہے۔ منشی صاحب بوڑھی عورت کی بے قدری کو دوسرے الفاظ میں پیش کر سکتے تھے مگر ایک بوڑھی گائے کے مثال سے انھوں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں، واقعی بعض لوگ کس قدر خود غرض ہوتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے

منشی پریم چند اپنے افسانوں میں جب مذاق پر اتر آتے ہیں تو ان کی تشبیہات اس قدر پُر مذاق ہوتی ہیں کہ انسان ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائے۔ ایک مزاحیہ افسانہ "ڈھپوڑ سنکھ" نامی میں پریم چند صاحب نے دکھایا ہے کہ ایک شخص اپنے دوست سے واقعہ بیان کر رہا ہے اس کی بیوی اُسے کہیں کہیں ٹوک دیتی ہے، خاوند بیوی کو کئی بار منع کرتا ہے مگر بے سود۔ ایک موقع پر تنگ آ کر کہتا ہے:- "بیچ بیچ میں ٹوکو مت، عدالت کی توہین ہوتی ہے"۔ یعنی بیوی کو اس قدر لطیف جھاڑ دی ہے کہ بیوی بھی خاموش ہو جائے اور دوست اسے ... ہی سمجھے اور افسانہ پڑھنے والے بھی ہنس ہنس کر دوہرے ہو جائیں۔

... منشی صاحب میں تشبیہات پیش کرنے کا خداداد ملکہ تھا، اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یقیناً موجودہ ... بہتر اور موثر تشبیہات پیش کرتے۔ کیونکہ بقول ایڈیٹر صاحب "زمانہ" عمر کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات ... تھی۔ لیکن جس طرح گذری ہوئی لہر اور بکھری ہوئی خوشبو ہاتھ نہیں آسکتی، اُسی طرح ... آنا بھی ناممکن ہے۔ البتہ ہم اُن کے شاہکاروں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

تنہائی

(از حضرت دردؔ کاکوروی)

تو تخیل کی ہے دوشیزہ، تصور کی پری
مائلِ وحشت نہ کیوں ہو قلبِ مضطر ہر گھڑی

یہ دلِ وحشی ہے تیری زلف میں اُلجھا ہوا
لاکھ ہو لے فکر پر ہے فکر میں ڈوبا ہوا

کیوں نہ تیری معتقد ہو ہستیِ فانی مری
ہے ترے عنواں سے ظاہر تیرہ سامانی مری

تجھ میں ہے کچھ جذب ایسا اور کچھ ایسی کشش
نکلے ہے تصویر پھرتی درد و حسرت کی خلش

شارمِ تنہائی۔ جوانی کے ترنم نغمہ کوش
جیبِ وحشت چشمِ تر ہے دم بدم گوہر فروش

چاک دامانی ہوئی تو دامنِ صحرا ملا
بخیۂ صد چاک دل سے۔ دل کو یوں بہلا رہا

حامیِ جوشِ جنوں ہے تیری ہستی کی نمود
وحشت ہے آزارِ خاطر کے لئے تیرا وجود

تیری زلف و رخ سے ظاہر ہے پریشانی مری
تیری خلوت، تیری جلوت، خانہ ویرانی مری

یوں بیاباں میں نہ پھرتا ایک وحشی سر پھرا
تیرے دل میں کاش گنجائش اگر ہوتی ذرا

تو مری ہمدم ہے لیکن ایک ناصح کی طرح
ہو گوارا کیوں مجھے اعلانِ غم تیری طرح

مجھ کو یوں سمجھا رہی ہے سرد آہیں یوں نہ بھر
ہو سکے تجھ سے جہاں تک عشق کو رسوا نہ کر

دھوکے دیتی ہے مجھے تو، رات ہے یہ دن نہیں
تجھ سے تنہائی! علاجِ دردِ دل ممکن نہیں

تجھ میں برقی رو ہے پنہاں شدتِ احساس کی
تو وبالِ زندگی ہے یا مآلِ زندگی

عہد میں تیرے جو ہے صحرا نوردی کا وفور
ہے تغیر عشق کی فطرت، نہیں تیرا قصور

ہاں بغاوت تجھ سے ہے آئینِ الفت کے خلاف
کہہ گیا وحشت میں جو کچھ کر خدارا تو معاف

باعثِ مشقِ تصور بادۂ مستی تری
سوز و سازِ عشق کی تکمیل ہے ہستی تری

جلوہ گر ہر وقت ذرۂ دل سے کاشانہ ترا
میری حیرانی ہے یا ہے آئینہ خانہ ترا

زرتشت

از مسٹر محمد اسحاق ایم۔ اے

زرتشت کی پیدائش کی نسبت بہت سے قصے مشہور ہیں جو اسی طرح عجیب و غریب ہیں جسطرح کہ مشرقی توہمات کی بنا پر دوسری بزرگ ہستیوں مثلاً بدھ، عیسیٰ، کرشن، اور پیغمبر اسلام کے بہت سے بے سرو پا قصے بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک قصہ یہ ہے کہ زرتشت کی پیدائش سے بہت پہلے ایک مقدس روشنی اہورامزدا کی طرف سے زمین پر اتری، اور اُس گھر کی طرف چلی جہاں زرتشت کی ماں پیدا ہونے والی تھی چنانچہ یہ مقدس روشنی زرتشت کی ماں کے ساتھ ساتھ رہی، یہانتک کہ پندرھویں سال زرتشت کا جنم ہوا۔ یہ اس کا پہلا فرزند پارسیوں کا پیغمبر ہوا جسے اہورامزدا نے بھیجا تھا۔

لیکن اس کی پیدائش سے پہلے وہ لڑکی اسقدر خوبصورت اور حسین ہوگئی کہ اُس کے باپ نے شیطان کے بہکانے سے خیال کرلیا کہ اس لڑکی پر جادو کا اثر ہوگیا ہے۔ اس لئے اُس نے اُسے دوسرے گاؤں میں بھیجدیا۔ جہاں پوروشاسپ سے اُس کی ملاقات ہوئی اور اُس نے شادی کرلی۔

دوسری کہانی اس طرح مشہور ہے کہ دو فرشتے وہومن اور اشا وہشت آسمان سے زرتشت کی روح کو ہوما پودے کی ٹہنی میں جو قد آدم تھا لیکر نازل ہوئے، مدت تک یہ ٹہنی ایک چڑیا کے گھونسلہ میں محفوظ رہی، چڑیا کے بچوں کو سانپ کھاجایا کرتا تھا مگر اس ٹہنی کے اثر سے بچے محفوظ رہنے لگے اور موذی سانپ وغیرہ ہلاک ہوگئے اس طرح وہ ٹہنی چڑیوں کے لئے ایک عمدہ تعویذ ثابت ہوئی۔ بالآخر وہ روح منتقل ہوکر زرتشت کے باپ پوروشاسپ کے سپرد ہوئی۔

تیسری کہانی یہ ہے کہ زرتشت کی ماں دوگدھو کو ایک فرشتے نے شراب پیش کی جس کے پی لینے کے بعد زرتشت پیدا ہوا اور اس کی پیدائش ہی کے وقت اُس کی نبوت کی پیشگوئی ہوئی تھی، وہ شراب دراصل ہوما نامی بوٹی کا عرق تھا۔ جسے آتش پرستوں کے موبد خاص خاص عبادتوں کے موقع پر اب بھی استعمال کرتے ہیں۔

پیدائش کے وقت بچے عموماً رویا کرتے ہیں لیکن زرتشت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ خلاف معمول ہنس رہا تھا کہتے ہیں کہ جنات نے پہلے تو کوشش کی کہ وہ پیدا ہی نہ ہو، لیکن جب کسی طرح اُن کا بس نہ چلا، تو

اُس کی جان کے درپے ہوئے۔ توران کے موبد دوراسرو یونے جو اپنے وقت کا شداد و فرعون تھا۔ خاص طور پر زرتشت کے مارنے کی ہزاروں تدبیریں کیں، چنانچہ ایک مرتبہ اُس نے بچپن ہی میں زرتشت کا سر کچل دینے کا ارادہ کیا، اُس کے بعد اس نے ایک تیز چھرے سے گلا کاٹنے کا ارادہ کیا، لیکن اِس ناپاک کوشش کے وقت اُس کا ہاتھ شل ہوگیا۔

اِس ناپاک موبد کا اتنا اثر تھا کہ اُس نے زرتشت کے باپ پوروشاشپ کو اپنے بیٹے کی طرف سے بدظن کردیا۔ جس سے وہ اپنے بیٹے کی طرف سے بالکل بے پروا ہوگیا۔ ایک مرتبہ خود اس کے ایماء سے زرتشت کو دہکتی ہوئی آگ میں جلادینے کی سازش ہوئی، مگر ناکامیابی ہوئی۔ دوسری مرتبہ زرتشت کو بیلوں سے روندڈالنے کی کوشش کی گئی تو بڑے بیل نے بچے کو اپنے سایہ میں لے لیا تاکہ کوئی گزند نہ پہونچے۔

اسی طرح گھوڑوں سے روندڈالنے کی تدبیر کی گئی، لیکن وہ بھی ناکام ثابت ہوئی، اس کے بعد لوگوں نے زرتشت کو ایک بھیڑیے کے غار میں جس کے بچے مارڈالے گئے تھے ڈال دیا۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ بھیڑیے نے زرتشت کو ایذا پہونچانے کے بجائے اُس کو دودھ پلانے کا انتظام کیا۔

اِس طرح تمام دشمنوں سے بچکر زرتشت پرورش پاتا رہا۔ یہانتک کہ سات برس کی عمر میں باپ نے تعلیم و تربیت کیلئے ایک عالم کے حوالہ کردیا۔

جب زرتشت پندرہ سال کا ہوا تو دوراسرو یونے مباحثہ کیا جسمیں زرتشت نے ایسی عالمانہ اور مُدلل تقریر کی کہ سب لوگ قائل ہوگئے۔

جب زرتشت کی عمر تیس سال کی ہوئی تو بہت سی کرامتیں ظہور میں آئیں۔ مثلاً وہ سب کے دیکھتے دیکھتے دریائے دائتی کے پار اُتر گئے، اور ایک دوسری ندی کو بھی عبور کیا، علی الصباح وہ ایک تیسرے دریا کے کنارے کھڑے تھے کہ یکایک دکھن کیطرف سے ایک نورانی عصا جو نبوت کی نشانی تھی ہاتھ میں لئے ہوئے بہوتس کی مبارک صورت نظر پڑی۔

اس کے بعد زرتشت نے ایک تیسرے دریا کے عبور کرنے کا ارادہ کیا۔ جب وہ نزدیک پہونچے تو انھیں ایک پیکرِ دیو مثال سے جو انسان سے نوگنا بڑا تھا سامنا ہوا، اِس قوی ہیکل سروش نے زرتشت سے لباس اُتار ڈالنے کو کہا۔ جس کے بعد یہ قاصد زرتشت کی روح کو آہورا مزدا کے حضور میں لے گیا۔ اور اُسنے اپنے پیغام کا پہلا درس تلقین کیا گیا۔

پھر کامل دس برس کی ریاضت اور قرب الٰہی کے بعد زرتشت [illegible]

اور اپنے پیغام کا اعلان کیا، تمام شیطانی طاقتیں متحد ہوکر مقابلے [illegible]

تھی، اس لئے مخالفین کو شکستِ فاش ہوئی۔

ایک مرتبہ زرتشت کا گذر بادشاہ وشتاسپ کے دربار میں ہوا جہاں کے دہشتناک مظالم سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت سے اپنی اصلاحی تدبیروں کا آغاز کیا۔ وشتاسپ کو اپنا پیغام سُنا کر اُسے اپنے دین میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جب زرتشت نے بادشاہ کے دینی خیالات بیان کر دیئے تو وہ بہت حیران ہوا، مگر درباریوں نے اُسکی مخالفت کی۔ اور سازش کر کے زرتشت کی خوابگاہ میں چند آلات فنِ جادوگری اور سیمیا کے رکھوا دئے، اور اس جھوٹی تہمت پر انھیں قید میں ڈلوا دیا۔ اس پر ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ بادشاہ کا ایک پیارا گھوڑا چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ زرتشت نے قیدخانہ ہی سے اطلاع دی کہ اگر بادشاہ چار شرطیں منظور فرمائے تو گھوڑے کی چاروں ٹانگیں بدستور اپنی اصلی حالت پر آ سکتی ہیں۔ بادشاہ نے اُن شرائط کو منظور کر لیا۔ جنمیں پہلی شرط یہ تھی کہ گھوڑے کی پہلی ٹانگ کے اچھا ہونے پر بادشاہ زرتشت کا مذہب قبول کرے۔ اور دوسری ٹانگ درست ہونیکے پہلے اُس کا بیٹا اسفندیار مذہب زرتشت کیلئے جہاد کرے۔

تیسری شرط یہ ٹھہری کہ ملکہ بھی زرتشت کے مذہب کو قبول کرے۔ چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ اُن مجرموں کے نام بتائے جائیں جنھوں نے زرتشت کے خلاف سازش کر کے خوابگاہ میں جادو اور سیمیا کے آلات رکھوائے تھے، چنانچہ اُن کے نام بتائے گئے، اور اُنھیں سزائے موت دی گئی۔ اُس کے بعد گھوڑے کی چوتھی ٹانگ بھی درست ہو گئی اور وہ بدستور کودنے پھاندنے لگا۔

آج بھی ڈیڑھ لاکھ زرتشتی اس پیغمبر کے نام لیوا دُنیا میں آباد ہیں۔ اس قوم کے بزرگ زرتشت کی نسبت اپنے بچوں کو مذکورہ بالا کہانیاں سُنایا کرتے ہیں اور اس مذہب کی تعلیم دیتے ہیں، زرتشت کی سالگرہ کے دن عورتیں اپنے زرق برق لباس میں اور مرد سفید کپڑوں میں ملبوس ہوکر، سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپیاں پہنکر آگیاری میں اپنے آقا کی روشن کردہ آگ کی پرستش کرنے جایا کرتے ہیں۔

الہامی مناظر

(از حضرت نکہت شاہجہانپوری)

اونچی اونچی چوٹیوں پر مہرِ تاباں دیکھنا
اور فضائے کوہ کو عظمت بداماں دیکھنا

دامنِ صحرا میں وہ ٹھنڈی ہوا کی شورشیں
اور ان کے نغمۂ رنگیں گل افشاں دیکھنا

جھومنا شاخوں کا وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے
اور طیورِ نغمہ زن کو زمزمہ خواں دیکھنا

وہ عروسِ صبح کے رخ پر شعاعِ زرنگار
اور طلوعِ مہر سے عالم درخشاں دیکھنا

آبشاروں کا وہ چلنا اور دنیائے سکوں
اور چشموں یا کہ فواروں کو رقصاں دیکھنا

گھاٹیوں پر ابرِ کہساری کا اٹھ کر جھومنا
اور چمک میں برق کی دشت و بیاباں دیکھنا

ہاں اسی سنسان دنیا میں وہ بادل کی گرج
وہ پرندوں کا جھجکنا اور پر افشاں دیکھنا

موتیوں کے ہار کی صورت میں بارش کی بہار
اور گل و گلزار و برگ و بار خنداں دیکھنا

عالمِ حیرت میں وہ پگڈنڈیوں کے پیچ و خم
اور پہاڑی سلسلے داماں بداماں دیکھنا

شام کی آمد پہ یہ سب عالمِ پست و بلند
رفتہ رفتہ پردۂ ظلمت میں پنہاں دیکھنا

ہاں شفق کی سرخیوں میں سطحِ دریا کا سماں
اور موجوں کو بہم دست و گریباں دیکھنا

چاندنی راتوں میں لہروں کا چمکنا بار بار
اور نقابِ ابر میں مہتاب پنہاں دیکھنا

ہاں اندھیری میں ستاروں کی وہ ہلکی روشنی
اور فضائے چرخ کو رشکِ گلستاں دیکھنا

ظلمتِ شب کی فضا میں جگنوؤں کی وہ چمک
اور جبینِ حسنِ فطرت کو پُر افشاں دیکھنا

ہاں کسی محفل میں ساقی کی نگاہیں دلربا
یا کسی مہوش کے گیسوئے پریشاں دیکھنا

ہاں گنہگاروں کی دنیا میں ندامت کا خمار
اور دستِ توبہ کو رہ رہ کے لرزاں دیکھنا

دیکھنا ہاں دیکھنا نکہت کو بھی اہلِ نظر
اس کو ہر انداز میں اندازِ جاناں دیکھنا

سوا روپیہ

از بابو پرتاپ بہادر پردھان بی۔اے، ایل ایل بی

جناب! یہ بیس آنے یا اسی پیسوں والا سوا روپیہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ سوا روپیہ ہے جو دینے والوں کی جیب سے نہ معلوم کتنی مرتبہ اسی پیسے نکلوا تا ہے اگرچہ دینے والوں کو صرف ایک حقیر سی رقم معلوم ہوتی ہے ہندوؤں میں جب کسی پنڈت دیوتا سے پوجا پاٹ یا کوئی دوسری مذہبی رسم ادا کرائی جاتی ہے، وہ بار بار "دھرم کا" کی رٹ لگا کر نہ معلوم کتنی رقم بٹور لے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی شخص کا کچہری میں کام پڑتا ہے، تو اس کی بھی سوا سوا روپیہ کی معمولی رقموں کی صورت میں نہ معلوم کتنی حجامت بنا دی جاتی ہے۔ مثلاً دور کیوں جائیے، گذشتہ بقرعید کے ہی واقعات لے لیجئے۔ مقامی حکام نے عید سے ایک دن پہلے تحفظ امن و امان کے خیال سے بارہ بجے سے چار بجے تک سیکڑوں مشتبہ چلن آدمی گرفتار کرکے جنمیں سے بہت سے گنگا کنارے کے عظیم الشان سرکاری مہمان خانہ میں پہونچا دئے گئے۔ ان لوگوں پر جو گذری ہو اس کی کیفیت تو کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں۔ البتہ ان لوگوں کے اعزا و اقربا کی جو حالت ہوئی وہ ناگفتہ بہ تھی۔

ایک صاحب جن کے چچا گرفتار ہو گئے تھے، اُن کو ضمانت پر رہا کرانے کی غرض سے کچہری پہونچے، وکیل صاحب سے ملے۔ اور عرض کیا۔

"چچا میاں کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ برس دن کا تہوار ہے۔ اگر ضمانت پر رہا کرا دیجئے بڑی مہربانی ہوگی"۔

صاحب "اجی یہ کون بڑی بات ہے۔ آخر جرم تو قابل ضمانت ہے ہی۔ منشی جی سے درخواست لکھوائیے، وکالت نامہ بھروائیے، میں ابھی ابھی اجلاس سے آتا ہوں۔ (محرر سے) منشی جی! یہ ہمارے خاص آدمی ہیں۔ ان کا کام ذرا جلدی کر دیجئے۔

محرر کے حوالے کرکے وکیل صاحب اِدھر اُدھر گپ شپ اڑانے چل دئے۔

"ہاں صاحب تو دام نکالئے، پھر میں اپنا کام کروں"

کیا خرچ ہوگا؟

جیل گنگا کنارے سرسیا گھاٹ پر ہے۔

منشی جی:- ایک درخواست بارہ آنہ، وکالت نامہ بارہ آنہ، کاغذ ایک آنہ، متفرق سوا روپیہ، تحریر اور محنتانہ اس کے علاوہ!

مُوکل۔ اور یہ متفرق کیا چیز ہے؟

منشی جی "آپ خود دیکھتے جایئے، اور خود اپنے ہاتھ سے خرچ کیجئے۔ مجھے تو صرف کاغذ اور ٹکٹ منگوا دیجئے۔"

موکل بیچارہ نے ایک روپیہ نو آنے داخل کر دئے۔ منشی جی نے ایک سرسری سی درخواست لکھی، اور وکالت نامہ کی خانہ پُری کر کے، وکیل صاحب کو تلاش کیا۔ وکیل صاحب درخواست لے کر عدالت میں تشریف لے گئے۔ اسوقت اتفاق سے حاکم اجلاس کسی ضرورت سے باہر تشریف لیگئے تھے۔ پیشکار صاحب موجود تھے۔

"ایک ضمانت کی درخواست ہے، پیشکار صاحب!" وکیل صاحب نے کہا۔

پیشکار "ارے اِس وقت۔ سوال خوانی بارہ بجے ہوتی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اور اب تو تین بجے ہیں۔ وکیل صاحب لاچاری ہے۔"

"اجی گرفتاری بھی تو بارہ بجے کے بعد ہوئی تھی۔" وکیل صاحب نے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے! ذرا سینئے گا۔ اور ہمارا..... " پیشکار نے اشارتاً کہا۔

"ابھی لیجئے جناب! (موکل سے) خان صاحب ذرا چپراسی کو ..." وکیل نے کہا۔

غرض چپراسی کو ایک روپیہ چار آنہ حق دیدیا گیا۔ اور چپراسی نے اجلاس میں [illegible] اشارتاً کہا۔ "پیشکار صاحب! بابو صاحب کا کام جلد کر دیجئے۔"

"اچھا دیکھا جائے گا (وکیل سے) آپ تشریف رکھئے۔ حاکم کے آتے ہی درخواست پیش کر دو[illegible] میں خود تو دے نہیں سکتا، کیونکہ سوال خوانی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن میں کوشش کرونگا کہ [illegible] طرح پیش ہو جائے۔" پیشکار نے کہا۔

حاکم اجلاس کے آتے ہی وکیل صاحب نے درخواست پیش کی۔ جس نے گھڑی کی طرف [illegible] کر کے کہا: "تین بجکر دس منٹ ہو چکے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں میرے یہاں سوال خوانی بارہ بجے ہوتی ہے"

"بجا ارشاد فرمایا حضور! مگر یہ گرفتاری بھی تو بارہ بجے کے بعد ہوئی تھی۔"

"معلوم نہیں پولیس نے کاغذات بھی بھیجے ہیں یا نہیں۔ اور جرم قابل ضمانت ہے یا نہیں"

"حضور پولیس سے رپورٹ طلب فرمائیں" پیشکار نے صلاح دی۔

"اچھا لائیے، چونکہ معاملہ ارجنٹ ہے، میں اس پر حکم دے [illegible]

"دیکھا خان صاحب آپ نے! میں نے آپ کا کام کس قدر جلد کرا دیا۔ اگر میں نہ ہوتا تو یقیناً آج حکم نہ ہو سکتا" وکیل نے موکل سے کہا۔

"آپ کی مہربانی ہے، آپ مدد نہ کریں گے تو پھر کون کریگا۔ اب شام تک چھوٹنے کی امید ہے نا؟" موکل نے پوچھا۔

"وہ تو ہے ہی! اب آپ محرر سے بات چیت کیجئے اور انھیں ہیڈ اجلاس کے پاس لے جائیے" وکیل نے کہا۔

خانصاحب منشی جی کے پاس پہونچے تو اُس نے پوچھا۔ "کہئے خان صاحب کیا ہوا؟"

"پولیس کی نسبت کچھ حکم ہوا ہے۔ بابو صاحب دیکھ آتے ہیں"

"پولیس سے تو رپورٹ طلب نہیں ہوئی ہے؟"

"ہاں ہاں جی! مگر یہ پولیس کی رپورٹ کیسی؟"

اجی کچھ نہیں، ابھی چل کر ہیڈ اجلاس سے رپورٹ لکھائے دیتا ہوں۔ آپ بیٹں آنے نکالئے اور رپورٹ جلد بھجوائیے۔

"بیٹں آنے تو میں نے ابھی دئے تھے؟"

"وہ تو پیشکار کو دئے ہوں گے"

"اچھا خیر یہ بھی دئے جائیں گے۔ آپ کوشش کر دیجئے"

خان صاحب اور منشی جی دونوں ہیڈ اجلاس کے پاس گئے، اور منشی جی نے کہا۔

چیف صاحب! یہ میرے خاص دوست ہیں۔ ان سے میرے بہت پُرانے تعلقات ہیں۔ کم بخت دفعہ ۱۰ میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ضمانت کی درخواست پر پولیس کی رپورٹ طلب کی گئی ہے، ذرا جلدی کر دیجئے"

جب ہمیں کام زیادہ ہوتا ہے، اُسی روز آپ کی رشتہ داریاں نکلتی ہیں۔

"میرے تعلقات کا خیال نہ کیجئے۔ اپنا حق لیجئے اور ذرا جلدی کام کر دیجئے"

"منشی جی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ کاغذات کا ڈھیر اور یہ سائلوں کی بھیڑ"

"چیف صاحب! (سوا روپیہ جیب میں ڈال کر) مہربانی کر کے جلدی کیجئے"

"اچھا بتائیے عنوانِ مقدمہ؟"

"دفعہ ۱۰ ضابطہ فوجداری کا ہے۔ سرکار بہادر بنام علی بخش۔"

"دیکھا خان صاحب آپ نے؟ آپ کا کام کسقدر جلد ہو رہا ہے۔ اُفوہ! کا غذات کا کتنا ڈھیر تھا' آپ کا نمبر تو شاید پانچویں دن آتا۔"

"منشی جی آپ کا بڑا احسان ہوا۔"

"اچھا تو اب فوراً دو ضامن بلوائیے۔"

الغرض دو ضامن بھی آ گئے۔ مگر ضمانت نامہ لکھنے سے منشی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کسی عرائض نویس سے لکھوائیے۔ چنانچہ منشی جی نے اپنے ایک دوست عرائض نویس سے ضمانت نامہ لکھوا کر، سوا روپیہ اس کی بھی نذر کیا۔

اِس کے بعد یہ دقت پیش آئی کہ شناخت کون کرے؟ وکیل صاحب ایسا کرنے سے رہے' اس لئے مولوی امداد علی خان پنشنر کو اس کام پر آمادہ کیا گیا اور اُنھوں نے وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے ڈیڑھ روپیہ فیس اور آٹھ آنہ حق محرر لیا (حالانکہ کوئی محرر نہ تھا)۔

شام کو چار بجے کے قریب ضمانت نامہ مع رپورٹ پولیس پیش ہوا۔ اور پیشکار صاحب نے موکل اور محرر کی طرف اشارہ کیا کہ "ہاں!"۔

"جناب! میں ابھی تو آپ کو دے چکا ہوں۔"

"واہ واہ! وہ درخواست پیش کرنیکا حق تھا' اب ضمانت منظور کرائی دیجئے۔"

خان صاحب نے طوعاً وکرہاً سوا روپیہ نذر کیا۔

"اجی وکیل صاحب! آپ بھی جتنے پُرانے ہوتے جاتے ہیں، قاعدہ قانون بھولتے جاتے ہیں۔ اس وکالت نامہ پر کہیں ملزم کے بھی دستخط ہیں، جانتے وکالت نامہ اور درخواست ضمانت دونوں ناجائز!" پیشکار نے وکیل سے کہا۔

یہ سُنکر وکیل صاحب بہت سٹ پٹائے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کسی کے ہاتھ جیل بھیجکر فوراً دستخط کرا منگائیے۔ مگر جلدی کیجئے۔ صاحب اُٹھنے والے ہیں" پیشکار نے کہا۔

"اِس وقت تو یہ کام بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

"اجی نکالئے سوا روپیہ میں ابھی اپنے چپراسی سے دستخط کرا منگاتا ہوں۔"

سوا روپیہ چپراسی کا اور سوا روپیہ "وہاں کا" دیا گیا۔ اور یہ خدمت اردلی کے سپرد ہوئی۔ مگر اسی اثنا میں ڈپٹی صاحب اُٹھ گئے اور پوچھا۔

"پیشکار کوئی کام؟"
"حضور ضمانتوں کی بہت سی درخواستیں داخل ہوئی ہیں"
"اچھا تحصیل سے ضمانتوں کی تصدیق کرائی جائے"۔
"حضور علی بخش کی ضمانت دستی دیدی جائے۔ میں آج ہی تصدیق کرا لونگا"۔
ڈپٹی صاحب نے "بہت اچھا" کہا اور مع اردلی تشریف لے گئے۔
اُس وقت کسی کی توجہ اس بات کی طرف نہیں ہے کہ وکالت نامہ پر ملزم کے دستخط ہیں یا نہیں، آپ بھی کسی سے تذکرہ نہ کیجیئےگا"۔
"بہت اچھا۔ تو ضمانت نامہ جلدی دیجئے۔ ورنہ تحصیلدار صاحب اُٹھ جائیں گے تو تمام محنت خاک میں مل جائے گی"۔
"اچھا تو نکالئے سوا روپیہ"۔
"ابھی تو آپ دو مرتبہ لے چکے ہیں"
"تو جو دیا تھا اس کا کام نہیں ہوگیا۔ اب آپ دستی چاہتے ہیں تو درخواست دیجئے اور صاحب کے بنگلہ جاکر حکم لائیے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ چار روپیہ کی بچت کرا رہا ہوں۔ اور سوا روپیہ دیتے جان نکلتی ہے۔ احسانمندی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا"۔
مجبوراً سوا روپیہ اور نذر کیا گیا۔ اور وکیل صاحب ضمانت نامہ لے کر افتاں وخیزاں تحصیلدار صاحب کے یہاں گئے۔ جو اس وقت کسی کام میں مشغول تھے۔ وکیل صاحب نے پیشکار کو ضمانت نامہ دیا اور کہا کہ "ذرا جلدی کر دیجئے"۔
"ابھی لیجئے۔ مگر ضامن کون ہیں؟"
"ایک میر صاحب ہیں اور ایک شیخ جی"۔
"اور اُن کی شناخت کس نے کی ہے؟"
"مولوی امداد علی خان نے"۔
"وہ جو بڈھے سے ہیں۔ اُونھ اُن کی شناخت کون مانتا ہے۔ یہ بڑا ذمہ واری کا کام ہے"۔
اُس وقت کوئی اور نہ ملا تو اُنھیں سے شناخت کرائی گئی"۔ (سوا روپیہ پیشکار کے ہاتھ پر رکھکر جو کٹھرے کے پاس میز کے نیچے تھا)
"حضور ملزم بہت معزز شخص ہے۔ ضامن بھی معزز ہیں۔ جنھیں وکیل صاحب بھی جانتے ہیں"۔

پیشکار نے ضمانت نامہ پیش کرتے ہوئے تحصیلدار صاحب سے عرض کیا۔
"اچھا نائب صاحب سے رپورٹ لکھا کر چلتا کیجئے"۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا۔
خدا خدا کرکے شام کو چھ بجے کے قریب نائب تحصیلدار نے رپورٹ لکھی اور وکیل صاحب ضمانت لے کر حاکم کے بنگلہ پر گئے۔ جہاں معلوم ہوا کہ صاحب کسی انتظام کے سلسلہ میں شہر گئے ہوئے ہیں، انتظار کرتے کرتے آٹھ، نو، دس بج گئے۔ اور کہیں ساڑھے دس بجے کے قریب ڈپٹی صاحب تشریف لائے۔ اور وکیل صاحب کو برآمدہ میں بیٹھا دیکھ کر فرمایا: "کہیئے! اتنی رات گئے کیسے آئے"
حضور وہ ضمانت نامہ تو تصدیق ہوگیا ہے۔ اب پروانہ رہائی چاہئے"۔
"اب! یہ کوئی کچہری کا وقت ہے۔ نہ پیشکار، نہ اہلمد نہ ہیڈ اجلاس۔ کون پروانہ لکھیگا؟ اور اگر لکھا بھی گیا تو اس وقت ملزم کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ میرا حکم بھی بیکار ہو جائیگا۔ اس لئے کل تشریف لائیے"۔
مجبور ہو کر وکیل صاحب مع محرر و موکل واپس ہوئے۔ راستہ میں اہلمد صاحب مع چپراسی جاتے ہوئے ملے۔ جن سے وکیل صاحب نے پوچھا۔
"اہلمد صاحب! یہ رات کو گیارہ بجے کہاں؟"
"کیا عرض کروں ضمانت ناموں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اسی میں مصروف رہا۔ آپ فرمائیے، آپ اس وقت کہاں؟"۔
"کیا بتاؤں، وہی علی بخش والا معاملہ تھا۔ ضمانت منظور ہوگئی ہے۔ تصدیق ہوگئی، تحصیلدار صاحب کی رپورٹ درج ہوگئی، لیکن پروانہ رہائی نہ ملا"۔
"وکیل صاحب! یہ تو میرا کام تھا، پروانہ تو میں لکھتا ہوں۔ میرے پاس تو کاغذات بھی نہیں پہونچے، میں ڈپٹی صاحب سے یا کسی دوسرے حاکم سے دستخط کرا دیتا"۔
"ہاں یہ تو بیشک غلطی ہوئی، اچھا اب سہی"۔
"اب رات کو۔ آپکو بیکار ڈھائی روپیہ خرچ کرنا ہونگے، پہلے ہی کام سوا روپیہ میں ہو جاتا، کیا کبھی کیا نہیں؟"۔
"خیر کیا مضایقہ، دیر آید درست آید (ڈھائی روپے بڑھا کر) آپ یہ لیجئے اور کام کر دیجئے" (اندرانہ جیب میں سے پہونچگیا)
"کیوں بھئی آج تو بستہ میں بہت سے پروانے دھرے ہوں گے؟" اہلمد نے چپراسی سے پوچھا۔
"ہاں لایا تو ہوں، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی زائد فارم ہے کہ نہیں"۔ (خیر کسی ایک سے کام چل جائیگا)

وکیل صاحب، محرر، موکل سب اہلمد کے گھر گئے۔ جس نے بستہ کھولتے ہوئے پوچھا: "اتنی رات گئے آپ کہاں سے آرہے تھے؟"

"اسی پروانہ کے لئے حاکم کے بنگلہ پر گیا تھا۔"

"ہیں کیا آپ نے حاکم سے ذکر کر دیا؟"

"جی ہاں!"

"غضب کیا، اب مجبوری ہے۔ اگر حاکم تک بات نہ گئی ہوتی تو میں یقیناً آپ کو آج ہی پروانہ دلا دیتا۔ اب میں مجبور ہوں۔ آپ ناحق پریشان ہوئے اور ڈھائی روپے بھی برباد کئے۔ ڈھائی روپیہ کے پیچھے میں اپنی ملازمت تو کھو نہیں سکتا۔ لیکن کل انشاء اللہ نماز سے پہلے آپ کو پروانہ مل جائیگا اور ملزم چھوٹ جائے گا۔"

اثنا راہ میں محرر نے خان صاحب سے کہا۔ "حضور میری تحریرانہ اور وکیل صاحب کی فیس بھی تو ملنی چاہئے، جو صبح سے گیارہ بجے رات تک پریشان ہوئے ہیں۔"

"اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں، کل دیکھا جائیگا" خان صاحب نے کہا۔

"ہاں صاحب! یہ مروت کا نتیجہ ہے کہ نہ وکیل کی فیس ہے نہ محرر کی تحریر۔ خان صاحب کہیں اور گئے ہوتے تو ڈیڑھ سو ۱۵۰ روپئے خرچ ہو جاتے، پھر بھی درخواست پیش ہونے کی نوبت نہ آتی۔ یہ پہلے ہی وکیل صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ضمانت تو منظور ہو گئی۔"

"اچھا اس وقت تو معاف کیجئے۔ کل دیکھا جائیگا" خانصاحب نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"اچھا کل ذرا جلدی آئیگا، تاکہ حاکم کے باہر جانے سے پہلے ہی پروانہ پر دستخط کرا لئے جائیں۔ اور ہاں تین ۳ روپیہ آج اور تیس روپیہ کل کی فیس ضرور لیتے آئیگا۔ ورنہ ہمارے وکیل صاحب کام کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ پیشہ میں دوستی سے کام نہیں چلتا۔ محض آپ کی رعایت سے فیس اسقدر کم کر دیگئی ہے آپ نے تو خود دیکھ لیا کہ کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔"

دوسرے دن عید تھی۔ تمام حکام انتظام میں مصروف رہے۔ اسلئے کسی سے ملاقات نہ ہو سکی، اہلمد نے یہ کہکر ٹال دیا کہ اگر معاملہ حاکم تک نہ گیا ہوتا تو پروانہ رہائی مل جاتا۔ الغرض دوڑ دھوپ میں خان صاحب کی نماز بھی تشریف لے گئی۔ تیسرے دن جب نقص امن کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو سب ملزم چھوڑ دیتے گئے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ہر اہلکار کو صرف ایک حقیر سی رقم ملی، مگر سوا سوا روپیہ نکلتے نکلتے خانصاحب کا دیوالہ نکل گیا یہ ہیں کچہری والوں کے وہ ہتھکنڈے، جسے انگریزی داں طبقہ "ٹکا دھرم سسٹم" کہتا ہے۔ دیوانی کے معاملات اس سے بھی زیادہ نازک نوعیت کے ہوتے ہیں، جہاں فریقین مقدمہ برسوں دیوانہ بنائے جاتے ہیں۔

نغمۂ روح

(از سید مقبول حسین احمد پوری بی اے ایل ایل بی)

رگِ جاں میں تمھیں ہو اور تمھیں روحِ مجسم میں
تمھیں ہو عکس پیرا ہر طرف پہنائے عالم میں

تمھیں سے ذرہ ذرہ میں خلش ہے زندگانی کی
تمھیں نے آ کر ہلچل مچا دی قلبِ آدم میں

تمھارا ہی تبسم روح کی گہرائیوں میں ہے
تمھیں قلبِ حزیں میں ہو تمھیں جذباتِ پیہم میں

تمھیں سے ہے تپش دل میں تمھیں سے آنکھ میں شبنم
تمھیں ہو شادمانی میں خوشی میں رنج میں غم میں

تمھیں سے عزم اور ہمت تمھیں سے جی کو تقویت
تمھیں ہو ولولوں میں جوش میں کس بل میں دم خم میں

تمھاری یاد خلوت میں اٹھا لاتی ہے جلوت سے
مچلنے لگتے ہیں آنسو تمھیں سے چشمِ پُرنم میں

تمھیں تنہائی میں آ کر لپٹ جاتے ہو اِس دل سے
تمھارا ہی اثر کچھ ہے جو ہے کیفیتِ غم میں

تمھیں کون و مکاں میں ہو تمھیں سر و عیاں میں ہو
تمھارا ذکر ہوتا ہے ہمیشہ بزمِ عالم میں

تمھیں ہو جلوہ افگن روز و شب میں ماہ میں خور میں
وداعِ روزِ روشن میں سحر کے خیر مقدم میں

تمھیں نے کفر اور اسلام کے آئینے دکھلائے
تمھیں نے ٹھوکریں کھلوائیں تاویلاتِ مبہم میں

تمھیں نے یہ گھروندوں کا بنانا بھی سکھایا ہے
تمھیں بتخانۂ کاشی میں اور بیتِ معظم میں

تمھیں تھے نغمۂ داؤد میں اور کرشن کی نے میں
تمھیں تعلیمِ کنفوشس میں اور پیغامِ گوتم میں

تمھیں تھے نوح و ابراہیم و موسیٰ کی دعاؤں میں
تمھیں اخلاقِ روح اللہ اور توحیدِ صلعم میں

تمھیں دیکھے کوئی کیسے نہیں تم سے جدا کوئی
کوئی محرم بنے کیسے تمھیں ہو قلبِ محرم میں

تمنا ہے کہ یہ جانِ حزیں کچھ کام آ جائے
تمھاری مصلحت پوری ہو جب تک دم رہے دم میں

قطعہ

جھٹپٹے کے وقت کو نمے کا لپکنا بار بار
ظلمتوں پر مارتا ہے [illegible]

[illegible] تک [illegible] کی اندھیری راتیں
آدمی کے قلب کو رہ رہ کے [illegible]

(جوش [illegible])

تنقید کتب

رومی[1]

میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد پنجاب، ملک کے اُن محقق ادیبوں میں ہیں جو عربی فارسی جواہرات سے اُردو کے خزانہ کو مالا مال کر رہے ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے "لسان الغیب" کے نام سے حافظ شیرازیؒ کے فارسی دیوان کی شرح مع مقدمہ و سوانحعمری چار جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس کے بعد آپ نے "کاس الکرام" کے نام سے رباعیات خیامؒ کا ترجمہ شائع کیا۔ جس میں رباعیات کی ترتیب مضمون کے لحاظ سے رکھی گئی۔ اب میر صاحب نے "رومی" کے نام سے مثنوی مولانا رومؒ کا خلاصہ دو جلدوں میں مع مختصر سوانحعمری شائع کیا ہے۔

مسلمانوں میں قرآن شریف کے بعد جو ہر دلعزیزی مثنوی مولانا رومؒ کو حاصل ہے، وہ کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ خود مولانا کا دعویٰ ہے کہ ؎

من ز قرآں مغز ہا برداشتم   استخواں پیش سگاں انداختم

لیکن رومی میں میر ولی اللہ صاحب نے خود مولاناؒ کا "مغز" نکال لیا ہے۔

مثنوی مولانا رومؒ کو عموماً لوگ اخلاق آموز حکایتوں اور منازل تصوف سمجھانے والی کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ سمجھتے ہیں، لیکن میر ولی اللہ صاحب نے مثنوی کا مطالعہ ایک دوسرے زاویۂ نظر سے کیا ہے۔ اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب متفرقات فلسفہ و تصوف کا ایک غیر منظم مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ سعی و عمل جدوجہد و جہاد اور اُن کے متعلق دیگر مسائل کی ایک مسلسل اور جیتی جاگتی تصویر ہے

جن لوگوں نے "گیتا" کا بغور اور سمجھکر مطالعہ کیا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ کتاب سراسر سعی و عمل اور جدوجہد کی تعلیم سے معمور ہے۔ بقول میر ولی اللہ صاحب یہی حال مثنوی کا ہے۔ گیتا کی طرح مثنوی مولانا رومؒ میں بھی، فلسفۂ جہاد، زندگی اور موت کی حقیقت، دولت دنیا کی محبت، ایذا و عذاب کا خوف، توکل اور جہد، نفس کشی، حریت و آزادی، راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی، جاہ و مال کی ہوس، عشق اور آداب رسمی، مظلوموں کی حمایت، چاپلوسی کی مذمت۔ بزدلی کی بُرائی، اخوت و اتحاد، بقاء و فنا، صبر و عزم، موت سے ڈرنے کی حماقت، حرص و آز، دولت اور زندگی کی ناپائداری، جبر و اختیار، عزم و ایمان، بلا خیال نتیجہ کوشش

[1] دو جلدوں میں، قیمت فی جلد عہ   ملنے کا پتہ :۔ منیجر دارالاشاعت بادہ ناب ایبٹ آباد

کرنیکی ضرورت، فلسفۂ ارتقا، کوئی شے مطلق بُری نہیں، رہبانیت کی مذمت، خودی، تمام عالم ایک میدانِ جنگ ہے، دلجمعی کی خوبیاں، وغیرہ وغیرہ پر تسکین بخش دلائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں میر صاحب نے یہ ترتیب رکھی ہے کہ جس مضمون کی کوئی حکایت ہے، پہلے اپنے لفظوں میں اُس مضمون کو سمجھانیکی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے ضروری اشعار جلی قلم سے درج کرکے اُن کا نمبروار ترجمہ دیا ہے اس طرح تمام اہم اور ضروری مضامین مثنوی کے تمام دفتروں سے نکالکر دو جلد میں درج کردئے ہیں دوسری جلد کے آخر میں میر صاحب نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مختصر سوانحعمری بھی دیدی ہے ہمارے خیال میں فاضل مؤلف کی اس مبارک کوشش سے اُردو کی دُنیا میں بیش بہا اضافہ ہوگیا ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب ہر لائبریری میں رکھنے قابل ہے۔

ہمیں بعض جگہ میر ولی اللہ کے تشریحی نوٹوں سے اتفاق نہیں۔ مثلاً بانسری والی ابتدائی نظم کی تشریح کرتے ہوئے میر صاحب لکھتے ہیں:-

"بانسری یہی قصہ بیان کرتی ہے اور جدائی کی شکایت کرتی ہے کہ اس نیستان سے جہمیں تمام عدم قدم کے ساتھ متحد تھے، جب مجھے کاٹ کر علیحدہ کیا ہے، میرے نالوں سے مرد اور عورت رو رہے ہیں۔ مرد سے مراد خلاقِ وجود کے اسماء ہیں جو اطوار وجود میں فاعل ہیں۔ عورت سے مراد ممکنات کے اعیان ہیں جو اسماء وصفات سے اثر پذیر ہوتے ہیں"۔

ہمارے نزدیک "مرد وزن" سے مطلب کچھ اور ہے۔ حکماء کی اصطلاح میں اجرام سماوی کو "آبائے علوی" کہتے ہیں۔ اور موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات وحیوانات کو "امہات سفلی" سے تعبیر کرتے ہیں یہی "آباء" یعنی باپ (مرد) اور یہی "امہات" یعنی مائیں (عورت) ہیں جن کو مولانا رومؒ کے اشعار میں "مرد وزن" کہا گیا ہے۔ مولانا کا شعر ہے ؎

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

یعنی جب مجھے جنگل سے تراشا گیا تو میری فریاد وزاری پر تمام مرد وزن روتے ہیں۔ رونے کا کام مادی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسماء باری مادی چیز نہیں ہیں۔ اجرام سماوی اور موالید ثلاثہ دونوں مادی چیزیں ہیں اور اپنے شعر میں مولانا رومؒ کی "مرد وزن" سے مراد شاید یہی "آباء علوی اور امہات سفلی" یعنی اجرام سماوی اور موالید ثلاثہ ہیں۔

"لسان الغیب" اور "کاس الکرام" میں میر صاحب نے مشکل الفاظ کی فرہنگ دینے کے بعد اشعار یا رباعی کے معنی لکھے ہیں مگر اس کتاب میں فرہنگ الفاظ کی کمی رہ گئی ہے۔ اشعار کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ

مشکل الفاظ کی خود بخود تشریح ہوگئی ہے مگر بہتر ہوتا اگر اصل اشعار کے نیچے ہی اُن کا ترجمہ بھی دیا جاتا۔ فرہنگ سے الفاظ کے لغوی معنی بھی معلوم ہوجاتے۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں بھی رواج عام نظر انداز ہوگیا ہے مثلاً لفظ "کمند" کو مذکر لکھا گیا ہے گو یہ لفظ مونث استعمال ہوتا ہے اور بعض اشعار مروجہ نسخوں سے کسیقدر مختلف صورت میں شائع ہوئے ہیں ایک شعر اس طرح درج ہوا ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

حالانکہ اس کا معروف اور زیادہ صحیح نسخہ یہ ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

دوسرا مصرعہ لفظی و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہتر ہے ۔ اس کے معنی ہیں "اگرچہ لکھنے میں شیر و شیر ایک دوسرے کے مانند ہوتے ہیں"۔ کتاب کی لکھائی چھپائی کاغذ سب خاطر خواہ ہیں - پہلی جلد ۱۹۲ صفحات اور دوسری ۲۲۳ صفحات پر ختم ہوئی ہے

کالیداس[۱]

کالیداس شاعری و ڈرامہ نویسی دونوں میں یکتائے روزگار مانا جاتا ہے ۔ شکنتلا و وکرم اروسی وغیرہ اُس نے مشہور ڈرامے ہیں رگھوبنس کی حیثیت شاہنامہ کی ہے مگر افسوس ہے کہ اس عدیم المثال شاعر کی نسبت صحیح طور پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کس سن میں اور کہاں پیدا ہوا تھا، کس قسم کا آدمی تھا - اور کب وفات پائی ۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ کالیداس اُجین کے مہاراجہ وکرماجیت کا درباری شاعر اور اُس کے "نورتن" میں شامل تھا ۔ اور یوروپین محققین کے نزدیک اُس کا زمانہ ۵۳۰ء کے لگ بھگ تھا ۔

زیر نظر کتاب اسی مشہور و معروف شاعر کی سوانحعمری ہے ۔ جسے چودھری جے کرشن ایم اے - ایل ایل بی ایبٹ آباد نے نہایت دماغ سوزی اور تلاش و تجسس سے کام لے کر مرتب کیا ہے ۔ فاضل مؤلف نے اسکو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے میں کالیداس کی سوانحعمری بیان کی گئی ہے ۔ دوسرے میں اُس کی شاعری تیسرے میں اُس کی تصنیفات کا ذکر ہے ۔ سوانحی حالات بڑی چھان بین کر کے فراہم کئے گئے ہیں - اور اس کی پیدائش، وطن اور ذات کے متعلق مختلف محققین نے جو نظریے قائم کئے ہیں اُن پر معقول بحث کی گئی ہے ۔ دوسرے حصہ میں کالیداس کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں کالیداس کی تصنیف کا خلاصہ اور ونقد میں درج کیا گیا ہے ۔ غرض فاضل مؤلف نے کتاب کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اس کیلئے وہ ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

---

[۱] کتاب مجلد ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : چودھری جے کرشن ایم ۔ اے ۔ ایل ایل بی وکیل ایبٹ آباد

دیوان غالب (طاہر ایڈیشن)[1]

دیوان غالب کے اب تک بیشمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جنمیں بعض بعض بہت قیمتی ہیں۔ کئی ایڈیشن جیبی تقطیع پر بھی شائع ہوتے ہیں، لیکن اس ایڈیشن کی سب سے نرالی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے آغا محمد طاہر صاحب نے جو شمس العلماء آزاد مرحوم کے نبیرہ ہیں، اپنے ایک خاص اور نایاب نسخہ سے نقل کرکے شائع کیا ہے۔ آغا صاحب لکھتے ہیں کہ: "مدت سے آرزو تھی کہ غالب کا اردو دیوان شائع کروں، جو سند ہو اور سب قسم کے عیوب سے پاک ہو۔ خوش قسمتی سے اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا۔ یعنی میرے پر نانا جناب حسین مرزا صاحب نواب ناظر قلو سلیٰ مرزا کے دوست بلکہ عاشق زار تھے۔ وہ انتخاب میں بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے منتخب کلام کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا، مرزا نے پڑھکر دستخط اور مُہر سے مزین کرکے بطور یادگار واپس کر دیا۔ جواب بھی میری ننھیال میں مرزا کے محبت بھرے تعلق کو زندہ کرتا ہے۔ یہ دیوان اسی نسخہ سے درست کیا ہے۔ کیونکہ مروجہ دیوانوں میں بار بار چھپتے چھپتے بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں، اکثر مقامات چھوٹ گئے ہیں، مگر یہ بہت مکمل نسخہ ہے۔"

غرض صحتِ دیوان کی یہی سب سے اچھی تصدیق ہے۔ شروع میں مرزا غالب کے زمانہ کبرسنی کی تصویر، اُن کے مزار کا فوٹو اور اُنکی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ چھپائی بلاک کی بہت دیدہ زیب ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۱۴۷ صفحات ہے۔

سودا[2]

جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد دکن میں علمی تحقیق کو فروغ دینے کیلئے ہر سال چند فارغ التحصیل طلباء کو، جنہیں تحقیق و تدقیق کا خاص ذوق اور ملکہ ہوتا ہے، مختلف علوم و فنون میں اُستادوں کی نگرانی میں ریسرچ کرنے کیلئے وظائف دئے جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں شیخ چاند ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی نے مشہور و معروف شاعر و ادیب مرزا رفیع السودا کی حیات، تصانیف اور کلام پر ریسرچ کی اور اپنی تحقیق کے نتائج کو ایک طویل علمی مقالہ کی صورت میں پیش کیا، جو اب کتابی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔ مرزا سودا کا کلام ہماری تنقید و تبصرہ سے بلند و بالا ہے۔ شیخ چاند نے تحقیق و تنقید میں نہایت دماغ سوزی سے کام لیا ہے، ایسی سیر حاصل تنقید لکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے فاضل مصنف کی جواں مرگی کو ایک ادبی سانحہ سمجھتے ہیں۔ اس بات کا جتنا قلق کیا جائے کم ہے کہ شیخ چاند اسقدر جلد رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ (۱۸/) ملنے کا پتہ:۔ آزاد بکڈپو کوچہ چیلان دہلی۔
[2] قیمت اڑھائی روپیہ (۲/۸) ": انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

افسوس اُن کا تحقیقی مقالہ اُن کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اور وہ اسوقت احباب کی قدردانی دیکھنے کیلئے ہمارے درمیان موجود نہیں، مگر ہم اس کی اشاعت پر انجمن ترقی اُردو کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ کتاب عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ حجم چار سو صفحات ہے۔

کتاب العین [1]

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ساتھ ایک طبیہ کالج بھی ہے، جس کا مقصد طلبا کو فن طب کی نظری وعملی تعلیم وتربیت دینے کے علاوہ اُردو زبان میں فن طب پر مفید ومستند کتابوں کا تصنیف وتالیف کرانا بھی ہے چنانچہ یہ کتاب اسی کالج کے فاضل پرنسپل ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ ایم۔ ڈی (برلن) بی۔ ایس (پنجاب) ممبر مجلس ماہرین امراض چشم جرمنی کی ہے۔ اِس کا موضوع امراض چشم اُن کی ماہیت اور علاج ہے۔ اس کے لئے اسمیں یوروپ کے مشہور اور مستند ارباب فن کی تصنیفات سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے اسمیں اُن مختلف مقالات سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے طلباء کے درس کیلئے مرتب کئے تھے۔ اُن مقالات میں مزید تشریحات واشارات کا اضافہ کرکے یہ مہتم بالشان کتاب شائع کی گئی ہے۔

اس ضخیم کتاب کے مختلف ابواب ہیں۔ اعضاء کی تشریح اور اُن کے فوائد۔ معائنہ چشم کی ہدایات۔ امراض چشم کا بیان۔ آنکھ کی خرابیوں کا ذکر۔ آنکھ کے جراحی عمل کی کیفیت اور آنکھ کے علاج وحفاظت کی تدابیر اور نسخہ جات وغیرہ غرض آنکھ کے نقائص اور اُن کے علاج کے متعلق سبھی کچھ درج کردیا گیا ہے واقعی یہ تمام امور اِس شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ پرنسپل صاحب نے اس کتاب میں آنکھ کے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی۔ اعضاء چشم کی تشریح کرنے اور اُن کے سمجھانیکے لئے بیشمار نقشوں، تصویروں اور فوٹوز سے بھی کام لیا گیا ہے جس سے مضمون زیربحث کی وضاحت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا۔ جن آلات کے ذریعہ آنکھ پر جراحی عمل کیا جاتا ہے، اُن کی تصویریں دی گئی ہیں۔ آنکھ کی بیماری کے متعدد ڈاکٹری، یونانی اور ویدک نسخے بھی درج کئے گئے ہیں۔ جنمیں سے بعض بینظیر ہیں۔ کتاب کی زبان بیشک بہت عالمانہ ہے۔ اور عربی اصطلاحوں اور غیرمانوس و دقیق الفاظ سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوسکتا ہے:-

"نوری انعکاس سے حسی انعکاس زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے، کیونکہ طبعی حالات میں اسکی انجام دہی سے مراکز انبساطی وانقباضی دونوں کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تجربہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ حسی تحریک سے پہلے نوری انبساط رونما ہوتا ہے۔ کیونکہ سب سے اول منبسط الیاف میں تحریک ہوتی ہے۔ جن کا واسطہ

[1] قیمت دس روپیہ (۱۰ے) ملنے کا پتہ:- مینجر شعبہ تصنیف وتالیف طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

عنقی شرکی اعصاب سے ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انقباضی الیاف میں کچھ دیر کے لئے تحریکات
کا جانا رُک جاتا ہے۔ مذکورہ انعکاسات کے علاوہ حدقۂ عین کے دوسرے انعکاس بھی ہوتے ہیں
مثلاً نفسیاتی وغیرہ، جن کے متعلق ہم اِس مقام پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے۔

فنی اصطلاحات کے بھی چند نمونے ملاحظہ فرمائیے مثلاً استرخا جفنی، عضلۂ جبہیہ۔ محجر۔ حجاظ العین،
مقلہ چشم، اجفان، التواء جفنی، فتح العین، شعیرۃ الجفن، نقاط دمعی، احتقان ملتحمی، ماق انسیہ، صمام، حلمہ،
غضون، ملمعات وغیرہ وغیرہ، کتاب کے آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے۔ جس سے باسانی معلوم ہوجاتا ہے
کہ کتاب کے اندر کون سا اہم لفظ کس جگہ استعمال ہوا ہے۔ آخر میں فرہنگ اصطلاحات ہے۔ جسمیں
آنکھ کے متعلق تمام انگریزی اصطلاحات اور اُن کا عربی ترجمہ دیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک جہانتک فن کا تعلق ہے، یہ کتاب نہایت مکمل ہے اور اس کا مطالعہ اُن طبیبوں
کیلئے بہت ہی مفید ہوگا جو امراض چشم کے بھی ماہر ہونا چاہیں، اور ملک کی تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں
یہ کتاب رکھنے کے قابل ہے۔ اِسکی لکھائی چھپائی، کاغذ، ظاہری آرایش سب بہت عمدہ اور حجم بڑی تقطیع
کے تقریباً نوسو صفحات، کتاب خوشنما مجلد ہے

مہرشی درشن[1]

منشی تلوک چند محروم بی۔ اے کے نام نامی سے اُردو کی شاعرانہ دُنیا میں کون شخص واقف نہیں ہے
آپ ہندوستان میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً چوٹی کے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، زیرنظر کتاب آپ ہی
کے دلپذیر کلام کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ اِسمیں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں، جنمیں سوامی دیانند سرسوتی،
بانی آریہ سماج کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، اِس لئے اسکا نام "مہرشی درشن" رکھا گیا ہے۔ لیکن اور
بھی متعدد دلپسندیدہ نظمیں ہیں۔ ایک نظم پنڈت گورودت جی اور دوسری پنڈت لیکھرام کی شان میں ہے
تیسری نظم میں مہاتما منسراج کی تعریف کی گئی ہے۔ غرض روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کرنے کیلئے
اِس مجموعہ کا مطالعہ بہت موثر ثابت ہوگا۔ شروع میں پنڈت چموپتی ایم۔ اے گورنر گوروکل کانگڑی کا
کا لکھا ہوا دو جزو کا مقدمہ ہے، جسمیں سوامی دیانند سرسوتی جی کی سوانحعمری پر روشنی ڈالتے ہوئے محروم
کے کلام پر بھی لطیف تنقید کی گئی ہے۔ اسکا حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۸ صفحات ہے

محبوب خدا[2]

یہ کتاب پیغمبر اسلامؐ کی دلچسپ مگر مختصر سوانحعمری ہے۔ جو مولوی افضل حق صاحب نے بحالت

---

[1] قیمت ایک روپیہ (عہ)۔ ملنے کا پتہ:۔ مسٹر جگناتھ آزاد بی۔اے۔بی۔ای بازار راولپنڈی بالمقابل آریہ سماج مندر
[2] قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) ۔۔ ۔۔ :۔ تاج کمپنی لیمٹیڈ ریلوے روڈ، لاہور

قید فرنگ ملتان سنٹرل جیل میں شروع کرکے راولپنڈی جیل میں پایۂ تکمیل کو پہونچائی۔ اس قسم کی سوانحعمریاں ہر زبان میں لکھی جا چکی ہیں۔ جنمیں سب سے ضخیم مولانا شبلی کی "سیرۃ النبیؐ" سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہر کتاب کا طرز تحریر جدا جدا ہے۔ مثلاً "سیرۃ النبیؐ" کا طرز بیان مورخانہ و عالمانہ ہے، اور کتاب زیر نظر کا طرز بیان الہانہ ہے۔ فقرے فقرے سے رسولِ اسلامؐ کی محبت ٹپکتی ہے، اور کتاب کا انداز بیان شاعرانہ ہو گیا ہے۔ واقعات کو مجمل طور پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن ضروری باتیں درج کر دی گئی ہیں۔ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ حکیمانہ اقوال بھی چسپاں ہیں۔ مثلاً

"خدا کی ہستی کا اقرار تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔"

"جب جسم اور روح آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں تو حسینوں سے حسین خدا کی محبت اجڑی بستی کو بساتی ہے۔"

"گلہ بانی، جہانبانی کا دیباچہ ہے، اس لئے کہ اس سے جہانبانی کیلئے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں۔"

"بیوہ کے سوا کون جانتا ہے کہ خاوند کے مرقد میں کتنی کشش ہوتی ہے۔"

"قالینوں پر لوٹنے والے بچے ارادے کے کمزور ہوتے ہیں۔"

"جو موتی ریت کی تہ میں پائے جاتے ہیں، دُرِ شہوار بنتے ہیں۔ مٹی اور پتھروں میں رُلنے والے ہیرے کوہِ نور کہلاتے ہیں۔"

بعض واقعات کے متعلق کافی چھان بین سے کام نہیں لیا گیا۔ اور وہی باتیں لکھدی گئی ہیں، جو مروجہ تفسیروں میں بیان کی گئی ہیں۔ بہرحال یہ کتاب بہت خوبصورت پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کیلئے اسکا مطالعہ خاص طور پر دلچسپ ہونا چاہئے۔ اسکی لکھائی چھپائی اور ظاہری آرائش سب بہت پسندیدہ ہے غرض محاسن ظاہری میں اسمیں وہ سب باتیں موجود ہیں جو تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کے اہتمام میں چھپی ہوئی کتاب میں ہونا چاہیئے۔ ضخامت دو سَو صفحات ہے۔

"ملاپ" لاہور کے خاص نمبر

پنجاب کے اکثر اخبار و رسالے سال میں کئی کئی خاص نمبر نکالا کرتے ہیں۔ لیکن اس فن میں جو خاص سلیقہ "ملاپ" لاہور اور "تیج" دہلی کو حاصل ہے وہ انھیں کا حصہ ہے چنانچہ "ملاپ" نے پچھلے بسنت و ہولی کے موقعوں پر جو خاص نمبر شائع کئے وہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے انگریزی اخباروں کے سالناموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ انکا ٹائیٹل پیج بھی بہت نظر فریب ہے۔ دونوں نمبروں میں بہت سے دلچسپ مضامین کے علاوہ مختلف رنگین تصویریں بھی دیدی گئی ہیں اسطرح ظاہری محاسن کے ساتھ معنوی لحاظ سے بھی دونوں پرچے قابل قدر ہیں جن پر ہم کارکنان "ملاپ" کو مبارکباد دیتے ہیں البتہ اگر اشتہارات مضامین سے علیحدہ صفحات پر ہو سکیں تو بہت خوب ہو۔

بنی نوعِ انسان کو ورلڈ فیڈریشن کی ضرورت

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے آنریری اسسٹنٹ ایڈیٹر "زمانہ")

ذوربیں نظریں دیکھ رہی ہیں کہ زمانہ کس رُخ جا رہا ہے۔ اگر اس بے راہ روی کی روک تھام کا مناسب انتظام نہ ہوا اور بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے ایسے پیشوایانِ امن نہ ملے جن کی نظر قومیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر بین الاقوامی حدود تک پہونچتی ہو اور جن کے دلوں میں کل بنی نوع انسان کی محبت کا جذبہ موجزن ہو تو شیرازۂ عالم منتشر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ہمیشہ سے دنیا قومی رہنما پیدا کرتی آئی ہے۔ مگر اس وقت ایسے بین الاقوامی رہنماؤں کی ضرورت ہے جو کل بنی نوع انسان کو اخوتِ انسانی Brotherhood of Man اور پدریتِ خدا Fatherhood of God کا سبق پڑھا کر مختلف ملکوں کو ایک شیرازہ میں اِس طرح باندھ دیں جس طرح ایک قوم پرست رہنما ملک کے اندر مختلف فرقوں اور جماعتوں کو ہم آہنگ کر کے متحد کر دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں نقل وحمل کے ذرائع میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی اس کے ذریعہ کل دنیا اقتصادی طور سے ایک رشتہ میں منسلک ہو گئی ہے۔ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے اب مختلف ممالک کے درمیان دور دراز فاصلے علٰحدگی کا سبب نہیں ہیں۔ موجودہ ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ نوع انسان کے تمام اہم صیغوں میں مثلاً کرنسی (Currency) تجارت (Trade) وغیرہ میں بین الاقوامی ہم آہنگی کی پالیسی پر عمل درآمد کیا جائے۔ پس جملہ مہذب اقوام نے باتفاق رائے اپنے Currency System کی بنیاد سونے پر رکھی تاکہ بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہو، جس کی بدولت قومی ترقی میں خلل نہ پڑے۔

جہاں تک بین الاقوامی ہم آہنگی کی معرفت قومی ترقی مدنظر رکھی گئی اس غرض وغایت کی کامیابی میں ۱۹۱۴ء سے قبل تک کوئی موانع حائل نہ ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں عالمگیر جنگ ہوئی جس سے باہمی تعلقات کا قلع قمع ہو گیا، بے ارتباطی پیدا کرنے والے اسباب پیدا ہوئے۔ اس جنگ سے دنیا منتشر اور غیر مربوط ہو گئی۔ دوسرے ممالک پر تجارتی و دیگر موانع عاید کرنیوالی پالیسی

اور علیحدگی کے طرز عمل نے جو مظاہرات ما بعد جنگ میں تھے بین الاقوامی تجارت اور مالیات کی راہیں مسدود کردیں، اور کل دنیا کو معاشی مصیبت کے قعر مذلت میں گرا دیا، جس سے ہنوز دنیا پورے طور سے نکل نہیں سکی۔ مختلف ممالک نے مدہم تجارت اور بے روزگاری کے پیش نظر تنگ اقتصادی قومیت کی پالیسی اختیار کی اور دیگر ممالک کی ساختہ اشیاء کی درآمد پر ٹیکس عائد کئے۔ لیکن قانونِ قدرت (جیسا کہ ارتقائے مجلسی کے علمبردار ہربرٹ اسپنسر نے بیان کیا ہے) یہ ہے کہ جو کچھ منظم تفریق و پیچیدگی کی طرف سے سادگی کی طرف واپس جاتا ہے وہ ورطۂ فنا میں گرفتار ہو کر معدوم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا اس اہل قانون کو مسلسل نظر انداز کرتی رہے گی تو اس کا لازمی نتیجہ تنزل اور بربادی ہوگا"۔ حال ہی میں مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ایچ جے فیلور ڈی۔ ایس۔ سی، ایف۔ آر۔ ایس[1] نے کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یورپ کی سب سے بڑی ضرورت یوروپین فیڈریشن کا قائم کیا جانا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ " مختلف ممالک کے لوگوں کو مختلف حالات گرد و پیش کے باعث مختلف اسکیمیں درکار ہیں جو انھیں یقیناً ہمسائگی کے رشتہ میں منسلک رکھتی ہوئی پہلو بہ پہلو اتحادی اور فیڈرل رہنمائی کے تحت قائم رکھ سکتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ ایسی فیڈریشن کا بنیادی اصول یہ ہو کہ دلوں میں اختلاف کے لئے گنجائش ہو اور فراخ دلی کے ساتھ غرض و غایت یہ ہو کہ ممالک کی فاضل پیداوار ضرورتمند پڑوسی ملکوں کے استعمال میں آجائے"۔

لارڈ لوتھین نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ یورپ کے لئے یوروپین فیڈریشن اور ہندوستان کے لئے انڈین فیڈریشن کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موصوف ارتباط کی پالیسی کے حامی ہیں لیکن انھوں نے یہ بات نظر انداز کردی ہے کہ اس وقت کی اصلی ضرورت اندرون قوم یا اندرون براعظم ارتباط و ہم آہنگی کی نہیں بلکہ بین الممالک اور بین الاقوام ارتباط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے جس سے مختلف اقوام متحد و منظم ہو کر ایک عالمگیر فیڈریشن World Federation کی صورت اختیار کرسکیں جس کی برکت سے یوروپین فیڈریشن کا (اگر ایسا فیڈریشن قائم کیا گیا) ایشیاٹک فیڈریشن یا امریکن فیڈریشن (کیونکہ جواباً دونوں قائم ہو جائیں گے) کے ساتھ نزاع و اختلاف کا احتمال ہی نہ رہے۔ مجلس اقوام ناکامیاب رہی کیونکہ اس نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا، اس کی تنظیم درحقیقت جنگ عظیم کے فاتحان نے اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے کی مغلوب فریق کا حصہ محض مفعولی و مجبوری رہا۔ اس کے سوائے چارہ ہی کیا تھا کہ جو اسکیم بھی فاتحان

---

[1] Mr. H. J. Fleure, D.Sc., F.R.S.

کی طرف سے پیش کی جائے اُس پر مغلوب ممالک خاموشی سے رضامندی کی مہر ثبت کردیں چنانچہ بیچاروں کو طوعاً و کرہاً ایسا ہی کرنا پڑا۔

معدودے چند بدنصیب قوموں کو چھوڑ کر قومی تنظیم وارتباط بدرجۂ غایت پہونچ چکا ہے اور اب اس بارے میں حد سے گذرنا نوع انسان کے مجلسی ارتقار کے لئے باعث تخریب ثابت ہورہا ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا کا اتحاد اس قدر مشکل ہوگیا ہے۔ اگر اجزا (Parts) کُل (Whole) کی امداد و اعانت سے منکر ہیں اور اپنے آپ کو نوع انسان کی بہبودی کا ذریعہ نہیں بناتے تو یا تو ایسے باغی اجزا "کُل" کے مفاد کی خاطر کاٹ کر پھینک دیئے جائیں گے یا "کُل" ورطۂ فنائیت میں پڑکر نیست و نابود ہوجائیگا۔

انسانی سوسائٹی کے پیشواؤں کو اس خطرہ کا احساس کرنا واجب ہے اور اس کا احساس کرکے مناسب ہوگا کہ دنیا کے (Hitlers) ہٹلر غاصبانہ قومی تنگ نظری سے بالاتر ہوکر قومی علمبردار بننے کے بجائے بین الاقوامی علمبرداری اختیار کریں تاکہ انسان کی مجلسی ارتقامیں ان کی کارروائی قانونِ قدرت کے مطابق معاون ثابت ہو نہ کہ مزاحم۔

اگر سولیزیشن کی تاریخ کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں مجلسی ترقی کا ارتقار بتدریج وسیع اور وسیع تر سنگٹھن کے ذریعہ ہوا ہے۔ اس حقیقت کی شہادت انسانی عمل کے ہر صیغہ سے ملتی ہے۔ چنانچہ انسان کی اقتصادی ترقی اس پہلو کی مظہر ہے کہ معاشی نظام مفرد کاریگر پر قائم ہوا۔ پھر یہ نظام وسیع تر ہوکر Domestic System of Production کی صورت میں قائم ہوا اور اس کے ماتحت ہمارے تجار مختلف کاریگروں سے اشیاء کے نمونے دے کر اور کچا مال اور مالی مدد بہم پہونچا کر ساختہ مال بنوا لیتے تھے۔ کاریگر اپنے اوزار خود رکھتے تھے۔ وقت پر اس نظام نے اور بھی وسیع تر پیمانہ پر سنگٹھن کے ذریعہ کام شروع کیا اور جو صورت اختیار کی وہ فیکٹری سسٹم کہلائی۔ یعنی اس کے تحت منتشر کاریگروں کو ایک ہی عمارت میں ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی اہتمام میں مجتمع کیا گیا۔ اس نظام سے بھی آگے بڑھ کر مجلسی ارتقار کے بموجب یہ ترقی ہوئی کہ الگ الگ کام کرنے والی فیکٹریوں کو سنگٹھن کے ذریعہ ملا دیا گیا اور ٹرسٹ اور کارٹل (Kartal) قائم کئے گئے۔ قدرت کا قانون ہے کہ جو کچھ انتشار سے تنظیم کی جانب جا رہا ہے وہ ارتقا کی رو میں ہے۔ اسپنسر نے زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ اندرونی

رشتوں کا بیرونی رشتوں کے ساتھ مسلسل ارتباط ہی زندگی ہے۔

جیسے جیسے سوسائٹی نشو و نما پاتی ہے اس میں تفریق و پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے لیکن نشو و نما کی یہ حالت اُس وقت ہوتی ہے جب متذکرہ بالا تفریق و پیچیدگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرکے "ایک کل" کی صورت پیدا کر دی جائے۔ امریکہ کی ترقی سنہ [illegible]۱۶ء سے سنہ ۱۹[illegible]ء تک اسی قانون ارتقاء کے مطابق ہوئی ہے۔ جب سولیزیشن ترقی کر جاتی ہے اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے لئے موجودہ تنظیم غیر کافی ثابت ہوتی ہے تو انسان کے لئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر وہ زندگی کو مکمل بنانا چاہتا ہے تو موجودہ نظام کو توڑ کر وسیع تر سنگھٹن کے ذریعہ وسیع تر نظام قائم کرے۔ اگر انسان اس قانون کی پیروی نہیں کرتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ارتقاء کے برعکس وہ تنزل کی طرف گامزن ہے۔ جیسا کہ تاریخ یورپ میں سنہ ۱۲[illegible]ء سے سنہ [illegible]ء تک کا زمانہ اس صداقت کو واضح کرتا ہے، جس کے دوران مجلسی نظام کا رخ تنظیم کی طرف سے ہٹ کر انتشار کی جانب رہا۔ پس اگر زندگی کو انتہائی طور سے مکمل بنانا ہے تو مجلسی تنظیم کو قومی نظام سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی تنظیم کی جانب گامزن ہونا چاہیئے کیونکہ قوم کی محدود تنظیم زندگی کے موجودہ حالات کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔

علمی نوٹ

انجمن ترقی اُردو کے اہتمام میں انگریزی ہندستانی زبان کی جو مستند ڈکشنری تیار ہو رہی تھی وہ حال میں "اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری" کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ انجمن کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کی توسیع و ترقی کی کوشش میں اپنی عمر عزیز صرف کر دی ہے اور شائقین ادب اُن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں لیکن اس ڈکشنری کی تیاری اُن کی مفید و قابل قدر زندگی کا سب سے شاندار کارنامہ ہے جس پر انھیں جسقدر فخر ہو کم ہے۔ انجمن اُردو نے اِس یادگار لغت کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کا کاغذ خاص طور پر ولایت سے بنوایا گیا ہے۔ اور جلد بھی بہت خوبصورت تیار ہوئی ہے۔ صحت کا خاص انتظام رکھا گیا ہے۔ اسکا حجم سوا پندرہ سو صفحات کے قریب ہے۔ غرض جس تحقیق و تفتیش۔ عرقریزی و جانفشانی اور صرفِ کثیر سے یہ ڈکشنری تیار کی گئی ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے اسکی قیمت سولہ روپیہ کسی طرح زائد نہیں کہی جا سکتی ہے۔

ہندستانی اکیڈمی نے عوام کی دلچسپی کیلئے ایکروپیہ والی کتابوں کا ایک خاص سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی ہر کتاب دو سو صفحات کی ہوگی اور سب کتابیں انگریزی کی "ہوم یونیورسٹی لائبریری" کے نمونے پر لکھی جائینگی اس سلسلے میں تاریخ، تمدن، تجارت، سیر و سفر، سوانح عمری، سائنس اور مذہب غرض سبھی موضوعات پر کتابیں لکھوائی جائیں گی

ڈاکٹر اقبال مرحوم

۲۱ر اپریل کو صبح پانچ بجے شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال کے انتقال پر ملال سے اُردو و ادب کو جو صدمۂ عظیم پہونچا ہے
سا پر تمام ملک میں ماتم بپا ہے۔ ڈاکٹر اقبال موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے اُردو شاعر تھے۔ اور گو کئی سال سے
ردو کی بہ نسبت فارسی کلام کی طرف اُنکی توجہ بہت زیادہ مبذول ہوگئی تھی، تاہم اُردو میں جو کچھ لکھ دیتے تھے۔ وہ
ں ہر دلعزیز زبان کیلئے مایۂ ناز و باعث فخر ہوتا تھا۔ اِس طرف ایک عرصہ سے آپ کی صحت خراب تھی۔ دو مہینوں سے
لت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جس سے بیحد نقاحت ہوگئی تھی تاہم کسی کو بھی یہ اندیشہ نہ تھا کہ آپ کا انجام اِسقدر قریب ہے

ابھی جنوری گذشتہ میں ہندوستان کے اکثر شہروں میں معتقدین اقبال نے "اقبال ڈے" منایا تھا۔ ہم نے بھی
انہ مارچ ۱۹۳۶ء میں "اقبال کی شاعری اور تصوف" پر دو خاص مضامین شائع کئے تھے جنکو ہمارے دو عزیز دوستوں نے
ری ستدعا پر بڑی کاوش و تحقیق سے لکھا تھا۔ آہ! کس کو خبر تھی کہ اس اظہار عقیدتمندی (مضامین) کی اشاعت کے بعد اِسقدر جلد
اعر اعظم داعی اجل کو لبیک کہکر اپنے مشتاقانِ کمال کو ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دیجائیگا۔ مگر خدا کی مرضی میں کس کو
خل ہے۔ سچ ہے ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا — آدمی بلبلہ ہے پانی کا

اِس حادثے نے طبیعت کو افسردہ کردیا ہے کیونکہ گو علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث ایک عرصہ سے زمانہ
ڈاکٹر اقبال کے کلام کے اشاعت کی عزت نصیب نہیں ہوسکی تاہم یہ ناچیز رسالہ آپ کی خدمت میں ہمیشہ باریاب
وتا رہتا تھا۔ اور آپ نے اس کے "جوبلی نمبر" اور اسکے خاص نمبر (ل) کے لئے اپنے اشعار عطا فرمائے تھے ۱۹۰۴ء
یں آپ نے اپنا مشہور گیت "ہندوستان ہمارا" کا صحیح ایڈیشن بھی سب سے پہلے زمانہ ہی کو اشاعت کیلئے
رحمت فرمایا تھا۔

کلام اقبال پر زمانہ میں کئی مفصل تبصرے شائع ہوچکے ہیں اور آیندہ بھی ہوں گے لیکن اب ان مضامین
کون داد دیگا۔ اصل یہ ہے کہ اقبال کا اُردو میں کوئی جواب پیدا نہیں ہوا ہے۔ اُن کے کلام میں میر تقی کا
سوز و گداز، خواجہ درد کا تصوف اور مرزا غالب کا حکمت و فلسفہ کچھ اِس طریقے سے یکجا ہوگیا تھا کہ اسکی نظیر
م سے کم اُردو میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔

اُنکی پیدائش کی تاریخ ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء تحقیق ہوئی ہے، اِس حساب سے موت کیوقت آپکی عمر ۶۵ سال ۲ ماہ تھی
کہتے ہیں وفات سے کچھ قبل آپ نے یہ اشعار ارشاد فرمائے تھے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ لوح مزار پر نقش کرانے کے لئے خود ہی یہ قطعہ کہا تھا۔

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

افسوس اب یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

تہنیتِ شادی

کتخدائی مسٹر دینا ناتھ خلف مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر بنارس

(۱)

از محمد یعقوب خاں صاحب بی۔اے سب اڈیٹر "زمانہ"

بادِ صبا نے کلیوں، کلیوں نے سب گلوں سے
اور گُل نے کھلکھلا کر گلشن کی بُلبُلوں سے
بُلبُل نے طوطیوں سے، طوطی نے صلصلوں سے
صلصل نے مُسکرا کر پوچھا یہ شبنموں سے
تزئینِ رنگ و بُو ہے، آراستہ چمن ہے
کس کی رچی ہے شادی، کیوں گرم انجمن ہے

اتنی سی بات سن کر، ہلچل ہوئی چمن میں
جمگھٹ میں بلبلوں کے، پھولوں کی انجمن میں
ہونے لگے اشارے نسرین و نسترن میں
سوسن نے یوں صدا دی اترا کے بانکپن میں
یہ محفلِ مسرت راجیندر کی سبھا ہے
دینا ناتھ کے سر سہرا بندھا ہوا ہے

طالع کے نیک اختر، اقبال کے ہیں یاور
جن پر دیا نراین کی ہوتی ہے سراسر
یہ فخرِ دودماں ہیں، بحرِ شرف کے گوہر
بزمِ طرب کے نوشہ، اس انجمن کے افسر
سہرا یہ کہہ رہا ہے، ہو کر نثار صدقے
فصلِ بہار صدقے، تم پر ہزار صدقے

(۲)

(از پروفیسر ہری کرشن سکسینہ راز ایم۔اے لکچرار بی۔این۔ایس۔ڈی کالج کانپور)

روئے زمیں پہ محفلِ فصلِ بہار ہے
محراب آسماں پہ بنی زرنگار ہے
ہے فرشِ چاندنی سے منور فضا تمام
قندیلِ ماہ، چرخ سے یا نور بار ہے
ہیں لاجوردی تخت میں ہیرے نجوم کے
یا برقی قمقموں کی فلک پر بہار ہے

ہے دشت لالہ زار بنا ڈھاک پھولے ہیں
فرشِ زمردیں سے سجا سبزہ زار ہے

دیکھیں بہارِ حسن کی، تا گلرخانِ باغ
آئینۂ مصفّا بنی جوئے بار ہے

آئے ہیں بور آم میں کوئل بھی مست ہے
قربان لاکھ جان سے گل پر ہزار ہے

بجتے ہیں جل ترنگ روانی سے آب کی
بربط کوئی شجر ہے تو کوئی ستار ہے

طاؤس محوِ رقص، عنادل کے چہچہے
فردوسِ گوشِ گل ہیں، صبا عطر بار ہے

فرطِ طرب سے نغمۂ شادی ہے کُل جہاں
بارات دینا ناتھ کی کیا شاندار ہے

پھولے سماتے رام سرن جامے میں نہیں
سہرے کی نورِ چشم کے رخ پر بہار ہے

ہیں باغ باغ راج نراین بھی اِن دنوں
شاخِ اُمید اُن کی ہوئی باردار ہے

مسرور و شاد کیسے ہیں منشی دیا نراین
اور لب پہ شکرِ رحمتِ پروردگار ہے

احباب و رشتہ دار ہیں خنداں مثالِ گل
ہر دل نسیمِ عیش سے جو ہمکنار ہے

اپریل پندرہ وسنہ اڑتیس اُنیس سو
تاریخ شادی بر صفحۂ روزگار ہے

دولھا دلھن ہمیشہ رہیں شاد و بامراد
جبتک زمیں پہ دورۂ لیل و نہار ہے

یہ شادیِ سعید مبارک ہو سب کو رازؔ
دل سے یہی نکلتی صدا بار بار ہے

قطعۂ تاریخ

(نتیجۂ فکر جناب منشی فتح بہادر صاحب نگمؔ وکیل لکھنؤ)

یہ غل ہے ہر طرف شادی مبارک ہو مبارک ہو
دلوں کی فرحت آبادی مبارک ہو مبارک ہو
کیا آلام کو دُور اور لکھا خوش ہو کے راحت نے
"یہ دینا ناتھ کی شادی مبارک ہو مبارک ہو"

۱۲۲۹ ۱۲۸

۱۳۵۷ھ

تصحیح۔ زمانہ بابت مارچ ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۹۵ سطر ۲ میں "بحرِ قلزم" غلط چھپ گیا ہے "بحیرۂ روم" صحیح ہے، درست فرمالیجئے

The ZAMANA. May 1938

زمانہ

ZAMANA

مئی ۱۹۳۸ء | مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔ | جلد ۷۰ نمبر ۵

فہرست

عکس تحریر علامہ اقبال۔ اصلی مسودہ "ہندوستاں ہمارا" مطبوعہ زمانہ ۱۹۱۰ء

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

آپ بھی ایسے ہی تندرست بن جائیے
جب ایک ایسا علاج موجود ہے جو بہت ہی کم عرصہ کے اندر آپکی تمام زائل شدہ
طاقتیں از سر نو بحال کر دیسکتا ہے۔ تو پھر آپ کیوں کمزوری پریشانی تھکن اور
خستگی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔
سائنس نے سناٹوجن میں خواص معلوم کر لئے ہیں جو بہت قلیل عرصہ کے استعمال
سے آپکو خوشی وخرمی کا حیرت انگیز احساس اور طاقت و شگفتہ صحت عطا کرتے ہیں
دنیا کے پچیس ۲۵ ہزار ڈاکٹروں نے اپنے لکھے ہوئے اسناد کے ذریعے جنہیں انھوں نے
سناٹوجن کی سفارش کی ہے مندرجہ بالا قول کی تصدیق کی ہے۔
سناٹوجن بے نظیر صحت بخش دوا ہے اس لئے وہ بحالی صحت میں کبھی قصور
نہیں کرتی۔ مردوں، عورتوں اور بچوں سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہے
آج ہی سناٹوجن استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔
ایک صاحب جو سناٹوجن کے بڑے معتقدین ہیں تحریر فرماتے ہیں۔ جو لوگ
میری طرح ضعف اعصاب میں مبتلا ہیں انھیں میری طرف سے کہدیجئے کہ وہ
سناٹوجن استعمال کیا کریں۔ کیونکہ اب میں کھانا خوب کھا سکتا میٹھی نیند
سو سکتا اور لطف زندگی حاصل کر سکتا ہوں یہ زندگی ہے تو زندگی اسی
وقت عجیب چیز معلوم ہوتی ہے جب انسان
تندرست ہو اور سناٹوجن کی ہر شیشی
میں تندرستی موجود ہے۔
SANATOGEN
صحیح معنے میں مقوی غذا ہے۔
تمام دوا فروشوں اور بازار سے ملسکتی ہے
تیاری کی کسی حالت میں بھی سناٹوجن کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا اور اسمیں
کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کسی فرقہ یا مذہب کے خلاف ہو

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بیمثل کتابیں
محمد بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ، از منشی محمد امیر احمد علوی بی اے اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ قیمت ۱۲ عہ
کمال داغ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی، مرتبہ مولانا حامد حسین صاحب قادری۔ اردو غزل گوئی پر جدید زاویۂ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت فی جلد ۱۲ عہ
نقش و نگار شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے نہایت خوبصورت جلد، ورڈ سٹ کور۔ قیمت ۱ عہ
فکر و نشاط حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ عمدہ لکھائی چھپائی۔ بہترین جلد، غیر مطبوعہ نظمیں۔ قیمت مجلد کتاب۔ عہ
انتخاب حسرت مولانا حسرت موہانی کے دسوں دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت فی جلد عہ
رامائن مسدس مصنفہ جناب منشی راجی مل کپور، مصنف نے سری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے۔ قیمت مجلد باتصویر ۱۲ عہ مجلد بلاتصویر ۱ عہ غیر مجلد بلاتصویر ۱۲
نقش و نگار مسز جلیل قدوائی کی دلاویز اور پُر لطف نظموں کا مجموعہ جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ قیمت عہ
خیالات عزیز مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد صاحب جسکی باضابطہ جسٹری کی گئی ہے۔ حجم دو سو صفحات، ٹائٹیل خوشنما رنگین، لکھائی چھپائی عمدہ مع تصویر مصنف۔ قیمت مجلد ۱۲ عہ غیر مجلد عہ
ہندو تیوہاروں کی اصلیت اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو ایڈیشن کی قیمت ۹ ر۔ اور ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ ۱۲ عہ
نصائح چانکیہ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور معرفت نیتی کا ترجمہ از پنڈت بسمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام۔ قیمت ۶ ر
بہار سخن پانسو چھیاسٹھ ہندو شعراء ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے۔ جسمیں ۵۶۶ شعراء کے حالات، انتخاب کلام بترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱ ر
ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

بندگی امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب العبودیت کا اُردو ترجمہ اپنی وضع کی بہترین کتاب۔ مترجمہ میر ولی اللہ صاحب وکیل۔ قیمت ۱۲/

ٹامبر لزینگون مسٹر داؤد کا ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے ہر بات کو اصلی سطح پر لاکر پیش کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک یہ ناول سچے واقعات سے مترتب ہے۔ حجم ۱۷۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/

بزم احباب اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ ہے۔ قیمت صرف ۸/

سالومی آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما سالومی کا ترجمہ ہے جس کو مجنوں نے نہایت محنت سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۸/

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم کی مکمل سوانحعمری ہے۔ حجم ۸۴ صفحات، سائز قدرے بڑا۔ قیمت فی جلد صرف ۸/

بوڑھی رانی ایک دلچسپ اور سبق آموز افسانہ، مصنفہ منشی پریم چند مرحوم۔ قیمت ۶/

جاں نثارات عورتوں کی جانبازی اور ایثار کی سچی کہانیاں یہ کتاب خواتین اور بچوں کے لئے خاص طور پر نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۱۰/

بیوہ مصنفہ منشی پریم چند مرحوم، اسمیں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/

سراب مغرب نامناسب تربیت گاہوں میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا انجام۔ قیمت ۸/

جوہر قدامت دو عورتوں کی جگر خراش داستان جنمیں سے ایک قدامت کی پرستار اور دوسری تہذیب جدید کی دلدادہ ہے، صفحات ۲۰۰ قیمت ۸/

موءودہ لڑکیوں کو ترکۂ پدری سے محروم کردینے کے قبیح رواج کے انسداد کے لئے یہ کتاب دلگداز پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۸/

بنت الوقت تہذیب جدید کی کورانہ تقلید کرنیوالی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا دردناک انجام پڑھئے۔ قیمت ۸/

توجۂ زندگی بیوہ کے نکاح ثانی کے متعلق مولانا راشد الخیری مرحوم کی حرکۃ الآرا تصنیف۔ قیمت صرف ۱۲/

عروس کربلا کربلا کے دلدوز واقعات، علامہ راشد الخیری مرحوم کے سحر طراز قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔ بہت ہی مقبول اور ہردلعزیز ہے۔ قیمت فی جلد صرف ۱۲/

آزاد

اُردو کا ایک بہترین ہفتہ وار اخبار ہے

جسمیں ہفتہ کے ضروری واقعات پر قومی نقطۂ خیال سے رائے زنی ہوتی ہے۔

مُلکی معاملات اور غیر ملکی واقعات اُس کے نوٹ قابل دید ہوتے ہیں

ہر سنیچر کو ایڈیٹر صاحب زمانہ کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا

المشتہر۔ منیجر آزاد کانپور

ہفتہ وار
اخبار آزاد کانپور

(جسمیں)

ہفتہ بھر کے اہم اور ضروری واقعات پر
آزادانہ رائے زنی ہوتی ہے

لیڈروں کی ضروری تقریروں کا
خلاصہ درج ہوتا ہے

ہندوستان کی ملکی و قومی تحریکوں اور جلسوں کے حالات
اور
سرکاری رپورٹوں کے دلچسپ اقتباسات شائع ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر زمانہ کی ایڈیٹری میں ہر سنیچر کو
دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوتا ہے۔
قیمت سالانہ تین روپیہ فی پرچہ ار نمونہ مفت

خریداران زمانہ کے لئے تین ماہ کیلئے ایک خاص رعایت یہ کیجاتی ہے کہ اُن نام آزاد صرف دو روپیہ سالانہ پر جاری کر دیا جائے گا۔

المشتہر
منیجر آزاد و زمانہ کانپور

ملک کے مشہور اخبارات کی رائیں

گذشتہ پچیس سال کے اندر ملک کے بہت سے مشہور و معروف اخبارات نے آزاد کے متعلق جو رائے لکھی ہے اُن میں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں۔

زمیندار لاہور۔ منشی دیانرائن نگم کا "آزاد" بالکل نرالا ہے۔ اِس کی طرز روش تعصب و ناواجب جنبہ داری کی آمیزش سے پاک ہے۔ وہ ہندو مسلم معاملات میں آزادی سے بحث کرتا ہے۔ ....

بہاری بانکے پور۔
آزاد ایک بلندپایہ اُردو اخبار ہے، اور بالکل زمانہ کی روش پر نکالا گیا ہے

ویدک میگزین (گورو کل)
آزاد نہایت لیاقت سے مرتب کیا جاتا ہے اس کے مضامین اور ایڈیٹوریل نوٹ افراط و تفریط کے نقص سے پاک ہوتے ہیں جذبات کی سنجیدگی اور خیالات کی بلندی اس کی دوسری خصوصیات ہیں۔

ونکٹیشور سماچار بمبئی۔
آزاد اپنے ڈھنگ کا ایک ہی پرچہ ہے۔ آزادی سے اپنے سنجیدہ خیالات ظاہر کرنیوالا اور طرفداری سے بالکل پاک اخبار ہے۔
قیمت صرف تین روپیہ سالانہ

ہم زکام اور انفلوئنزا سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں؟

ہر طرف ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اِن ناخواندہ مہمانوں یعنی زکام اور انفلوئنزا سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں؟

عرصہ سے لوگ اِس مسئلہ کے حل کی فکر میں تھے۔ کئی سال ہوئے پیرس کے ایک مشہور اخبار نے مختلف لٹریری حضرات سے سوالات ذیل کئے تھے:۔

"کیا آپ انفلوئنزا کی کوئی اچھی دوا جانتے ہیں؟ اگر نہیں جانتے تو کیا آپ ہمارے ناظرین سے کسی ایسے خاص معالجہ کی سفارش کر سکتے ہیں جو انفلوئنزا میں مفید ہو؟

جب آپ انفلوئنزا میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آپ اس جبری بیکاری کی حالت میں کیا کرتے ہیں؟"

اُن دونوں یہی دو سوال پیرس میں ہر شخص کی زبان پر تھے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں وہاں انفلوئنزا کی وبا بڑی طرح پھیلی ہوئی تھی، اور پیرس کے بہت سے باشندے صاحب فراش ہو رہے تھے۔

اب چونکہ انفلوئنزا کا موسم شروع ہونیوالا ہے۔ اِس لئے لوگوں نے ان دونوں سوالوں کا جو جواب دیا اُس کا دیکھنا باعث دلچسپی ہوگا۔

دوسرے سوال کا سب لوگوں نے ایک ہی جواب دیا تھا یعنی یہ کہ بیماری کے دوران میں کچھ کام کرنیکو جی ہی نہیں چاہتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس پہلے سوال کے جوابات مختلف آئے۔ لوگوں نے اخبار کے اڈیٹر سے ہر طرح کے علاج کی سفارش کی تھی۔ بہتوں نے گرم گرم عرقیات تجویز کئے مثلاً پانی ملی شراب یا رم وغیرہ وغیرہ کی سفارش کی۔ ایک ظریف طبع شخص نے تو یہ بھی لکھا کہ انفلوئنزا کی بیماری خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے ایجاد کی گئی ہے جو رم کے شائق ہیں۔

ان جوابات سے اڈیٹر صاحب نے یہی نتیجہ نکالا کہ انفلوئنزا کا کوئی خاص علاج نہیں ہے۔ بلکہ لوگ اس بیماری سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کی دقیانوسی دوائیں استعمال کرتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ بحث چند سال ہوئے چھڑی تھی۔ اُس وقت سے اب تک مختلف ڈاکٹروں نے اِس مسئلہ پر خاص طور سے غور کیا ہے اور اس بات کو سوچا ہے کہ انفلوئنزا کی روک تھام ممکن بھی ہے یا نہیں۔

تجربات نے حیرت انگیز طور پر ثابت کر دیا ہے کہ اِس مرض کا یقینی حفظ ماتقدم بہت ہی سہل طریقے سے ہو سکتا ہے اور وہ اِس طرح کہ انفلوئنزا کے زمانہ میں ہر روز صبح کے وقت کونین کی تھوڑی سی مقدار کھا لینے سے دوسروں کے ذریعہ بیماری لگنے کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے اور یہ یقینی ہے کہ کونین انفلوئنزا کے دوران میں نمونیہ جیسی پیچیدہ اور تشویش انگیز حالت تو کسی طرح پیدا نہیں ہونے دیتی۔

بہت ڈاکٹروں کی رائے میں کونین، ملیریا کے خلاف جنگ برپا کرنے میں ایک خاص دوا ہے جسمیں انفلوئنزا سے بچانے کی ایک خاص تاثیر ہے جو اسی کے لئے مخصوص ہے۔ البتہ یہ ضروری بات ہے کہ بیماری کے تشویش انگیز موسم میں تین گرین کونین روزمرہ کھائی جائے۔ بچوں کو نسبتاً کم مقدار میں کونین دیجائے

No: 42.

جلد ۷۰   مئی ۱۹۳۸ء   نمبر ۵

چکبست اور جذبۂ حرّیت

از مسٹر جے کرشن چودھری ایم اے، ایل ایل بی

چکبست حُرّیت کا علمبردار ہے، اُس کے نغموں کا پُورا زور آزادیِ وطن کے لئے وقف ہے، اُس کی جولانیِ طبع ہندِ قدیم کی عظمت وشوکت کے تصوّر اور آیندہ کے آزاد ہندوستان کے خواب دیکھنے میں مصروف کار ہے۔ گرد وپیش کے حالات سے متاثر ہوکر چکبست نے قومیت کا راگ الاپا ہے۔ اور اُردو شاعری میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

اقبال اور حسرت موہانی کی طرح چکبست اُردو شاعری کے دَورِ جدید کا شاعر ہے، اب گل وبلبل کے قصے پُرانے ہو چکے، معشوق کے جور وجفا افسانہ بن گئے۔ نازک کمر ساقی کا دور دورہ ختم ہو چکا، قومی انحطاط اور سیاسی غلامی نے شاعری کے سب بل نکال دیئے، شاعر کی حسّاس اور جدّت پسند طبیعت کو شاعری کی پرانی روش سے کیا سروکار! اُسے تو اب قوم کی رگوں سے خون ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ ساقی کا تغافل اُس کی توجہ کا مرکز نہیں بلکہ اُس کے جذبات کو ہم وطنوں کی ذلت، نکبت اور بے حسی متحرک کرتی ہے، جھنجوڑتی ہے۔ اور وہ قوم کی جہالت اور باہمی نفاق کو دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے:۔

کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا   اِک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

غرور وجہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا   بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

غرض چکبست نے اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا، اور اپنی مُلکی اور قومی نظموں کے ذریعے سے وہ شعلے برسائے کہ ہندوستانیوں کے خرمنِ غفلت کو پھونک کر رکھ دیا۔

چکبست پہلا شاعر نہیں جس نے اپنے تخیل اور فکر کی بلندی کو آزادیِ وطن کی قربان گاہ پر چڑھایا دنیا کے ہر ایک پسماندہ اور محکوم ملک میں شاعروں نے اپنے ملک کو غیروں کے پنجہ سے آزاد کرانے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی غفلت اور بے حسی کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔ اور اُن میں بیداری، جوشِ عمل اور آرزوئے ترقی کے جذبات پیدا کئے۔ اسکاٹ لینڈ کے قومی شاعر رابرٹ برنس[1] نے اپنے ملک کی عظمت اور اپنے ہم وطنوں کی بہادری کی داستانیں لکھی ہیں جو آج بھی طبیعت میں جوش پیدا کر دیتی ہیں۔ اُس نے غیر ملکی حکمران کے برخلاف جہاد کا وہ جذبہ پیدا کیا جسے انگلستان کی پوری طاقت بھی نہ دبا سکی۔ انقلاب فرانس کے دنوں میں ایک فوجی افسر کیپٹن رفنٹ ڈی لائل کا مشہور قومی ترانہ "مارسیلز" سامعین کے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیتا تھا۔ اُس نے فرانس کی کایا ہی پلٹ دی یہ ترانہ اب تک آزادی کے گیتوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ امریکہ کے مشہور شاعر جان گرین لیف وٹیر (John Greanleaf Whitter) نے "بار برا فریچی" کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی۔ اور ایک پچانوے سالہ بوڑھی خاتون کی داستان بیان کی جس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر قومی جھنڈے کی عظمت کو برقرار رکھا۔ مائیکل ڈریٹن اور کئی دوسرے انگریز شعرا نے انگلستان کی عظمت کی داستانیں لکھ کر اپنے ہم وطنوں کو آزادی کا سبق سکھایا ہے۔ قومی ہیجان کے وقت شاعری نمایاں حصہ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات بہت معمولی قسم کی شاعری لوگوں کے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتی ہے تاریخ شاہد ہے کہ انگلستان کے قوانین کی اصلاح میں اس قسم کی شاعری نے معتدبہ حصہ لیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی ایسے کئی شاعر ہوئے جنھوں نے قومی عظمت کے گیت گائے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف آواز بلند کی۔ عہدِ مغلیہ کی ایک مثال لیجئے، اورنگ زیب نے شمال مغربی سرحد پر رہنے والے قبائل کو مطیع کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن خوشحال خان خٹک کی پرجوش قومی پشتو نظموں نے تمام قبائل میں حریت کا وہ جذبہ پیدا کیا جس کے سامنے اورنگزیب کا لشکر بیکار رہ گیا۔ موجودہ تحریک آزادی میں بنکم چندر چٹرجی کے مشہور قومی گیت "بندے ماترم" نے برسوں تک ہزاروں محبانِ وطن کے قلب و روح کو گرمایا۔ موجودہ سیاسی بیداری میں چکبست کے علاوہ اقبال۔ ساغر۔ منظر۔ جوش۔ اور قاضی نذر الاسلام کی قومی نظموں نے بہت حصہ لیا ہے۔

[1] Robert Burns.

اقبال کا قومی ترانہ:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہمارے جذباتِ حریت، آرزوؤں اور اُمنگوں کا حامل ہے۔ اقبال کا تخیل گو بعد میں اسلام اور فلسفۂ اسلام کی ترجمانی میں منتقل ہوگیا، لیکن اُس نے آزادی، خودداری، غلامی اور مظلومیت کا جو احساس ملک میں پیدا کیا ہے، وہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے۔ ٹیگور کی شاعری نے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا ہے، اور وہ ہندوستان کی روح کو بے نقاب کرنے میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اُن معنوں میں قومی شاعری نہیں کہلا سکتی، جو اِس وقت زیرِ بحث ہے۔ ٹیگور بین الاقوامی شاعر ہیں، وہ امن و آشتی کے علمبردار ہیں۔ اس واسطے دنیا کے ہر حصّے کے باشندے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو گیتانجلی میں کئی ایک ایسے گیت ملیں گے جن سے حبِ وطن کی بُو آتی ہے۔ فردوسِ وطن کے نام سے عطاء اللہ کلیم نے ایک گیت کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

جس سرزمیں میں خوف و خطر کا گذر نہ ہو
جس سرزمیں میں حاکمِ جابر کا ڈر نہ ہو

جس سرزمیں میں علم کی پرواز ہو بلند
جس سرزمیں میں فرقہ پرستی کے ہوں نہ بند

جس سرزمیں میں بات ہو آئینۂ خیال
جس سرزمیں میں فکر ہے تشنۂ کمال

جس سرزمیں میں عقل نہ گم کردہ راہ ہو
جس سرزمیں میں روح سے اُس کا نباہ ہو

اُس جنتِ نظر میں بسیں میرے ہم وطن
گہوارۂ طرب میں رہیں میرے ہم وطن

آپ چکبست کے دیوان "صبحِ وطن" کو پڑھیے، ہر ایک نظم میں آپ کو دردِ وطن میں ڈوبے ہوئے جگر پارے ملیں گے۔ عنوان کوئی ہو لیکن وطن کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوگا کہیں شوکتِ پارینہ کا ذکر ہے۔ کہیں موجودہ بے بسی اور سیاسی کشمکش کا تذکرہ ہے۔ اور کہیں ماضی کی داستانیں ہیں۔ حال کا دُکھڑا ہے اور مستقبل کے خواب ہیں۔ غرض اُس دیوان کے ایک سیر حاصل مطالعہ کے بعد آپ کو ایک محبِ وطن کا مکمل خاکہ مہیا ہو جائیگا۔ لیجئے میں ہی ایک خاکہ پیش کئے دیتا ہوں۔

ملک کے قدرتی مناظر، اسلاف کے کارنامے اور شوکتِ پارینہ کے قصّے ایک انسان کے دل میں وطن پرستی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کے واسطے اُس کا ملک خوبصورت

قدرتی مناظر سے پٹا پڑا ہے، اس کی تہذیب و تمدن کا لوہا ایک دنیا مانتی ہے، چکبست ہی کی زبان سے سنئیے:۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت! کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر روز ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اب اسلاف کے کارنامے سنئیے:۔

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

ایسے اسلاف کے کارناموں کو یاد کرکے قومی برتری اور بزرگی کا غیر معمولی احساس ہوتا ہے

سب سُور ویر اپنے اِس خاک میں نہاں ہیں — ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں
دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

قومی بزرگی کا نشہ سر میں خمار اور دل میں سُرور پیدا کر دیتا ہے اور شاعر بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے:

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مُبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مُبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مُبارک — ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مُبارک

لیکن یہ غرور کا جذبہ دیر تک قائم نہیں رہتا جونہی غلامی اور موجودہ پستی کا خیال آتا ہے نشہ ہرن ہو جاتا ہے، قدرتی مناظر کا کیا لطف جب آزادی ہی نہیں ؎

جس کی قفس میں آنکھ کھُلی ہو مری طرح
اُس کے لئے چمن کی خزاں کیا، بہار کیا

ایک غلام کو اپنے شاندار تمدن کا کیا احساس؛ غلامی انسان کے فطری جوہر کو زائل کر دیتی ہے:۔

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

ہمارے دل و دماغ، ہاتھ اور پاؤں، زبان و قلم پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں، اور ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔

قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی | اُڑا ہے باغ سے بُو ہو کے رنگِ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے چٹک نہیں سکتے | ہمارے پھُول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے
زباں ہے بند، قلم کو جُدائی ہے زنجیر | بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

اس میں ہر ایک چیز کی فراوانی ہے، لیکن لوگ فاقوں مر رہے ہیں،

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اُس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

افلاس ہماری قومی غیرت کو مٹا رہا ہے۔

کرشمہ یہ بھی ہے اے بے خبر! افلاسِ قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدر جانا

اس پر ستم یہ کہ ہم اتنے بے بس ہو گئے ہیں، کہ اپنے ستانے والے کو ستا بھی نہیں سکتے۔

یہ بیکسی بھی عجب بے کسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

اور اس پر یہ حکم ہے کہ گھُٹ کے مر جائیں لیکن فریاد نہ ہو، حرفِ شکایت لب پر نہ آئے۔

حکم مالی کا ہے یہ پھول نہ ہنسنے پائیں
چُپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

آزادی بھلا کس کام کی؟ فرحت نے کیا خوب کہا ہے۔

کتر کر، نوچ کر، پر توڑ کر، پر باندھ کر فرحت
وہ مُرغانِ چمن کو قید سے آزاد کرتے ہیں

سیاسی پستی ہم میں کیسے آ گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم میں حبِ وطن کا فقدان ہے۔

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں | کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں | پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

لیکن اس غلامی کی ظلمت ہند پر آخر کب تک طاری رہتی؛ کوئی حالت ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتی اس دنیا کے کارخانے میں تغیر لازمی ہے

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا

آخر ہماری حالت میں بھی انقلاب آیا۔ افریقہ میں ٹرانسوال اور دیگر مقامات میں جو مظالم ہندوستانیوں پر توڑے گئے اور مہاتما گاندھی نے جو ستیاگرہ کی جدوجہد شروع کی اس سے ہندوستانی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور انھیں احساس ہوا کہ اپنے ملک میں بے بسی کی وجہ سے وہ دور رہتے ہوئے ہم وطنوں کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ چکبست نے "فریاد قوم" کے عنوان سے ٹرانسوالی ہندوستانیوں کا دکھ درد بیان کر کے ہماری رگ حمیت کو بھڑکایا ہے۔

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

لٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچوں کے کھانے کا انتظام نہیں جو صبح خیر سے گذری نصیب شام نہیں

اگر جیئے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لئے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

ادھر ہندوستان میں مسز اینی بیسنٹ نے تحریک ہوم رول شروع کی۔ سوئے ہوئے جذبات جاگ اُٹھے، قوم نے کروٹ لی اور سوراج کا زندگی بخش پیغام سنا:۔

حکم حاکم ہے کہ فریاد زبانی رک جائے دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے

مسز بیسنٹ کی گرفتاری نے تحریک آزادی پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ شاعر مسز بیسنٹ کو

مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے — جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے — چاندنی پھیل گئی حسنِ وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے، نور ہے محفل بھر میں

مسز بیسنٹ اور دیگر فدایانِ وطن کی گرفتاری اور قید نے قید خانے کو آزادیِ وطن کے راستہ میں ایک مقدس مقام بنا دیا۔

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا — فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا — قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے — بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے
درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے — وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

دل جذبۂ حریت سے سرشار ہے، بڑی سے بڑی مصیبت بھی سدِ راہ نہیں ہو سکتی

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

یہ وہ آگ ہے کہ بجھائے نہ بجھے،

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

اب تو سوراج کا سودا ہے، اور یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے۔"

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے — وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے — نہ کوئی مرغِ خوش الحال اسیرِ دام رہے
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

دنیا کی کوئی طاقت اس آزادی کی خواہش کو کچل نہیں سکتی،

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا — یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا

دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا　　رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہی جذبہ ہے جوان کے مشہور گیت "وطن کا راگ" میں پایا جاتا ہے۔

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے　　خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے اُنھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے　　وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے　　مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے............

یہی دعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی　　یہی اُمنگ جوانی کے نونہالوں کی
جو رہنما ہے محبت پہ مٹنے والوں کی　　ہمیں قسم ہے اُسی کے سفید بالوں کی

طلب فضول ہے............

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر　　وطن کا پاس ہے اُن کو سہاگ سے بڑھکر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر　　یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر

طلب فضول ہے............

یہ جذبۂ حبِ وطن عہدِ شباب میں اپنے انتہائی مدارج پر ہوتا ہے۔ جب خون میں حرارت دل میں جوش، زبان میں روانی اور آنکھوں میں وطن کی محبت کا نشہ چھلکتا ہے۔

جنونِ حبِ وطن کا مزہ شباب میں ہے　　لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لئے　　یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

وہ جوانی ہی کیا جو وطن کی خدمت میں صرف نہ ہو، وہ دلیری ہی کیا جو وطن کے کام نہ آئے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ　　جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ
جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب　　وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

لیکن یہ محض زبانی محبت نہ ہو، اگر اس کا اثر گہرا نہیں اور دل گرفتارِ محبت نہیں تو ایسی محبت کس کام کی!

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا　　اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

والوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے ۔۔۔ یہ جمع وخرچِ زبانی ہے رہے نہ رہے
زباں کے دور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل ۔۔۔ وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

فانی القوم کے لئے کوئی تکلیف موجبِ آزار نہیں، اور نہ ہی موت اُس کے مقصد کے لئے پیغامِ فنا ہے۔

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ وبُو کے لئے ۔۔۔ بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے
رہیگی آب وہوا میں خیال کی بجلی ۔۔۔ یہ مشتِ خاک ہو فانی رہے رہے نہ رہے

کیا ہوا اگر جسم قید ہے، زبان بند ہے اور راحت کا کوئی سامان نہیں

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے ۔۔۔ زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے
دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا ۔۔۔ ولولوں کے لئے ممکن نہیں زنداں ہونا
مٹنے والوں کو وفا کا یہ سبق یاد رہے ۔۔۔ بیڑیاں پیر میں ہوں اور دل آزاد رہے

خدمتِ وطن کی راہ میں اگر موت بھی آ لے تو بھی اُس کا خیر مقدم کرنا چاہئیے، کیونکہ وفا شعار موت کو موت نہیں سمجھتا، اور خاصکر وہ شخص جو حیات و ممات کی حقیقت جانتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

آخر کونسی چیز ہے جو ایک وطن پرست کو ہر قسم کے آزار سے بے پروا اور دنیا کے آرام و آسایش سے بے نیاز کر دیتی ہے، وہ اپنے منتہائے مقصود کے لئے ہر قربانی کرتا ہے، اور ہنستے ہنستے ہر نئی تکلیف اور آزمایش کے لئے سینہ سپر ہوتا ہے۔ منزلِ مقصود کی دوری اور پرخار راستہ اُس کے حوصلوں کو پست کرنے کے بجائے اُس کے آتشِ شوق کو تیز کر دیتا ہے بشاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو
دل ڈھونڈھتا ہے سلسلۂ انتظار کو

جب عاشقِ وطن قید سے آزاد ہوتا ہے، اُس کا پرجوش استقبال جو اُس کے ہم وطن اُس کے اعزاز میں کرتے ہیں نہایت ہی روح پرور نظارہ ہوتا ہے۔

قید سے چھوٹ کے آئے ہیں وفا کے یوسف ۔۔۔ سرِ بازار ہے کیا بھیڑ خریداروں کی

ہر غیر ملکی حکومت محسوس کرتی ہے کہ آخر قید کرنے سے اُسے کیا حاصل ہوا بھی کہ تحریک کو پہلے سے

بھی زیادہ تقویت ملی۔

گردنیں خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی رہ گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

وطن پرست کا دل ہر وقت اُمید سے بھرا نہیں رہتا۔ کبھی مایوسی کا دَور دورہ بھی ہوتا ہے جب اُسے مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ خاصکر ہندو مسلم کشیدگی اُسے بیزار کردیتی ہے۔

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھکر

بسا اوقات ہمارے استقلال کی کمی اور بے غرضانہ حبِ وطن کا نقدان ہمارے مشن کی کامیابی کو التوا میں ڈال دیتا ہے۔

گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

ہمارے لیڈروں کی ناقابلیت یا ان پر عدم اعتماد ہماری تحریک کو نقصان پہونچاتا ہے، اور وطن پرست کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

جسے ہے فکر مرہم کی اُسے قاتل سمجھتے ہیں الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بیکار کٹ گئی اور منزلِ مقصود ابھی کوسوں دُور ہے بسا اوقات یہ بھی شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم چٹان سے سر پھوڑ رہے ہیں۔ ناممکن الحصول کے لئے سعی لاحاصل کرتے رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر زندگی کا حظ اُٹھایا ہوتا یا کسی اور مدعا کو مرکزِ توجہ بنایا ہوتا۔ بعض اوقات ساری عمر کی جدوجہد کا بہت ہی تھوڑا ثمر دیکھ کر وہ کہہ اُٹھتا ہے کہ کاش ہم سے کچھ زیادہ مفید مطلب کام بن پڑتا۔

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے میں جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

بسا اوقات وہ اس اُمید و یاس کی زندگی سے گھبرا اُٹھتا ہے اور موت کو دعوت دیتا ہے۔

کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا ہے عدم میرا

لیکن یہ یاس و مایوسی کا جذبہ کچھ وقت کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی فطرت پھر اثر انداز ہوتی ہے، اور دل میں اُمید کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہی بے مائگی دل کی نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

یاس سے بھرنے کی ضرورت نہیں، ہر تاریکی کے بعد روشنی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ سیاہ بادلوں میں

ہی بجلی کوندتی ہے۔

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی — کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

اگر زندہ رہنا ہے تو کشمکشِ حیات سے بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش — جس طرح اپنے ہی سائے سے گریزاں ہونا

دنیا میں رہ کر آزادیِ وطن کی مہم جاری رکھ اور مایوس نہ ہو، اگر گوہرِ مقصود تیرے ہاتھ نہ آئے، کیونکہ

چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی — کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

ہندوستان کے قائدِ اعظم مہاتما گاندھی کی خدمت میں شاعر نے اپنی عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں:-

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر

بال گنگا دھر تلک اور مسٹر گوکھلے ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہے اُن کی وفات سے تحریکِ آزادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا۔ شاعر نے اُن کے مرثیے لکھے ہیں۔ مسٹر گوکھلے کی موت پر لکھا ہے،

خدا کے حکم سے جب آب و گِل بنا تیرا — کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے — سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

چکبست ملک کو ہر پہلو سے متمدن اور ترقی یافتہ دیکھنے کا خواہاں تھا، آزادیِ وطن کے حصول کے لئے تعلیم کی ترقی لازمی ہے۔ چنانچہ جب ہندو یونیورسٹی بنارس کا ڈیپوٹیشن زیرِ قیادت پنڈت مدن موہن مالویہ برائے فراہمیِ چندہ لکھنؤ پہونچا تو اُس جلسہ میں جو اس غرض کے لئے منعقد ہوا چکبست نے ایک ولولہ انگیز اپیل کی:-

یہ کارِ خیر وہ ہو نام چار سو رہ جائے — تمہاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے

جو غیر ہوں اُنھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے — غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کردو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھردو

تعلیم نسواں کی ترقی کا بھی وہ دل سے خواہاں تھا، کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر عورت جاہل اور پھوہڑ ہے تو قوم کے بچے کب پروان چڑھیں گے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ مغربی تہذیب کی رَو میں بہہ کر قوم کے بچے اپنی شاندار تہذیب اور روایات کو خیرباد نہ کہہ دیں، 'پھول مالا' کے نام سے اُس نے لڑکیوں کو جو نصیحت کی ہے اُس کا ہر ایک لفظ آبِ حیات ہے۔

روشِ خام پہ مردوں کے نہ جانا ہرگز　　داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم　　تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں　　ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا　　اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں　　یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ابھی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو　　پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو　　دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اُس وقت کا رنگ　　اِن ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں　　تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

"زمانہ" تیس۳۰ سال پہلے

سوامی دویکانند پر نواب رائے" کے نام سے منشی پریم چند مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سوامی جی موصوف کی بعض تقریروں کے کچھ اقتباسات بھی درج ہیں۔ یہ تقریریں آج بھی عزیزانِ وطن کیلئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں اس لئے یہاں پر ان کا اقتباس بے موقع نہ ہوگا:۔

"پیارے ہموطنو! اے مقدس آریہ ورت کے بسنے والو، کیا تم اپنے ذلت آمیز بودے پن سے وہ آزادی حاصل کر سکو گے جو دلیروں کا حق ہے۔ اے برادرانِ ہند یہ خوب یاد رکھو کہ سیتا، ساوتری، اور دمینتی تمہاری قوم کی دیویاں ہیں۔ اے بہادرو! مرد بنو اور للکار کر کہو "میں ہندوستانی ہوں، میں ہند کا رہنے والا ہوں" ہندوستانی اور ہند کا بسنے والا خواہ کوئی ہو میرا بھائی ہے۔ جاہل ہندوستانی، نادار ہندوستانی۔ اعلیٰ قوم کا ہندوستانی۔ ادنیٰ قوم کا ہندوستانی۔ سب میرے بھائی ہیں۔ ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ میری زندگی ہندوستانی ہے۔ ہندوستان کے دیوتا میری پرورش کرنے والے ہیں۔ ہندوستان میرے بچپن کا گہوارہ۔ میرے شباب کا عیش گاہ اور میرے بڑھاپے کا فردوس بریں ہے۔ اے شنکر! اے مادرِ گیتی! مجھے مرد بنا، میری کمزوری کو دور کر اور میری نامردی کو مٹا دے۔"

("زمانہ" مئی ۱۹۰۴ء)

کلامِ جگر

(ہمارے محبِ قدیم حضرت جگرؔ مراد آبادی کا یہ تازہ ترین عطیہ ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں)

تھی جو بنیاد شادی و غم کی — دل نے وہ انجمن ہی برہم کی
آہ کی ہے صدا نہ ماتم کی — کیا طبیعت بدل گئی غم کی
اُس نے شانوں پہ زلف برہم کی — خیر! یارب نظامِ عالم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی — کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی
شانِ رحمت برس پڑی کیا کیا — اس خطا پر کہ ہر خطا کم کی
آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر — آگ بھڑکا گئی جہنم کی

اک خطا پر سزائے بے بنیاد
ہائے تقدیر ابنِ آدم کی

حسن کامل ہے ترا اور بھی کامل ہو جائے — میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے
شعر و الہام تو کیا عرش بھی نازل ہو جائے — دل جو اک شے ہے حقیقت میں اگر دل ہو جائے
دونوں عالم سے فراغت مجھے حاصل ہو جائے — عشق اگر حسن بنے حسن مرا دل ہو جائے
اُف رے بیدادِ فلک، ہائے رے تقدیرِ چمن — غنچہ کھلنے بھی نہ پایا کہ مرا دل ہو جائے
مجھکو منظور دو عالم سے رقابت لیکن — وہ نگاہِ متبسم طرفِ دل ہو جائے
حیف وہ حسن کا پندار، جو کھا جائے شکست — ہائے وہ زعمِ محبت کہ جو باطل ہو جائے
میں تو منھ پھیر لوں اے وسعتِ صحرائے جنوں — اب جو کوئی بھی چاہے کہ مرا دل ہو جائے

میں کہیں کا نہ رہوں عشق کہیں کا نہ رہے
اک نفس بھی جو فراغت مجھے حاصل ہو جائے

---

۴ مئی کو کسی شخص نے مراد آباد سے جگرؔ صاحب کے انتقال کی خبر اڑا دی۔ جس سے ملک بھر میں رنج و ملال کی لہر دوڑ گئی۔ مگر شکر ہے کہ دوسرے ہی دن اس خبر کی تردید ہو گئی۔ خدا کرے عرصہ دراز تک آپ اپنی کمال شاعری سے ملک کو مستفید کرتے رہیں۔

پُرانا آریہ ورت[1]

پنڈت کشن پرشاد کول بی۔ اے رُکن انجمن خادمان ہند

دُنیا ابھی اپنے وحشیانہ پن کے دھندلکے سے اُبھرنے نہ پائی تھی۔ اِنسان نے اپنی قدرتی برہنگی کو ڈھاکنا ابھی مشکل سے سیکھا تھا۔ دجلہ و فرات کے کنارے اور وادیٔ نیل کی گھاٹیوں میں شائستگی کی پَو اب پھٹنی شروع ہی ہوئی تھی کہ پُورب کے دیس آریہ ورت میں پہلے پہل تہذیب و تمدن کا سُورج آب و تاب سے چمکتا نظر آیا۔ کوئی چار ہزار برس ہوتے ہوں گے کہ آرین قوم کا ایک کاروان وسطی ایشیا سے کوچ کر کے انڈس کی پنج ندیوں کے کنارے آکر ٹھہرا۔ جہاں اُس نے اپنے ڈیرے ڈنڈے ڈال دیئے اور فتح کے جھنڈے گاڑ دئے۔ رفتہ رفتہ گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک اُس نے اپنا قبضہ جمایا۔ رِگ ویدکی رچنا کے رچنے والے یہ آریہ اِس دیس میں بس کر ہندو کہلائے، اور اس ملک کا نام ہندوستان پڑا۔ بُودھ مت کے عروج کے زمانہ سے قطع نظر کر کے کہ جب چندر گپت موریہ کے عہد میں میگیا و لی اور بسمارک کا پیش رو اور ارتھ شاستر کا مصنف چانکیہ پیدا ہوا۔ اور پھلا پھولا اور اشوک اعظم نے اُس زمانہ کی سب سے عظیم الشان سلطنت پر حکومت کی جس کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا۔ ہندو آریوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کو مورخوں نے تین حصوں میں بانٹا ہے۔ سب سے پہلا اور پُرانا زمانہ رِگ وید کا ہے یعنی جب آریوں نے اپنا تسلط پنجاب پر جمایا۔ یہ زمانہ نہ معلوم کب سے شروع ہوکر ۱۴۰۰ قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا زمانہ اُپنشدوں مہابھارت اور رامائن کا ہے یعنی جب اِس قوم نے ستلج کو پار کر کے گنگا اور جمنا کے دوآبہ پر اپنا تسلط کیا اور امن و سکون کے ساتھ تہذیب و تمدن کو نشو و نما دینا شروع کیا۔ یہ زمانہ ۱۴۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوکر ۱۰۰۰ قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کا تیسرا عہد منطق، فلسفہ و اصلاح کا وہ دَور ہے جو اس کا سب سے درخشاں باب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس زمانہ میں اُپنشدوں کی تعلیم کو مکمل کر کے ہندوؤں نے فلسفیانہ نازک خیالی اور باریک بینی کو اوج کمال پر پہونچا یا تھا صدیاں گذر گئیں کہ سانکھ فلسفہ کے موجد کپل کا نام علمی دُنیا میں آج تک ادب سے لیا جاتا ہے فلسفہ کے علاوہ گرامر، منطق، ریاضی اور نجوم کے علوم میں بھی اُنھوں نے ایسی دستگاہ حاصل

[1] یہ مضمون لکھنؤ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے ۵ اپریل کو براڈکاسٹ کیا گیا تھا۔ ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن ڈ [illegible] سے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

کی تھی۔ جس سے دنیا کو فیض پہنچا۔ اسی زمانہ میں کشمکش زندگی سے بے چین اور مکروہات دنیاوی سے تنگ اور عاجز مخلوق کو گوتم نے اس سکون و دائمی نجات کا وہ پیغام دیا۔ کہ جو اس دنیا کے اندھیرے میں راہ کا کھوج لگانے والے کیلئے ابد تک مشعل کا کام دیگا۔ ہندوؤں کی تاریخ کا یہ عہد اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ یہ شمالی ہندوستان سے نکل کر بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ اور دکن تک اُس زمانہ میں پھیلے۔ یا یوں کہیئے کہ تمام ہندوستان پر چھا گئے۔ اور جوں جوں ہندو پورب، پچھم اور دکن میں پھیلتے گئے۔ گوتم کا پیغام بھی بدھ مت کے نام سے مقبول عام ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ تمام دنیا پر چھا کر رہا۔ یہ زمانہ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے شروع اور ۳۲۰ قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ کپل کے فلسفہ، گوتم بدھ کے اپدیش اور چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم کے زمانے کی تاریخ کا تذکرہ تو آپ کسی اور کی زبانی کسی اور دن سنینگے آج تو آپ کو صرف رگ وید، مہابھارت، رامائن اور اپنشدوں کے دور کے آریوں کا حال سنانا منظور ہے۔

ہندو آریوں کی یہ قوم جو پنجاب میں آکر بسی، فتح اور عظمت کے ارمان دلوں میں لیکر آئی تھی۔ ہمت اور جیوٹ اُس کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی۔ اُس کی زندگی نہایت سادہ، سہل اور دل لبھانے والی تھی۔ کھیتی باڑی کرنا، گھر بار کی حفاظت کرنا، بال بچوں کی پرورش کرنا گھر کے ہر ایک سر دھرے کا کام تھا۔ اُس وقت تک نہ بڑی بڑی حکومتیں تھیں نہ راجہ و مہاراجہ، ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو ضرورت کے وقت اُس کی رہبری کرتا تھا۔ یہی صورت مذہب اور پرستش کی تھی۔ نہ دیویاں تھیں نہ دیوتا۔ نہ مندر تھے نہ پجاری۔ نہ پروہت تھے نہ لمبے چوڑے یگ اور نہ پوجائیں کائنات قدرت سے حیرت زدہ ہو کر اُس کے دلفریب مناظر کے آگے یہ سیدھے سادھے لوگ سر جھکا دیا کرتے تھے۔ ہر گھر میں اگن آہوتی دیجاتی تھی اور وید منتر پڑھے جاتے تھے اور بس۔ ورن آشرم کے دستور یا ذات کی تفریق سے یہ لوگ قطعی ناواقف تھے۔ نہ برہمن تھے نہ کھشتری نہ شودر، سب کے سب ہندو آریہ کہلاتے تھے۔ وہی رشی اور منی جو وید منتروں کو پڑھتے اور اُن کی رچنا کرتے میدان جنگ میں جا کر فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتے، اور جو لوگ قبیلوں کے سردار ہوتے وہی وید کا پرچار بھی کرتے۔ ذات کی تفریق صرف آریہ اور غیر آریہ میں ہوتی، عورتوں کا مرتبہ بھی سماج میں اونچا تھا۔ گھر میں اُنکی عزت اور اختیار ہوتا تھا۔ باہر آنے جانے میں نہ روک ٹوک تھی نہ پردہ، شادی بچپن میں نہیں ہوتی تھی۔ شادی کا رشتہ باندھنے میں لڑکی کی مرضی کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ شادی کے وقت وید منتروں کے ذریعے سے خاوند اور بیوی میں عہد و پیمان ہوتے تھے

بیواؤں کی شادی کی ویدوں میں اجازت تھی۔ اُس زمانہ میں بیواؤں کی شادی ہوا کرتی تھی۔ عورت کیلئے کنوارا رہنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں پڑھتی لکھتی بھی تھیں۔ اگن ہوتی میں مردوں کے ساتھ برابر بیٹھتی تھیں۔ ایسی ایسی ودوان بھی نکلیں کہ جنھوں نے رشیوں کیساتھ شاستراتھ کئے۔ اور رشیوں کا مرتبہ پایا۔ اُن ہندو آریوں کی زندگی سادی اور سچی ضرور تھی لیکن دُنیا کی دولت اور عظمت اور تمام لذتوں سے یہ گریز نہ کرتے تھے۔ کھانے پینے اور باتوں میں بھی ممنوعات نہ تھیں۔ شکار اور قربانیاں کرتے تھے اور تقریباً ہر جانور کا گوشت کھاتے تھے۔ یہ لوگ سوم رس کے جو ایک قسم کی شراب ہوتی تھی، بڑے دلدادہ تھے۔ اس کا شوق نہایت عام تھا اور اُس کو متبرک سمجھکر پیتے تھے۔ یہ تو رِگ وید کا زمانہ ہوا۔ اب مہابھارت، راماین اور اُپنشدوں کے عہد پر نظر ڈالئے۔ آریہ اب ستلج پار کرکے گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک پھیل گئے تھے۔ بلکہ ترہت تک اُن کا تسلط ہو گیا تھا۔ چھوٹی بڑی سب طرح کی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ قانون اور ضابطے نے رواج پایا تھا۔ علم و ہنر کو ترقی ہو رہی تھی۔ پچھلے زمانہ کی سیدھی سادھی زندگی پر شائستگی کی آب و تاب جھلکنے لگی تھی۔ تکلفاتِ زندگی بڑھتے جاتے تھے۔ شہر آباد ہوتے جاتے تھے راجدھانی میں محلوں اور قلعوں کی تعمیر ہونے لگی تھی۔ سڑکیں اور نہریں نکالی جاتی تھیں۔ تیر و تفنگ، ڈھال اور تلوار اور زرہ بکتر کے علاوہ سونے اور چاندی کے زیوروں اور جواہرات کا استعمال بھی ہونے لگا تھا۔ پولس اور عدالتیں قائم ہو گئی تھیں۔ محصول لگائے جاتے تھے۔ صنعت و حرفت اور دستکاری نے فروغ پایا تھا۔ غرضیکہ اس زمانہ میں ہندو تہذیب و تمدن نشو و نما پا رہا تھا۔ تاریخ میں پانچ شاہی خاندانوں اور حکومتوں کا ذکر خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ دہلی کے قرب و جوار میں کوروں کی حکومت تھی۔ قنوج پنچالہ خاندان کی راجدھانی تھی۔ اودھ اور اُس کے آس پاس میں کوشل خاندان حکومت کرتا تھا اور کاشی بنارس کے گرد و نواح میں ترہت اور متھلا میں [illegible] ندان کا تسلط تھا۔ جابجا پریشد اور گورو کل قائم ہو گئے تھے۔ جنمیں قوم کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اور وید شاستر، ویاکرن اور جوتش کے علوم سیکھتے تھے۔ مذہب اور پرستش کے طریقوں اور عقیدوں میں بھی بڑی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ سیدھے سادھے وید منتروں اور اگن آہوتی کی جگہ دیوی، دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ، یگ اور تپس اور کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں نے لے لی تھی۔ برہمنوں کا بڑا زور تھا۔ گردؤں اور پروہتوں کی بڑی جماعت ایک علیحدہ ذات بن گئی تھی۔ اسی طرح حکمراں طبقہ نے بھی رعیت پر حاوی ہو کر اُس سے علیحدہ

اپنی ایک ذات قائم کرلی تھی۔ اسی طرح سے برہمن اور کھشتری ذاتیں بنیں، باقی معمولی رعیت ویش کہلائی۔ غیر آریہ قوم کے ادنیٰ لوگ جنھوں نے آریہ قوم کی تہذیب کو قبول کرلیا تھا۔ شودر سمجھے گئے۔ ذات کی تفریق تو جو ہندو قوم کے زوال کا باعث ہوئی اس زمانہ میں قائم ہوگئی تھی، مگر ابھی تک کھانے پینے کی قیدیں اور چھوت چھات شروع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ بھی ہوتا تھا۔ ذات کی موجودہ بگڑی ہوئی شکل جو آج ہم دیکھتے ہیں یہ بہت عرصہ کے بعد کی جدت ہے۔ ہندوں میں مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج بھی اسی زمانہ میں شروع ہوا گو یہ امیروں اور رئیسوں کے طبقہ تک ہی محدود تھا۔ رگ وید کے علاوہ اور تینؔ وید اُسی زمانہ میں لکھے گئے اور مہابھارت اور رامائن بھی۔ ایک بہت بڑی تبدیلی جو اس زمانہ میں ہوئی وہ یہ تھی کہ رگ وید کے زمانہ کے عام آریوں میں جو مردانگی کے جوہر، جیوٹ اور ہمت کے ولولے پائے جاتے تھے وہ قوم کے عام لوگوں میں اب نہیں دکھائی دیتے تھے۔ ایک وجہ تو اُس کی یہ تھی کہ اِس مُلک کی گرم آب وہوا نے طبقوں میں سُستی اور تکان پیدا کردی تھی۔ دوسرے شائستگی کی چلا، علم وہنر کی مصروفیتوں اور تکلفات زندگی کی عادتوں نے قوم کو آرام پسند بنادیا تھا۔ لیکن عوام الناس کی پستی اور ادبار کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ملک گیری اور ملک داری کا کام اور فتح وعظمت کا ولولہ قوم کے حکمران طبقہ میں محدود ہوکر رہ گیا تھا اور علم وفلسفہ اور تہذیب وتمدن کے نشوونما کو برہمنوں نے بلاشرکت غیرے اپنا فرض وحق قرار دے دیا تھا۔ جمہور قوم کو ان برہمنوں اور کھشتریوں نے اِس طرح سے جکڑ بند کر رکھا تھا کہ اطاعت گذاری کے علاوہ یہ کسی مصرف کے نہیں رہے تھے اس زمانہ کے برہمنوں کے ایجاد کئے یوگ بنس اور کریاؤں کے اُپدیس کا اثر عام لوگوں کی ذہنیت پر یہ پڑا کہ دُنیا مایا اور متھا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اُن میں اپنی آزادی اور حقوق حاصل کرنیکے ولولے پیدا نہ ہونے پائے اور دنیوی کام کاج سے اُن کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندوں نے تاریخی تعمیرات سنگ تراشی اور دوسری اختراعوں اور ایجادوں کی طرف سے لاپروائی برتی۔ دوسری طرف یوگ اور گیان کا فلسفہ بھی اُن کی پرواز سے اونچا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ چھوت چھات، ذات پات اور شبہ اور شنکا کے ڈھونگ میں پڑ کر کسی کام کے نہ رہے۔ اور ان پر ہندی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ "دُبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام"۔ اس عہد کے آخری حصہ میں کھشتریوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ برہمنوں کو زک دیکر اُن کے پنجے سے چھٹکارا حاصل کریں۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، تاہم برہمنوں کے یوگ بنس اور کریاؤں ریتوں

اور رسموں کے اُس جال کو جو اُنھوں نے پھیلا رکھا تھا۔ اُس زمانہ کے عالی ظرف کھتریوں نے جنمیں راجہ جنک کا نام خاص طور سے ممتاز ہے۔ اُپنشدوں کے گیان اور فلسفہ سے ایک حد تک توڑا۔ اُپنشدوں کی تعلیم کی عظمت کے بارے میں صرف اِسقدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ شوپنہار "Schopenher" نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دُنیا بھر میں کسی چیز کا مطالعہ اُپنشدوں کی تعلیم سے زیادہ روح افزا نہیں۔ اپنشد ہی زندگی بھر میرے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں اور مرتے وقت بھی مجھے انھیں سے تسکین ملیگی"۔

اِس تذکرے کو ختم کرنے سے پیشتر دو تین باتیں اِسی سلسلہ میں اور کہنی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دُنیا کی تاریخ میں ہماری تہذیب و تمدن سب سے پُرانا ہے۔ یعنی پُرانے زمانے میں ہماری تہذیب و تمدن نے جو مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اسوقت کسی ملک یا کسی قوم کو شائستگی کا یہ شرف حاصل نہ ہوا۔ چونکہ پُرانے زمانے کے ہندو آریہ علم تاریخ سے ناواقف تھے۔ ہمارے یہاں کی ملک گیری اور ملک داری کے مسلسل حالات، شاہی خاندانوں کے نام اور ہماری لڑائیوں کی تاریخیں صحیح صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ اِسلئے مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ کا شروع ۵۰۰ قبل مسیح سے کیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شروع ہی ۵۰۰ قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ اور باقی جو کچھ ہے وہ سب من گھڑت کہانیاں یا سُنی سنائی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں ہماری تہذیب و تمدن کے نشو و نما کا جسقدر سلسلہ وار حال مرتب ہے۔ اُس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔ اور جو کچھ لٹریچر میں ملتا ہے، اُس کی تصدیق پُرانے سکوں اور پُرانے آثاروں سے ہوتی ہے۔ بالخصوص منجدارو اور ہڑپا کے پُرانے آثاروں سے جس تہذیب و تمدن کا کھوج ملا ہے اُس سے تو ہماری تاریخ ایک ہزار سال اور پُرانی ثابت ہوتی ہے۔ وہ زمانہ دُور نہیں کہ مورخ ہندوستان کی تاریخ کو ۳۰۰۰ قبل مسیح سے شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور ہماری تہذیب اب سے ۵۰۰۰ برس پُرانی ثابت ہوگی۔ دوسری بات دھیان میں رکھنے کی یہ بھی ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن ہندوستان کی ہی چہار دیواریوں میں بند رہا۔ اور اس کو اور تہذیب دُنیا سے کچھ سروکار نہ تھا، صحیح نہیں۔

اول تو اس زمانہ کی مہذب دُنیا ہی کتنی تھی۔ پھر آجکل کے زمانہ کی سی سفری آسانیاں بھی نہیں تھیں۔ تاہم تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو پُرانے زمانے میں بھی جہازرانی سے واقف تھے، اور اُن کا سلسلہ تجارت اور تبادلۂ خیالات اس وقت کی مہذب قوموں سے ہوتا رہتا تھا۔ پروفیسر رولنسن (Prof Rowlinson) نے لکھا ہے کہ فنیقیہ اور ہندوستان کے درمیان

۹۵۰ قبل مسیح میں سلسلہ تجارت جاری تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل سے ہاتھی دانت، مور پنکھ، مٹی کے برتن، بنی ہوئی چیزیں اور جواہرات فینقیہ جایا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں تبادلۂ خیالات بھی لازمی تھا۔

ان کا یہ بھی بیان ہے کہ فیثاغورث نے یونان میں جس فلسفہ وحقانیت کا وعظ کیا۔ اس پر اُپنشدوں کی تعلیم کپل کا فلسفہ اور گوتم کے مذہب کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ یونان کی تہذیب اور تمدن کے نشو ونما میں آواگون، کرم، نروان اور موکش کے مسئلوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور وہاں کے علوم ریاضی اور نجوم کی ابتدا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یونان ان معاملوں میں ہندوستان کا بہت کچھ مرہون منت تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ہماری تہذیب وتمدن نہایت پرانا ہے اور اُس نے دُنیا کو شائستگی کی تعلیم دی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ عجیب وغریب معجزہ تو یہ ہے کہ اس تہذیب نے عمر جاوداں پائی ہے۔ پچھلے ۰۰۰۰ برس میں صفحۂ ہستی پر کتنی ہی تہذیبیں اُبھریں، پھلیں پھولیں اور بالآخر پیوند زمین ہو گئیں۔ آج اُن کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔ لیکن ہماری تہذیب سفرِ زندگی کی مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی آج بھی جیتی جاگتی نہ صرف زندہ اور باقی ہے۔ بلکہ جوانی کی اُمنگیں پہلو میں رکھتی اور ترقی وعروج کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ رشی رانا ڈے نے اِس معجزہ کو مشیت ایزدی کے مظاہرے سے تعبیر کیا ہے اور اسمیں قوم کے آیندہ عروج واقبال کے راز کو پنہاں بتایا ہے۔ اِسی خیال کو اقبال نے بھی اپنے ترانۂ ہندی میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے ۔۔۔ ابتک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔۔۔ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

غلط فہمی نہ ہو میں اس کا قائل نہیں کہ "پدرم سلطان بود"۔ جو قومیں آج کشمکش حیات میں اپنا قدم ثابت رکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کو اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اور وہی مقابلہ کی تاب لاسکیں گی۔ کہ جن کے سینہ میں اُبھرنے کے ارمان اور سرفروشی کی تمنائیں نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ یہ لوگ پیچھے پھر کے نہیں دیکھتے بلکہ اُن کی نگاہیں سامنے رہتی ہیں۔ اور قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اس مغربی تہذیب کے دور میں کہ سائنس کی جلوہ کاریاں جس کا خاصہ ہے، کپل کا فلسفہ اور گوتم کا پیغام ہمکو "عاقبت کی خبر خدا جانے" دُنیا کو نہیں بخشوا سکتا اور اگر ہم ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ تو ہم کو مغرب سے ابھی بہت کچھ

سیکھنا ہے، یہ سب کچھ صحیح ہے تاہم یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ پیکارِ زندگی میں گامزن ہونے کے لئے بزرگوں کی گاڑھی کمائی کا یہ زادِ راہ بھی بڑا کارآمد اور ضروری چیز ہے۔ کیا اس ورثہ کو جس پر ہمیں جا بجا طور پہ ناز کرنا چاہیئے۔ اور ناز ہے ہم آسانی سے ضائع ہونے دیں گے؟ اور اگر ہم نے ایسا کیا تو کیا یہ کوئی عقل کی بات ہوگی؟

ریلوے، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون۔ موٹر کار اور ایروپلین، مشین گن۔ ڈائنامیٹ اور تارپیڈو۔ سینما، ریڈیو اور ٹیلیوژن بڑی حیرت انگیز اور کارآمد چیزیں ہیں۔ لیکن معیارِ شرافت وشائستگی اِن سے بھی بالاتر ہے۔ یوروپ والے اس کا کھوج ابھی پوری طور سے نہیں لگا سکے ہیں۔ آدمی میں انسانیت بھی کوئی جوہر ہے۔ اِس راز کا پتہ ضرور اپنشدوں کی تعلیم کپل کے فلسفہ اور گوتم کے پیغام سے چلتا ہے۔ اور یہی بات سمجھنے کی ہے۔

حبِ وطن

آجکل ہر شخص کی زبان پر حب الوطنی کا ذکر ہے۔ ہر شخص اپنے تئیں محبِ وطن سمجھتا ہے۔ مگر کتنے لوگ وطن کا درد دِلوں میں رکھتے ہیں۔ فوری جوش سے کوئی محبِ وطن نہیں بن سکتا۔ ذاتی ارادوں میں ناکامی۔ نام کی خواہش یا کسی دنیاوی فائدے کی آرزو کسی کو وطن پرست نہیں بنا سکتی۔ ذراسی خودغرضی کا دخل بھی حبِ وطن کے منافی ہے نفرت کا ذرا سا بھی لگاؤ اس کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچیئے تو سہی کہ آپ کے دِل میں اپنے ملک کی کسقدر سچی محبت ہے۔ ایک تقریر میں سوامی ویویکانند نے حب الوطنی کے دعوے داروں کو مخاطب کرکے کہا کہ کیا تمہارے دِل میں اس بات کا درد اور احساس ہے کہ کروروں بندگانِ خدا جو تمھارے ملک کے بزرگوں کی اولاد ہیں حیوانیت کے درجے تک پہونچے ہوئے ہیں؟ کیا تم کو یہ درد ہے کہ تمھارے ملک کے کروروں آدمی مدتوں سے بھوکوں مر رہے ہیں؟ کیا تمہیں اسکا قلق اور صدمہ ہے کہ تمام ملک میں جہالت کالی گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے؟ کیا اِن باتوں کو سوچکر تم بے چین ہوجاتے ہو؟ کیا اِن خیالات سے تمھارا خواب وخور حرام ہوجاتا ہے؟ کیا تمہارے رگ وپے میں یہ احساس خون کی طرح دوڑ رہا ہے اور تمہارے قلب کی حرکت سے ہم آہنگ ہے؟ کیا اپنے وطن کی تکلیف اور تباہی کے خیال نے تمہیں محو کرلیا ہے اور نام ونمود، اپنی شہرت اپنے اہل وعیال اپنے مال ومتاع اور خود اپنے جسم کو بالکل بھول گئے ہو؟ کیونکہ محبِ وطن بننے کی پہلی شرط اور یہی پہلی منزل ہے۔

ماڑی اِنڈس

(چاندنی رات میں)

از حضرت طالب چکوالی بی-اے' ایل ایل بی

چاندنی کا دلربا منظر شرابِ حسن ہے — چاندنی کا جانفزا منظر شبابِ حسن ہے
نور کے دریا میں ہیں دیوار و در ڈوبے ہوئے — نور کے سیلاب میں سنگ و شجر ڈوبے ہوئے
ساحلِ دریا قبائے نور سے آراستہ — کوہساروں کا جہاں آراستہ پیراستہ
کشتیِ مہتاب بحرِ آسماں میں ہے رواں — ایک ہے دریا میں کشتی اور اُسمیں اِک جواں
گا رہا ہے کس مزے سے، فکر سے آزاد ہے — نور اور نغمہ سے اِک دنیا نئی آباد ہے
پتھروں کے ڈھیر اور اشجار ہیں بکھرے ہوئے — ساحلِ انڈس پہ سچ مچ لعل ہیں بکھرے ہوئے
پتھروں کی سلطنت کے شاہزادے دیکھیے — ہستیِ خاموش کے رنگیں ارادے دیکھیے
چاندنی میں ریت کے دریا کی بھی ہے کیا بہار — در کنارِ آبجو ہے ایک سیمیں رُود بار
نور کا دریا ہے یا سیماب کا دریا ہے یہ — چاندنی کا سحر ہے یا نور کی دُنیا ہے یہ
ہیں کھڑے اشجار جو دریا کنارے خال خال — عکس اپنا دیکھ کر ہیں آپ ہی مستِ جمال
اور ہے اُس پار کالاباغ کی نوریں بہار — کس طرح پھیلا ہوا ہے در کنارِ کوہسار
نیچے اوپر دُور تک روشن گھروں میں ہیں دیئے — عکس ان کا آبِ انڈس پر ہے اِک جادُو کیے
نور کے سیلاب میں دیوار و در ڈوبے ہوئے — نور کے سیماب میں ہیں سیم و زر ڈوبے ہوئے
چاندنی کا سحر، عکسِ نور، آب و تابِ آب — نور میں ڈوبے پہاڑوں کا ہے منظر لاجواب
نور کی مینا میں ہے لطف اور مستی کی شراب — ڈھل گئی ساغر میں طالب کیفِ ہستی کی شراب
آسماں سے نور کے دامن میں چھن کر آئی ہے — چاندنی کی حُور شیشے میں اُتار کر لائی ہے

بیچئے یہ مے، کہ ساقی نے صلائے عام دی
شوق سے پی اور پی، جی بھر کے پی، اور خوب پی

ایک وادی کی شام

(از مولوی عبدالواسع عصری چکگوری)

لہلہاتے کھیت ہیں ساکن ہے جنگل کی فضا
شام کا ہے وقت جنگل سارا سونا ہوگیا

زندگی کی دوڑ سے خستہ پرندے ہوگئے
آکے اپنے گھونسلوں میں سر چھپا کر سو گئے

شام کے سیاح نے بھی کھینچ لی رخ پر نقاب
پڑگیا ہے عرصۂ گیتی پہ دھندلا سا حجاب

چھاگئی شب کی سیاہی کوہ اور میدان پر
خوف سا ہوتا ہے طاری دیکھکر انسان پر

بحر و بر پہ ہے سکونِ عارضی چھایا ہوا
قافلہ موجوں کا ساحل کی طرف آیا ہوا

ایک انگڑائی میں فطرت کی جہاں مدہوش ہے
زندگی کا مدعا اب موت کا آغوش ہے

کوہ ساکن ہے مگر ندی رواں ہے زور سے
پُرسکوں وادی میں ہنگامہ ہے اسکے شور سے

جھومنا پودوں کا مستی میں ہے کتنا دلنواز
چاہتے ہیں کچھ کہیں موجوں سے اپنے دل کا راز

کھلکھلاکر جب چٹانوں کے قریب آتی ہے وہ
مسکراکر موت کے آغوش میں جاتی ہے وہ

دیکھ! اے نادان انساں یہ ہے رازِ زندگی
ہر رگِ جاں میں ہے پنہاں سوز و سازِ زندگی

مشکلاتِ دہر سے ڈرنا کبھی اچھا نہیں
ہند والے! بزدلی تیرے لئے زیبا نہیں

ہوکے انساں راہِ فطرت سے اگر تو دُور ہے
میں سمجھ لونگا کہ تیری چشمِ دل بے نور ہے

فلسفۂ ہستی

ہر وقت جو گھیرے رہے پستی مجھ کو
تو خاک بلندی میں ہو مستی مجھ کو

ہونا ہے مجھے نیست کسی دن بسمل
لائی ہے کہاں کھینچ کے ہستی مجھ کو

(بسمل الہ آبادی)

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(اسمِ جامد)

از مسٹر سلیم جعفر

اسم کی تین قسموں جامد۔ مصدر۔ مشتق میں سے پچھلی دو سے بحث کی جا چکی۔ اب صرف اسم جامد سے بحث کرنی ہے۔ ایک قواعد نویس کا خیال ہے کہ "فارسی میں اکثر جامد لفظ صورت میں مفرد اور حقیقت میں مرکب ہیں، مثلاً کمند مبدل خم۔ وند کا ہے، کیونکہ کمند خم در خم ہوتی ہے۔ غرض فارسی میں ہزاروں لفظ مرکب ہیں مگر اُن پر جامد ہی کے احکام جاری ہیں"۔ یہی مقتدر مصنف اس سے پہلے اسمائے مشتق سے بحث کرتے ہوئے اسم فاعل ترکیبی کے بیان میں رقم طراز ہے:۔ "وند مثلاً پولادوند۔ آوند (یعنی آب وند) پہلے خاص پانی کا برتن تھا اب عام ہے، حقیقت میں یہ وہی لفظ ہے جو سنسکرت میں ونت ہے مثلاً بلونت (زورمند) شاید مند اور وند سے بھی اس کا اتحاد ہو۔"[3] ایک ہی لفظ کو ایک جگہ مشتق ماننا اور دوسری جگہ مرکب یہ قرینِ قیاس نہیں۔ اِن متضاد بیانوں کے دو سبب ہیں۔ تسمیہ اسماء کا فریب دہ ہونا اور فارسی اور سنسکرت میں جو حقیقی تعلق ہے اس کو تسلیم کرنے کے بعد بھی سنسکرت کے ذریعہ جو کیفیتیں فارسی زبان کی معلوم ہوتی ہیں اُن کے اعتراف میں پس و پیش ہونا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی مغالطہ کا امکان ہی نہ تھا۔ متحد الماخذ ہونے کی وجہ سے اس اساسی اُصول کے اعتراف سے مفر نہیں کہ فارسی کے لفظ جس صورت میں ملتے ہیں وہ سنسکرت کے لفظوں کی طرح مادّوں سے بنائے گئے ہیں اور اکثر لفظ اُن تینوں منزلوں میں سے جو ان مضامین کے شروع میں بیان کی جا چکی ہیں۔ دوسری منزل سے آگے نہیں بڑھتے۔ مثلاً اسپ کا مرادف سنسکرت میں اَشْوَ (अश्व) ہے۔ یہ مادّہ۔ اَش (अश्। چلنا۔ پھرنا۔ جلد ہونا) میں لاحقہ۔ وَ (व) لگا کر بنایا گیا ہے اور چونکہ سنسکرت کا श्व (شْوَ) فارسی میں اکثر سپ سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے فارسی میں اَشْوَ۔ کو اسپ کہتے ہیں۔ اب اگر کمند کو مرکب مانتے ہیں تو اسپ کو بھی مرکب ماننا پڑے گا کیونکہ جو کام لاحقہ۔ ونت वत् وَنتس = वन्त्स

---

[1] سلسلہ کے لئے دیکھئے "زمانہ" بابتہ ماہ جون ۱۹۳۵ء

[2] وند کا ونت سے تعلق ضرور ہے لیکن مند سے اسے کوئی واسطہ نہیں جس کا اتحاد مت سے ہے۔ ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۲ صفحہ ۲ "زمانہ" جون ۱۹۳۵ء

[3] ملاحظہ ہو "زمانہ" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۳۔۱۴

دیتا ہے وہی ۔ و (व) بھی دیتا ہے یعنی دونوں فاعلیت کے معنی پیدا کرتے ہیں۔
عربی کی تقلید میں، قواعد فارسی اسم جامد کو معرفہ اور نکرہ دو قسموں میں تقسیم کرکے معرفہ کی چار قسمیں علم، ضمیر، اشارہ اور موصول بتاتی ہے۔ پھر علم کی بھی تقسیم کرتی ہے۔ قواعد سنسکرت اسم کی صرف تین ہی قسمیں مانتی ہے۔ اسم ذات جو کسی شے کو بتاتے ہیں۔ دروید واچک (द्रव्यवाचक) اسم فاعل جو کسی کام کے کرنے والے کے بتاتے ہیں کرتر واچک (कर्तृ वाचक) اور ضمیر سرونام (सर्वनाम)۔ عربی کی موشگافی سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ سنسکرت میں (مثلاً) کنیت کوئی چیز ہی نہیں۔ وہ بھی اس قسم کے اسم بناتی ہے۔ جیسے منو (मनु) سے مانو (मानव منو کی اولاد) جنھیں وہ پیترک पैतृक = ولدیت ظاہر کرنے والے) اسموں سے تعبیر کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جیسے عربی میں ابن ماجہ، ابن خلدون بنائے گئے ہیں اسی طرح وہ بھی پتر (पुत्र) یا ست (सुत) لفظ کے آخر میں لگاتی ہے جو بالکل ابن کا ترجمہ ہے جیسے برہم پتر (ब्रह्मपुत्र) برہما کا لڑکا۔ پون ست (पवनसुत) ہنومان جی۔ غرض یہ کہ سنسکرت نے بال کی کھال نہیں کھینچی ہے فارسی کا قواعد نویس اس سے تو کیوں بحث کرنے لگا تھا کہ اسم ذات وغیرہ کیونکر بنے۔ لیکن فارسی چلی اسی راستے پر ہے جس پر کہ سنسکرت چلی ہے، اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ فارسی کے اسم سنسکرت کے اسموں کی طرح مادّوں سے نکلے ہیں۔ ذیل میں چند لفظوں کا ماخذ دکھایا جاتا ہے۔
یہاں فارسی کا لغات تو لکھا ہی نہیں جا رہا کہ اس کے سارے اسموں کے ماخذ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور بتا بتا کر دعوے کو ثابت کیا جائے۔ چند اسموں کا تجزیہ و تحلیل کافی و وافی دلیل ہے۔

(۱)	لاحقہ	فارسی	سنسکرت	पद
	अ	پے ۔ پائے	पाद ، पद	पद = جانا ۔ چلنا
		بار	भार	भृ = اٹھانا
		گام	गाम	गम् = چلنا
		خرام	क्रम	क्रम् = چلنا
		خے ۔ خوے (پسینہ)	स्वेद	स्विद् = پسینہ نکلنا
		نوید	निवेदन	नि + विद् = اچھی طرح جتانا
		سوگ (وار)	शोक	शुच = افسوس کرنا
		شرم	श्रम	श्रम् = افسوس کرنا

	لاحقہ	فارسی	سنسکرت	مادہ
(۱)		روز	रोच(+मान)	रुच् = چمکنا
		دیو	देव	दिव् = چمکنا
(۲)	अक	بندہ	वन्दक	वन्द् = پوجا یا تعریف کرنا۔
			बन्धक	बन्ध् = باندھنا
		تابہ	तापक	तप् = تپنا
		کوبہ	... .	कृप् = کمزور ہونا
(۳)	अन	(گل +) ستان	स्थान	स्था = ٹھہرنا۔ کھڑا ہونا
	نون ماقبل مفتوح	(شمع +) دان	धान	धा = رکھنا
		گریبان	ग्रीवा(+अन)	गृ = نگلنا
(۴)	आक	باک		भी = ڈرنا (؟)
	الف کاف ماقبل مفتوح	پاک		पू = پاک کرنا (؟)
(۵)	त اور ति ت اور تِ	بخت	भक्तिः ، भक्त	भज् = بٹوارہ کرنا
		جُفت (جو ختی = زند)	युक्त	युज् = ملنا۔ جوڑنا
		سرشت	सृष्टि	सृज् = پیدا ہونا
(۶)	त्र تاے ساکن ورے مفتوح	چتر	छत्र	छद् = ڈھانکنا
(۷)	न (ن) جو مونث میں ना (نا) ہو جاتا ہے۔	تشنہ	तृष्णा	तृष् = پیاس لگنا
		ستون	स्थूणा	स्था = کھڑا ہونا
(۸)	म (م)	بیم	भीम	भी = ڈرنا
		چشم		चक्ष् = دیکھنا
		شام	श्याम	शी = سونا

ملہ چونکہ اس قسم کے لفظوں میں ہ دراصل ک کی بدل ہے اس لئے جب اس میں آن یا ی لگائی جاتی ہے تو ہ گ سے بدل جاتی ہے۔ بلکہ قدیم فارسی کی نسبت تو یہ کہنا چاہیئے کہ لفظ اپنی اصلی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کم حوصلگی۔ بدمعاملگی وغیرہ میں ہ کا گ سے بدلنا بالکل خلاف اصول ہے کیونکہ یہ عربی کے لفظ ہیں جن میں ہ دراصل عربی کی ۃ ہے مدوّر ہے جسے فارسی والے ہ پڑھتے ہیں۔ یہ کاف کی بدل نہیں ہے جو آن یا ی لگاتے وقت گ سے بدل دی جائے۔ مگر اس کے جواز کے لئے اہل زبان کا فتویٰ موجود ہے۔

	لاحقہ	فارسی	سنسکرت	مادہ
(۹)	(یا) ی نرکی (یا) یا مؤنث	سایہ	छाया = छ्या	छद् = ڈھانکنا
		مایہ	माया	मा = ناپنا
		دایہ	धाया	धा = پیدا کرنا۔ سہارا لگانا
		مے	मद्य	मद् = نشہ پینا۔ خوش ہونا
(۱۰)	व (و)	اسپ	अश्व	अश् = چلنا۔ جلد ہونا
(۱۱)	क (ک)	دخترک	(تحقیر) राजक	राजन् = راجہ
		مردک	(چھوٹا راجہ) (ایضاً) " अश्वक	अश्व = گھوڑا
		زلوک	(زیادہ) पुनक	पुन = لڑکا
(۱۲)	मि (م)	بوم	भूमि	भू = ہونا
		کرم (کیڑا)	कृमि	कृ =
(۱۳)	उ ساکن حرف آخر فقط پر ضمہ بڑھانا	تن (جسم)	तनु	तन् = باریک ہونا۔ تاننا
		دار (سُولی)	(لکڑی بجانا ملی) दारु	दृ = پھاڑنا
(۱۴)	तु (ت)	جادو	यातु	या = غائب ہوجانا
(۱۵)	तृ	پدر	पितृ	पा = بچانا
		مادر	मातृ	मा = بنانا۔ پیدا کرنا
		برادر	भ्रातृ	भृ = مدد کرنا۔ سہارا دینا

(۱۶) मत = मान = मन्त्स — فارسی میں صرف مَند کی صورت میں ملتا ہے۔ تنومَند۔ برومَند سے اسم فاعل ترکیبی میں بحث کی جاچکی ہے۔ قواعد نویس کا خیال ہے کہ ان میں واو زیادہ ہے لیکن یہ زیادہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ उ ہے جو तनु سے فارسی نے گرادیا تھا۔ مَند سے ترکیب کے وقت ظاہر ہوگیا۔

مذکورہ بالا صاف صاف بتاتے ہیں کہ فارسی کے اسم جامد کیونکر بنے۔

لہ یہ لاحقہ فارسی نے گرادیا ہے۔

آ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

(از حضرت نجم الدین شکیب)

آ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے اپنی زندگی میں اک خلا پاتا ہوں میں
یاد کرتا ہوں تجھے جب اور جہاں جاتا ہوں میں
اِن بھری آبادیوں میں آہ تنہا سا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

مجھ کو اِک دنیا سمجھتی ہے کہ میں دلشاد ہوں
خوش بھی ہوں، بیفکر بھی ہوں، اور میں آباد ہوں
اِس طلسمِ رنگ و بو کی قید سے آزاد ہوں
اپنی اس بے کیف آزادی سے گھبراتا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

چاندنی راتوں میں دریا کے کنارے کی بہار
جنگلوں میں سبزہ و گل کی جوانی کا نکھار
اور سناٹے میں دل ہارے پپیہے کی پکار
دیکھتا ہوں اور دل کو تھام رہ جاتا ہوں میں
آ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

حسن کی نیرنگیاں ہیں، مے بھی ہے، مینا بھی ہے
نوجوانی بھی ہے، ساون بھی ہے اور جھولا بھی ہے
زندگی کی ہار اسے عشق کا سودا بھی ہے
آہ سب کچھ ہے مگر پھر اِک کمی پاتا ہوں میں
آ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

گلستاں میں شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا
چھیڑتی ہے میٹھے میٹھے نغمہ ہائے جاں فزا
پتے پتے پر ہے طاری ایک عالم وجد کا
میں بھی سنتا ہوں مگر سنتے ہی کھو جاتا ہوں میں
آہ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

پھونکے دیتی ہیں مرے دل کو مجھے چنگاریاں
بہ رہی ہیں آنکھ سے خونِ جگر کی ندیاں
کون ہے تو اے مرے محبوب ا رہتا ہے کہاں
تجھکو ان دیکھی فضا میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں
آہ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

جذباتِ میر

(از حضرت میر ولی اللہ صاحب)

آئے گی متاعِ دل و ایماں میرے کام آج
کہتے ہیں کہ لاتا ہے کوئی اُن کا پیام آج

تھا طورِ نگہ وادیِ حیرت سے بہت دور
آتی ہے نظر ساری مسافت دو سہ گام آج

بے باک نظر کے لئے بیتاب ہیں جلوے
ہے دیدۂ بینا کے لئے دعوتِ عام آج

وہ آئینگے میں خوش ہوں زمیں خوش ہے زماں خوش
کس ہاتھ میں ہے خانۂ دنیا کا نظام آج

روشن ہے ہر اک زاویۂ عالمِ تکویں
کس درجہ ضیا ریز ہے کیفیتِ جام آج

تھی صبح مری شامِ غریباں سے سیہ تر
ہے مشرقِ انوارِ تجلّی مری شام آج

خود پیشکشِ گرمیِ نظارہ نہوں گا
بیکار نہ جائے گا مرا پختہ و خام آج

ڈرتا ہوں ہنر دشمنیِ دورِ فلک سے
اُس تک نہ پہونچ جائے کہیں میرا کلام آج

اسرارِ ازل کھل ہی گئے میر بالآخر
وہ پھیر تو دیتے مجھے بے نیل و مرام آج

بقا

(از مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب بی اے۔ ایل ایل بی)

شیخ بقاء اللہ نام اور بقا تخلص تھا، حافظ لطف اللہ خوشنویس کے فرزندِ ارجمند تھے وطن اکبرآباد تھا لیکن دلّی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، بعد ازاں لکھنؤ میں توطن اختیار کیا فنِ شعر سے حظ کافی رکھتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے اور غمگین تخلص تھا۔ اردو میں شعر کہنے کے شوق نے شاہ حاتم کی خدمت میں پہونچا دیا۔ اور شاہ صاحب ہی نے بقا تخلص عنایت فرمایا۔ شاہ حاتم نے اپنے شاگردوں کی فہرست میں آپ کا نام بھی درج کیا ہے۔ لیکن فتح علی شاہ نے اپنے تذکرہ میں خود ان کی زبانی خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شاگرد لکھا ہے، ممکن ہے دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہو۔ بقا کی زندگی بہت بے لطف گزری۔ افلاس سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے تھے لیکن سودائی ہوگئے۔ جب ہر طرف سے مایوسی نے آگھیرا تو سنہ ۱۲۰۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے، رستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نہ نکلنے دیا۔ مصحفی نے آپ کو "جوانِ سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع وش طبع رخش بطرف ہجو نیز مائل اُفتادہ" لکھا ہے۔ اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ میں یہ رقم فرمایا ہے کہ "رخش شوخ طبعی و ظریف نہادی می پوید، بہ ہجو ہر کس بے محابا مبادرت می جوید۔ با سر آمدِ شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا وسخن سنج بے نظیر محمد تقی میر طرف شدہ تخطیہ نمودہ بہ ہجو ایشاں پرداختہ، سزائے کردارِ ناہنجار ایں عزیزاں برا ہمی درکنار نہادہ زبان زد خاص و عام ساختہ کہ مرزا بہ ہجو ہر کس بے ہیچ خیلے دلیر بودہ واز دستِ میر با ایں ہمہ قابلیت عنانِ جوہر قابل شناسی کبر و خود سریش در ربودہ ....."

آپ کا مختصر کلام ہماری نظر سے گذرا، جا بجا مضمون آفرینی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ مصحفی نے ان الفاظ کے ساتھ آپ کے کلام کی داد دی ہے۔ "در شاہجہان آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا رفیع معرکہ گیری ہا دقتِ طبع خود را ظاہر نمود۔" مجموعۂ نغز میں یہ الفاظ درج ہیں "اگرچہ گرد مضامین قدما میگردد امّا بغایت درست فکر، خوشگو، شیریں گفتار، معانی جواست" لہٰذا ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ آپ کا کلام ضرور اس قابل ہے کہ آپ کو دوسرے درجہ کے شعراء میں جگہ دی جائے جو شخص

میر اور سودا جیسے شاعرانِ پختہ کار سے نبرد آزما ہو سکے اور اپنی قابلیت و شاعری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھائے اُس کے عمدہ شاعر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ پھر جو کلام موجود ہے اُس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شگفتہ گو اور رنگین طبع شاعر تھے۔ چنانچہ نواب شیفتہ گلشنِ بیخار میں رقم طراز ہیں" در مراتبِ نظم طبعے شگفتہ و رنگیں و طرزے بامزہ و شیریں داشتہ"
بقا کا شعر ہے:۔

سیلاب سے آنکھوں کے بہتے ہیں خرابے میں   ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا توارد ہوا:۔

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں   سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اس پر بقا نے بگڑ کر یہ قطعہ کہا:۔

میر نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا   اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے   اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

ایک اور موقع پر کہا ہے:۔

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر   اور بستی نہیں یہ دلی ہے

میر و مرزا دونوں کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں:۔

میر و مرزا کی شعر خوانی نے   بس کہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے   اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن   ایک تُو تُو کہے ہے اِک ہی ہی

یعنی ایک ہجو کہتا ہے اور ایک خرنیہ اشعار کہتا ہے۔ ایک اور قطعہ کہا ہے:۔

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم مُلّا   فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجوؤں کی رسیاں سے   دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پُورا

میر تقی میر کی نسبت فرماتے ہیں:۔

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر   اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھرئیے   ہر گلی کوچے "کام شاعر کا"

بقا کے کلام میں تشبیہات بھی خوب ہیں، فرماتے ہیں:۔

خالِ لب آفتِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا   دام دانے میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خواہش سود تھی سودے میں محبت کے ولے — سر بسر اس میں زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں — جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے
یہ رخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے — ہے نہاں صبحِ وطن شامِ غریباں کے تلے

بعض اشعار میں مبالغہ بھی پایا جاتا ہے، مثلاً:۔

اتنا ہوا ضعیف کہ میرے مزار پر — جو برگِ گل پڑا ہے سو چھاتی کا سِل بنا

آج کل چھاتی کی سِل کہتے ہیں۔ بعض قطعات بھی خوب ہیں، مثلاً:۔

گر قتل کیا بقا کو خوباں — تو بات یہ منہ سے مت نکالو
پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق — جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

(دیگر)

شب فرقت میں یار کی ہر چند — در پئے نالہ و فغاں ہیں ہم
نالۂ بے اثر یہ کہتا ہے — مرغِ گم کردہ آشیاں ہیں ہم

الغرض آپ کا کلام ایک کشش رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ گلِ رعنا، مجموعۂ نغز اور انتخاب حسرت موہانی میں مجموعۂ مشکل سے سو شعر ہماری نظر سے گزرے۔ اگر دیوان دیکھنے کا موقع مل جاتا تو ہم اپنی رائے اس سے کہیں بہتر ظاہر کرتے۔ بہر حال ذیل میں منتخب اشعار حوالۂ ذیل ہیں:۔

ہم نفس کوئی نہ دیکھا بیکسی کے دن بقا — آشنا صورت مگر معنی میں وہ بیگانہ تھا
دستِ ناصح جو مرے جیب کو اس بار لگا — پھاڑوں ایسا کہ پھر اس میں نہ رہے تار لگا
پہنچی اس بت کو خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا
مرضِ عشق تمھارا تو یہ طوفاں ہے کہ میں — جس سے مذکور کیا اس کو یہ آزار لگا
جس کا ملاح بنا عشق وہ کشتی ڈوبی — اس کے کھیوے سے تو بیڑا نہ کوئی پار لگا
مرغِ زیرک تھے تہِ دام نہ آئے ہرگز — اڑ گئے ہم سرِ صیاد یہ منقار لگا
قضا نے حال گل جب صفحۂ تقدیر پہ لکھا — مری دیوانگی کا ماجرا زنجیر پہ لکھا
کعبہ تو سنگ و خشت سے اے شیخ مل بنا — کچھ سنگ بچ رہا تھا سو عاشق کا دل بنا
ان آنکھوں کا نت گریہ دستور تھا — دو آبہ جہاں میں یہ مشہور تھا
میں تو آیا تھا بقا باغ میں سن جوشِ بہار — پہ یہ ہنگامِ خزاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
اس کف میں دیکھ ساغرِ نازک شراب کا — دریا میں سرنگوں ہے پیالہ حباب کا

غم میں اُس زلف و رُخ کے ہم ہیہات — رات کو دن کرے ہیں دن کو رات

لاؤں جو شکوۂ شبِ ہجراں سخن کے بیچ — جوں شمع پھر زباں نہ سماوے دہن کے بیچ

اب جنوں یُمنِ قدم سے ترے اِک آن کے بیچ — پڑ گئی آگ مرے دست و گریبان کے بیچ

کھٹ گئی چشم میں عجب سے کمرِ یار کی طرح — رگِ گل دل میں کھٹکتی ہے مرے خار کی طرح

گر دوس پہ گیا دَور میں اُس لب کے مسیحا — یعنی کہ اب اُس کا نہ رہا کام زمیں پر

رکھتا ہے یوں وہ زلفِ سیہ فام دوش پر — صیّاد جس طرح سے رکھے دام دوش پر

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں — اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ساقی کو دو تو یہ بہار آئی باغ میں — سودے نے پھر کیا ہے خلل سا دماغ میں

اے عشق تو ہر چند مرا دشمنِ جاں ہو — مرنے کا نہیں نام کا اپنے میں بقا ہوں

تجھ سے سیہ چشم سے امیدِ وفا جو رکھیں — چاہیئے اشک سے پہلے ہی وہ منہ دھو رکھیں

بلبل سے کہا گل نے کر ترک ملاقاتیں — غنچے نے گرہ باندھیں جو گل نے کہیں باتیں

آہیں افلاک میں رل جاتی ہیں — محنتیں خاک میں رل جاتی ہیں

عشق نے منصب لکھی جس دن مری تقدیر میں — داغ کی نقدی ملی صحرا ملا جاگیر میں

یہ گل اندام جو صرفے سے ٹک اک ناز کریں — کام لیں زلف سے کاکل کو بس انداز کریں

بیوفائی کا تو کیا ذکر ہے یا غیرِ وفا — پر تعجب نہیں گر تم کو گماں یہ بھی ہو

راہ تکتا ہے مرا لختِ جگر آنکھوں کی — گر وہ چل نکلے تو پیچھے سے رواں یہ بھی ہو

مجھ سے کب تک اِس دلِ صد چاک کا پیوند ہو — اب یہ دیوانہ الٰہی خاک کا پیوند ہو

نہ دے زخمِ دل پہ ناوک پہ حکم بخیۂ مژگاں کو — کرے کب سوزنِ عیسیٰ رفو گل کے گریباں کو

نہ ہووے حلق تر بیمار کا تیرے دمِ آخر — چھڑاوے خضر بھی گر منہ میں اُسکے آبِ حیواں کو

تو نے اِس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو — کہ موئے پر بھی کسی تے نہ اُٹھایا ہم کو

رشکِ گلشن ہے ترے عکس سے یار آئینہ — تو یہ سمجھے ہے کہ ہے باغِ بہار آئینہ

پیوند ہوا رُخ سے ایسا خطِ جانانہ — تھا بارِ چمن گویا یہ سبزۂ بیگانہ

کیوں ہم جلوں کی راکھ دباتے ہو ہاتھ سے — آ جائے گا کوئی شررِ انگشت کے تلے

روتا ہے کیوں طبیب، مگر آج اپنی نبض — دیتی ہے مرگ کی خبر انگشت کے تلے

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جو مل کے مرکب ہم اُٹھائے — اُدھر تو نالہ کا تاشہ کھڑکا اِدھر فغاں نے علم اُٹھائے

سب جلیسوں کے بزم میں اب گئی وہ آپس کی ہم نشینی　　ہم آن بیٹھے تو اٹھ گیا وہ، وہ آن بیٹھا تو ہم اٹھ آئے
تہی کف آئے تھے ہم عدم سے چلے بھی یاں سے تو دست خالی　　نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا نہ ساتھ یاں سے ہم اٹھائے
بقا جو راہی ہوئے عدم کے تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا　　یہ راہ ہستی کی پرخطر ہے چلو یہاں سے قدم اٹھائے

جس کو کہتے ہیں مسافر جرسِ محمل ہے　　محنتِ راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستیِ وہمی کی نمود　　صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے
آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی　　یہ یقیں جانیو اُس کو کہ مرا قاتل ہے
کیا کریں سینہ جو ناصح سے چھپاتے نہ پھریں　　داغ سے داغ ہیں کچھ اپنے گریباں کے تلے

ہاں میاں تم کو ہے تمھاری تو بلا ہی جانے　　جو گزرتی ہے مرے دل پہ خدا ہی جانے
دل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف　　کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے
تیرے بیمار کو کب ہووے شفا جس کے طبیب　　نہ تو کچھ درد کو پہچانے نہ دوا ہی جانے
دل سے نکلے کہیں پابوسیِ قاتل کی ہوس　　کاش وہ خوں کو مرے رنگِ حنا ہی جانے
پوچھ اِس دل سے جو ہے کاٹ تری ابرو کا　　جوہرِ برشِ شمشیر سپاہی جانے

تھے ہم استادہ ترے در پہ ولے بیٹھ گئے　　تو نے چاہا تھا کہ ٹالے، نہ ٹلے، بیٹھ گئے
غیر بد وضع ہیں محفل سے شتاب اُن کی اٹھو　　پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے
ناتواں ہم ہوئے اتنے کہ تری محفل تک　　در سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے
گھر سے نکلا نہ تو اور منتظروں نے تیرے　　در پہ نالے کئے اتنے کہ گلے بیٹھ گئے
اشک اور آہ کی شدت نہ مٹی گرچہ بقا　　گھر کے گھر اس میں ہزاروں کے جلے بیٹھ گئے

اگر مشفق و مہرباں ہے تو تو ہے　　بلائے دل، آشوبِ جاں ہے تو تو ہے
فلک پر چڑھا مجھ کو اے نشۂ مے　　کہ اس بام کی نردباں ہے تو تو ہے
جدا مت ہو لے داغ چھاتی سے میری　　گئے دل کا اب اک نشاں ہے تو تو ہے

یاد میں تڑپے ہے یہ کس ابروئے خمدار کی　　آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی

اگر بزیرِ مژگاں یوں دل کا لخت دم لے　　جوں آن کر مسافر زیرِ درخت دم لے

چھوڑ کر آنسو کو لختِ دل گیا ہمراہ آہ　　ناؤ خشکی میں چلی آبِ رواں بیکار ہے

قسم معصومِ دشتِ کربلا کی یہ وہ دورہ ہے　　بقا گر مانگیے پانی تو گزرے تیر گردن سے

عشق میں بو ہے کبریائی کی　　عاشقی جس نے کی خدائی کی

ہمسری مت صبا سے کرلے آہ! تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی؟
ہوتا ہے شیشۂ دل چور اُس کی گفتگو سے یارب یہ پند ناصح یا سنگ محتسب ہے
دل سے وہ نگاہ پیر گزری پر شکر کہ جی کی خیر گزری
گریہ سے بعد مرگ یہ طوفان آب ہے گنبد مرے مزار کا مثل حباب ہے
نرخ اُس کا صفائی ترے تلوے کی نہ پاوے خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے
ماہ نو انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

رُباعی

آوارۂ وادیٔ طلب کو افلاک ہر گاہ کریں جور و تعدی سے ہلاک
پیوند زمیں کرکے بھی آرام نہ دیں پھر شیشۂ ساعت میں بھریں اُسکی خاک

دَورِ سیاست

(از حضرت احسان دانش کاندھلوی)

اے خوشا وقتیکہ روحوں میں حرارت آگئی لیکے پیغام عمل بادِ سیاست آگئی
اہلِ نخوت میں سوا نیزے پہ اُترا آفتاب سر پہ ہر ناپاک باطن کے قیامت آگئی
ہر عقیدے کی رگوں میں گرم ہے خونِ جہاد مضمحل ایماں کے چہرے پر بشاشت آگئی
نرم کرنیں مشرقِ ملت میں ہیں تنویر زن رات کے تاریک ماتھے پر صباحت آگئی
میان میں سوتی ہوئی تیغوں نے لی انگڑائیاں برچھیوں سے کھیلتی روحِ شجاعت آگئی
اب ملے گا ہر کس و ناکس کو اک درسِ شعور پیرہن پہنے صحافت کا صداقت آگئی
صاحبِ زر لرزہ براندام ہیں، مزدور شاد اہلِ شر محسوس کرتے ہیں کہ شامت آگئی
اُٹھ رہی ہیں جلدی جلدی تیرگی کی چلمنیں پرچم زریں لیے صبحِ بغاوت آگئی
موت نے سمجھا دیا ہے زیرکوں کو رازِ زیست
تلخیوں میں زندگانی کی حلاوت آگئی

پنڈت جواہر لال سے خطاب

(از جناب سروش لائلپوری)

اے انتخابِ روزگار، اے جانِ نہرو خانداں
اے ناخدائے آرزو، اے نازشِ ہندوستاں

اے پیکرِ ایثار، خورشیدِ سپہرِ زندگی
اے مرکزِ حبِّ وطن، شیدائے جہدِ جاوداں

اے رہبرِ راہِ صفا، شمعِ شبستانِ وفا
اے نغمہ سنجِ حریت، دردآشنائے بیکساں

اے بندۂ حق آشنا، دانائے اسرارِ خودی
اے روحِ پیکارِ عمل، اخلاق آموزِ جہاں

اے خسروِ اقلیمِ دل، پیغمبرِ جمہوریت
اے مردِ میدانِ سیاست مصلحِ عظمت نشاں

اہلِ وطن کو غفلتوں کے خواب سے چونکائے جا
درماندہ حالوں کو کئے جا ارتقا کا راز داں

افسردہ روحوں تک پیامِ زندگی پہنچائے جا
سحرِ جمود و مرگ کا یکسر مٹائے جا نشاں

خونِ رگِ ملت کو سوزِ قلب سے کھولائے جا
پیمانۂ جوشِ عمل چھلکائے جا ہر ایک آں

پھر ہند کو مہر و مروّت کا سبق سکھلائے جا
رنج و کدورت کا اڑائے جا ہر اک دل سے نشاں

احساسِ ذلت سے دلِ ہندوستاں برمائے جا
طوقِ غلامی کو بنائے جا وبالِ دوشِ جاں

ہر عقدۂ دشوارِ قومِ ناتواں سلجھائے جا
عزم و تدبر کی دکھائے جا کرشمہ کاریاں

بھارت میں ایمان و یقیں کی روشنی پھیلائے جا
کفر و جہالت کی کئے جا دور سب تاریکیاں

تہذیبِ مغرب کی حقیقت سے نقاب اٹھائے جا
شیرازۂ باطل کئے جا منتشر ہر ایک آں

جورِ حکومت سے کبھی ہرگز ملال آگیں نہ ہو
فصلِ بہار آتی ہے گلشن میں پسِ دورِ خزاں

ظلم و تعصب کا شجر دنیا میں پھل سکتا نہیں
کاغذ کی ناؤ ہوتی ہے بس کوئی دم کی میہماں

حق و صداقت کے لئے ہی فتحِ کامل وقف ہے
لائے گی رنگ آخر تری سعیِ مسلسل بیگماں

عرشِ معلےٰ سے "سروش" اک دن یہ مژدہ لائیگا
"اے نہرو عالی گہر آزاد ہے ہندوستاں"

پھر ہند میں نورِ مسرت چار سُو لہرائے گا
فردوس کے چہرے پہ بھی آبِ ندامت آئے گا

ہماری تعلیم

اُس کا ماضی اور مستقبل

(از مسٹر پرشوتم لال چودھری، ایم۔ اے)

زمانۂ ماضی کی شمع سے مستقبل کا چراغ روشن ہوتا ہے، تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ہمارا ماضی شاندار تھا، حال خستہ ہے، مستقبل بھی ماضی کی طرح شاندار ہو۔ اِس وقت ہمارے ملک کے ہر فرد بشر کی یہی دلی خواہش ہے۔ ہمارے رہبرِ اعظم مہاتما گاندھی کی تعلیمی اسکیم مُلک کے سامنے ہے، ماہران و مُدبّران اس پر کافی غور کر رہے ہیں، چند صوبوں میں عملی طور پر بھی اس اسکیم کی آزمائش کی جارہی ہے۔ تاہم اب تک اہل الرائے اصحاب کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو اس اسکیم کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایسے اصحاب کو چاہیئے کہ ہندوستان کے گذشتہ زمانہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں پھر مہاتما جی کی اسکیم کی اہمیت یقیناً اُن کے ذہن نشین ہو جائیگی۔

سب سے پہلے اُس زمانہ پر نظر ڈالئے جب ہندوستان میں ہندوؤں کا دور دورہ تھا۔ اُس زمانہ کو ہم تین حصّوں میں منقسم کر سکتے ہیں، ویدک زمانہ، بدھ مذہب کے عروج کا زمانہ، اور آخری ہندو راجاؤں کا عہد، جس میں بنگال کے سین و پال خاندان کے حکمران اور راجہ ہرش وردھن شامل ہیں۔ ویدک زمانہ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت بہترین تھی۔ چاروں وید، برہمن، سوتر اُپنشد، ارنیکا وغیرہ اسی زمانے کی مشہور تصانیف ہیں۔ کانٹ اور افلاطون جیسے مشہور عالم فلاسفروں کی تصانیف انھیں کتابوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ویدوں اور اُپنشدوں کی فلاسفی اس قدر گہری ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بُدھ مذہب کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کی تعلیم نے اور بہت سے میدانوں میں قدم بڑھایا۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں سولہ فنون رائج تھے، علم طب، فن مصوری و سنگ تراشی کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دی جایا کرتی تھی۔ حیوانات کے لئے ہسپتال کھلے ہوئے تھے۔ ڈرامہ، نظم، افسانہ وغیرہ میں بڑے بڑے نامور عالم یہاں موجود تھے۔ کالیداس کا نام کبھی نظر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔ آریہ بھٹ و براہ میہر نے علم ریاضی کو جو فروغ دیا اس کا ذکر تاریخ میں ہمیشہ امر رہیگا۔

فنِ تعمیر و علم موسیقی کے شائقین سمندر گپت اور ہرش وردھن جیسے مہاراجہ ہوئے قنوج۔ بنارس اور پشاور اس زمانے کے بڑے مشہور تعلیمی مرکز تھے۔ اسی عہد میں شنکر اچاریہ اور بھوبھوتی جیسے عالم پیدا ہوئے۔ بہار میں نالندہ یونیورسٹی کی شہرت دور دراز مقامات تک پھیلی ہوئی تھی۔ راجہ دھرمپال نے وکرم شیل نامی یونیورسٹی قائم کی تھی، جس میں ایک سو ساٹھ مندر اور چھ کالج تھے۔ سین خاندان کے راجاؤں نے بنگال میں نودیپ نامی یونیورسٹی قائم کی تھی۔ اسی زمانہ میں ویدانت سوتر، بھگوت گیتا، اور الجبرا و جیومیٹری پر پنڈت بھاسکر کی تصانیف شائع ہوئیں۔ غرض ہندو راجاؤں کا زمانہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

تعلیم کو جو ترقی اس زمانے میں ہوئی اس کے بعد کبھی نہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے کھلے ہوئے میدانوں اور جنگلوں میں اسکول لگا کرتے تھے۔ ضرورت پر یا موسم کے لحاظ سے اسکول کسی سایہ یا سائبان کے نیچے بھی لگائے جاتے تھے۔ اُستاد کی امداد کے لئے بڑے لڑکے چھوٹے لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی رواج کی تقلید میں مسٹر اینڈریو بیل نے انگلینڈ میں مانیٹو ریل سسٹم جاری کیا ہر ایک طالب علم کے لئے عملی فنون کا سیکھنا لازمی تھا۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم خاص و عام کے لئے نہیں تھی وہ صرف اُن طلباء کے لئے مخصوص تھی جو قابلیت کے لحاظ سے اوروں پر ترجیح دیئے جانے کے مستحق تھے۔ ان کو مختلف مضامین کے ماہران کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اکثر بیس اکیس ماہرانِ تعلیم ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے۔ ان کی مجلس کو پریشد کہتے تھے، جس کا تمام خرچ راجہ و دیگر فیاض طبع متمول اصحاب برداشت کیا کرتے تھے۔ تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ لڑکوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا بھی معقول انتظام تھا۔ تمام مصارف مُلک کے امراء و رؤساء برداشت کیا کرتے تھے۔ طلباء کو حصولِ تعلیم کے لئے بارہ سے اڑتالیس برس تک اپنے گرو کے پاس رہنا پڑتا تھا، اُن کی زندگی پاک اور بلند بنائی جاتی تھی، عطر و تیل کے استعمال، تاش وغیرہ کے کھیل، مستورات کی صحبت، منشیات و مسالہ جات وغیرہ دنیوی لذات سے اُن کو پرہیز کرنا پڑتا تھا۔ صبح و شام ہون و سندھیا کے موقع پر اُن کی حاضری لازمی تھی۔ تعلیمی فضا کو پراگندہ کرنے والے طلباء کو رسّی یا بانس کے ڈنڈوں سے جسمانی سزا بھی دی جاتی تھی۔ جگہ جگہ تعلیمی مرکز قائم تھے۔ تعلیم محض دماغی ہی نہیں بلکہ اخلاقی اور عملی بھی ہوا کرتی تھی۔ نوجوانوں کی تربیت میں مذہبی، جسمانی اور اخلاقی تعلیم کا حصہ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ طالب علم کو صرف دماغی نشو نما ہی حاصل نہ ہو بلکہ اُن کی قوت ارادی بھی مضبوط ہو۔ مختصراً یہ کہ طالب علم کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنا پچھلے زمانہ کی

تعلیم کا ایک خاص مقصد تھا۔ وتسائن رشی نے اپنے کام سوتر میں چونسٹھ کلاؤں کا ذکر کیا ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام طور پر جاری تھیں۔ اُن میں سے خفیہ زبان کی خط و کتابت، پہیلیوں کا حل، پھولوں کے زیورات اور نقلی پھول بنانا اور ایسے ہی بہت سے فنون کے نام درج ہیں۔

۱۲۰۰ء سے ۱۶۶۴ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کا دور دورہ رہا۔ ان بادشاہوں کا سلوک اس بارے میں تسلی بخش نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ تمام تعلیمی مرکز نیست و نابود ہو گئے۔ جہالت کی تاریکی چاروں طرف چھا گئی۔ مگر اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ہمارے یہاں ودیا پتی، پنڈت داس۔ میرا بائی جیسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سترھویں صدی میں اورنگزیب نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے تمام ہندو علماء و ماہرانِ فنون کو اپنے دربار سے خارج کر دیا۔ اس حکم نے ہندوستان میں تعلیم کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔

اہل برطانیہ کی آمد سے ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۱۳ء تک تو کسی انگریز حکمراں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ مسیحی پادری البتہ اپنا وعظ انگریزی زبان میں دیا کرتے تھے۔ جب اُن کو اس کام میں دقت محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے انگریزی زبان سے واقف نہ تھے۔ اور پادریوں کے لئے یہاں کی زبانوں کا سیکھنا امر محال تھا۔ تو پادری ولیم کیرے اور اُن کے رفقاء نے ۱۸۱۳ء میں کمپنی کو برطانوی سرکار کی مدد سے ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ کیا۔ ۱۸۳۵ء میں راجہ رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر کی کوششوں سے انگریزی تعلیم جاری کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کی زیر نگرانی ہندو کالج کھولا گیا۔ مگر اس سے قبل ہی الگزینڈر ڈف وغیرہ اصحاب کی کوششوں سے بنگال و مدراس و بمبئی میں عیسائی مشن کی طرف سے کالج قائم ہو چکے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ مکالے پبلک تعلیمی کمیٹی (جو ۱۸۳۳ء کے پاس شدہ انڈیا ایکٹ کی رو سے قائم کی گئی تھی) کے پہلے صدر ہو کر ہندوستان آئے۔ انھوں نے اس پر جو مشہور نوٹ لکھا ہے وہ ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے انھوں نے برٹش گورنمنٹ کا یہ مقصد قرار دیا کہ ہندوستان میں مغربی علم و ادب و سائینس کی ترقی و تکمیل کے لئے جس قدر بھی روپیہ مہیا ہو سکے اُس کا بہترین استعمال صرف انگریزی تعلیم ہی پر کیا جائے۔ اس نوٹ کے بعد ہندوستان میں تعلیم کے متعلق حکومت برطانیہ کا نقطۂ نگاہ تبدیل ہو گیا۔ اور تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار دی گئی، عدالتی زبان بھی انگریزی مقرر ہوئی۔ سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی کی واقفیت لازمی کر دی گئی، اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ بہت سے ہائی اسکول و کالج کھولے گئے مگر ابتدائی

تعلیم کو نظرانداز کیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ اونچی تعلیم کی اشاعت سے ابتدائی تعلیم میں خود بخود ترقی ہوگی۔
۱۸۵۴ء میں اس پالیسی میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ چارلس ووڈ نے اپنے ایک نوٹ میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ پرائمری اسکولوں کی تعداد بڑھائی جائے اور ایک محکمہ قائم کیا جائے جس کے ذریعہ اسکولوں کو مالی امداد دی جائے۔ ملک میں یونیورسٹیاں بھی قائم کی گئیں۔ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن کی حکومت نے مسٹر ووڈ کے مذکورہ بالا نوٹ کو عملی جامہ پہنایا۔ اعلیٰ تعلیم ملک کے دولتمند لوگوں کے ذمہ کردی گئی۔ البتہ گورنمنٹ نے کچھ مالی امداد دینے کا وعدہ کیا اور ابتدائی تعلیم کو فروغ دیا گیا۔
۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی اور دو سال بعد ایک یونیورسٹی ایکٹ پاس کیا۔ اس کی رو سے یونیورسٹی سینٹ کے اسّی فیصدی ممبران سرکار نامزد کرتی تھی ہر منظور شدہ سکول و کالج کو طلباء سے مقررہ فیس لینا پڑتی تھی، رعایتی طلباء بہت کم ہوتے تھے، اور اُن کی انتہائی تعداد مقرر کردی گئی تھی۔ یونیورسٹی کا چانسلر گورنر مقرر کیا گیا۔ جو اسکول و کالج ان دفعات کی پابندی نہ کرتے تھے اُن کے طلباء امتحانات میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اُسی سال مسز بیسنٹ نے یہ شکایت کی کہ اس ایکٹ کے ماتحت مدراس یونیورسٹی نے نوّے فیصدی طلباء کو میٹرکیولیشن کے امتحان میں اور بہتّر فیصدی طلباء کو انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک ہونے سے روک دیا۔ اس قانون سے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ لارڈ کرزن کی حکومت پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ اور یہ خیال مضبوط ہوگیا کہ حکومت برطانیہ انگریزی تعلیم کو اس لئے ترقی نہیں دینا چاہتی کہ اس کی بدولت ہندوستان کے باشندوں کو اپنی گری ہوئی حالت کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۱۱ء میں مسٹر گوپال کرشن گوکھلے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں لازمی پرائمری تعلیم کا بل پیش کیا، مگر گورنمنٹ نے مضحکہ انگیز وجوہات کی بنا پر اُس کو نامنظور کردیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسٹر وی جے پٹیل نے بھی اسی قسم کا ایک مسودۂ قانون بمبئی کونسل میں پیش کیا جس کے ذریعہ وہ صوبے کی مشہور میونسپلٹیوں کو جبریہ ابتدائی تعلیم جاری کرنے کا اختیار دینا چاہتے تھے۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا۔
جنگ عظیم کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کے عرصہ میں حکومت کے کچھ صوبوں نے اپنے ماتحت میونسپلٹیوں کو ابتدائی تعلیم جاری کرنے کا اختیار دیا۔ یہ محکمہ صوبہ کے ایک وزیر کی زیرنگرانی کام کرتا تھا مگر اس مد میں خرچ کے لئے جو روپیہ دیا جاتا ہے وہ محکمہ آبکاری کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیم کی ترقی ہو تو منشیات کا استعمال بھی عام ہو۔ اس کے بعد تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ہارٹوگ کمیٹی اور بہت سے کمیشن قائم کئے گئے۔ مگر ان سب کے باوجود حکومت برطانیہ کی تعلیمی پالیسی میں

کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

امسال سات صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے برسر اقتدار ہو جانے کے بعد مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ پھر ملک کی توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کی ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ مہاتما جی نے ملک کو جو مشورہ دیا ہے وہ نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اس اسکیم کا بنیادی اصول وہی ہے جو ہندوؤں کے زمانہ میں رائج تھا یعنی تعلیم مفت اور لازمی ہو اور اس کا بار والدین پر نہ پڑے۔ دستکاری کی تعلیم حاصل کرکے طلبار خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس اسکیم کی تفصیلات طے کرنا ڈاکٹر حسین کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کمیٹی نے اس اسکیم کی مکمل خانہ پری کرکے اُس کو کم خرچ اور بالانشین بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی تفصیلات پر غور کرتے وقت طلبار کی جسمانی و مذہبی تعلیم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ دستکاری کی تعلیم سے جسمانی تعلیم کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ساتھ ہی مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہندوستان میں بے شمار مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی طلبار کو کچھ ایسے عام مذہبی اصول کی تعلیم دیا جانا ضروری ہے جو انھیں رواداری و شرافت کا سبق سکھائیں۔ مہاتما جی کی اسکیم کا وہ حصہ سب سے زیادہ ناموزوں سمجھا جاتا ہے جس میں اُنھوں نے اعلیٰ تعلیم کا دارومدار امرا و رؤسا کی فیاضی پر رکھا ہے۔ اس مسئلہ پر ماہران تعلیم میں سخت اختلاف رائے ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ زمانہ میں جس قدر ضرورت ابتدائی تعلیم کی ہے اُتنی اعلیٰ تعلیم کی نہیں۔ اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا فروغ ملک کے امیر و متمول اصحاب کے ذمہ کر دیا جائے۔ مگر حسب ضرورت گورنمنٹ کی طرف سے بھی معقول مالی امداد دی جائے۔ اُستادوں کی موجودہ تنخواہوں میں مزید کمی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اس بات پر بھی اختلاف رائے ہے۔ تاہم اگر تعلیم کا پُرانا طریقہ ہی رائج کرنا ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ استادوں کی خاص خاص خانگی ضروریات کا بار خود برداشت کرے جس سے وہ پیٹ کے دھندے سے نجات پاکر قومی تعلیم کے تعمیری کام میں بے فکری اور سرگرمی سے حصہ لے سکیں۔ تعلیم نسواں کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سوال لڑکوں کی تعلیم سے بھی زیادہ اہم ہے۔ لیکن یہ بات ماننا پڑے گی کہ ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم انگریزی لڑکیوں کی تعلیم سے قطعی جداگانہ ہونا چاہیئے۔ انھیں سب باتوں کا خیال رکھکر اگر اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مقبول عام نہ ہو، اور ملک کا ہر فرد بشر اس نیک کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش نہ کرے۔ بہر کیف وہ دن مبارک ہوگا جب ملک جنگ آزادی کے زمانہ میں اس اسکیم کی اہمیت کا اندازہ کرکے اپنے مستقبل کے چراغ کو گجرات کی اس شمع سے دوبارہ روشن کرنے کی کوشش

صبحِ انتظار

(از منشی گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری بی اے ایل ایل بی وکیل)

سمٹ چکا ہے اندھیرا سارا سیاہیِ شب بدل رہی ہے — اُفق پہ سونا برس رہا ہے فلک پہ چاندی پگھل رہی ہے

نسیم آتی ہے مست و بیخود فضا سے اٹکھیلیاں سی کرتی — ہر ایک گل کو ہنساتی جاتی، ہر ایک غنچے کا روپ بھرتی

سپیدیِ صبح نے ہر اک شے کو نقرئی سا بنا دیا ہے — خزانہ فطرت کے پاس جتنا تھا گویا سارا لٹا دیا ہے

فلک پہ وہ سبز پتیوں میں کسی کا جلوہ مچل رہا ہے — اُفق پہ مشرق کی سمت گردوں تمام سونا اُگل رہا ہے

سنہری کرنوں نے زرد پھولوں کے حسن کو جگمگا دیا ہے — بساطِ خاکی کے ذرّے ذرّے کو مہرِ تاباں بنا دیا ہے

اُچک رہی ہیں پھدک رہے ہیں پرندے سب چہچہا رہے ہیں — خوشی میں پھولے ہیں اپنی ہستی کی مستی میں اور گا رہے ہیں

تمام عالم چمک رہا ہے چمک رہا ہے دمک رہا ہے — مگر مرے دل میں شعلۂ غم بھڑک رہا تھا بھڑک رہا ہے

تمام عالم پہ نور چھایا، تمام عالم میں نور برسا — مری نظر میں جو تم نہیں ہو تو مجھکو ہر سمت ہے اندھیرا

بہار میں بھی جو مجھکو فرحت جنوں نہیں ہے، تو کچھ نہیں ہے
جو تم نہیں ہو سکوں نہیں ہے، سکوں نہیں ہے، تو کچھ نہیں ہے

قطعہ

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعر نشاط آور و پُر سوز و طربناک

میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

اقبال

زمینداری کی قدامت

(از بابو راج بہادر صاحب لمگوڑہ، ایم۔ اے، ایل ایل بی)

صوبۂ متحدہ کے سرکاری وزیر جناب رفیع احمد قدوائی صاحب کو بھی جو لگان و مالگذاری کے محکموں کے انچارج اور خود ایک زمیندار پیشہ خاندان کے رکن ہیں، زمینداری کی تاریخی قدامت کے بارہ میں بہت کچھ شک و شبہہ ہے۔ سطور ذیل میں ہم کوشش کریں گے کہ ویدوں کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک زمینداری کے متعلق تاریخی حالات ناظرین زمانہ کے روبرو پیش کریں تاکہ کم سے کم یہ دھوکا نہ رہے کہ زمینداری کا طریقہ صرف انگریزی راج کی اُپج ہے۔

ویدوں میں دیہی انتظامات کے متعلق "مکھیہ" کا لفظ بار بار ملتا ہے۔ اُس وقت کی کوئی تاریخی کتاب مجھے نہیں ملی مگر اس لفظ نے آپ ہی سارا بھید کھول دیا۔ اب بھی "نمبردار" کا لفظ جو فارسی زبان کے نام بردار سے بگڑ کر بنا ہوا لفظ ہے، قریب قریب وہی معنی ظاہر کرتا ہے۔ کسانوں میں بھی "مقدم" (مکھیہ) چننے کا رواج بہت سے مقاموں پر اسلامی زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ خود "مکھیا" لفظ بھی "مکھیہ" ہی کا بدلا ہوا روپ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اب اُس کا استعمال صرف فوجداری انتظامات کے تعلق سے باقی رہ گیا ہے۔ پھر بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ اب بھی جہاں تک ہوسکتا ہے وہ مکھیا گانؤں کے رہنے والے زمینداروں ہی میں سے خود اُنھیں کے ہاتھوں چُنا جاتا ہے جیسا کہ قانون فوجداری کے قاعدوں سے ظاہر ہے۔ مجھے تو نمبردار، مقدم اور مکھیا یہ تینوں اُسی ویدوں والے مکھیہ لفظ کے حصے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

واقعی تاریخ تو ہمیں براہمن نامی مقدس کتب (ویدوں کی تفسیر و تشریح) کے زمانہ سے ملتی ہے جیسے میں پروفیسر رام دیو (گورو کل کانگڑی) کی تاریخ کی بنا پر آج عوام کے روبرو پیش کر رہا ہوں یاد رہے کہ یہ تاریخ کسی زمیندار کی لکھی ہوئی نہیں، بلکہ ایک ایسے غیر جانبدار شخص کی لکھی ہوئی ہے جس کی بے لوثی اور حبّ وطن میں کسی کو شبہہ نہیں ہوسکتا۔ موصوف اپنی "بھارت ورش کا اتھاس" نامی کتاب کی جلد اصفحہ ۱۱ (تیسرا ایڈیشن) پر تحریر فرماتے ہیں کہ کسانوں کو اپنی پیداوار کا چھٹا یا دسواں

حصہ دینا پڑتا تھا۔ پھر صفحہ ۱۶۵ و صفحہ ۱۶۷ پر اُنھوں نے دیہات اور شہروں کے سنگٹھن کی بڑی ہی دلچسپ صراحت کی ہے۔ لکھا ہے کہ اُس زمانہ کے گانوں اور شہر بہت منظم معلوم ہوتے ہیں۔ شہروں میں زیادہ تر حکمران اور تجارتی طبقہ کے لوگ راجاؤں کے قلعوں کی پناہ میں رہتے تھے اور کسان طبقہ کی بود و باش دیہاتوں میں تھی۔ چونکہ "براہمن گرنتھ" سماجی قاعدوں کی کتابیں نہیں بلکہ ویدوں کی تفسیریں ہیں، پس موضوع بہت واضح نہیں ہے مگر سمرتیوں میں تو بہت صاف ذکر ہے

منو سمرتی کے ساتویں ادھیائے میں بہت ہی صاف بیان ہے۔ وہاں راجہ کو کسان کے اُپج کا چھٹا، آٹھواں اور بارھواں حصہ لینے کا حق دیا گیا ہے۔ اور زمیندار کے لئے بہت صاف طور پر "گرام آدھی پت" (گانوں کا مالک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ درختوں، شہد، گھی، خوشبو کی چیزیں، دوائیں، رس، جڑ، پھل، پتے، ساگ، تِن، چمڑا، بانس، بید کا بنا ہوا سامان، مٹی کے برتن اور پتھر کی اشیاء کی بکری سے جو منافع ہو اُس کا چھٹا حصہ وصول کر لینے کا اختیار ہے۔ ندی کی اُترائی لینے کا بھی ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کم ہوتی تھی اور جنگلات کے محکمے زیادہ تھے۔ اس لئے اس فہرست میں اُن سارے محاصل کا ذکر ہے جو آج بھی سائر وغیرہ کے نام سے لئے جاتے ہیں۔ اِسی سمرتی میں اول اوّل زمیندارانہ حقوق میں کاشت کے لئے بلا لگانی زمین کے ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ کیا ہم اسے سیر کا ابتدائی زمانہ نہیں کہہ سکتے؟

مہابھارت اور بدھ زمانوں کے درمیانی وقفہ میں پہونچکر تو یہ بات بہت ہی صاف ہو جاتی ہے۔ ہمارے لائق مورخ نے شکرنیتی نامی کتاب کی بنا پر اپنی تاریخ جلد دوم کے صفحہ ۱۹۵۔ صفحہ ۱۹۶ پر بہت صاف لکھا ہے کہ اراضی کے محاصل کی شرح اراضی کی پیداوار کے مطابق مختلف ہونی چاہیئے۔ شکرنیتی کے اقتباسات بھی فٹ نوٹ کی شکل میں دیدیئے گئے ہیں، اور لکھا ہے کہ "اُن زمینوں پر جو تالاب، نہر، کنواں، بر کھا، یا ندی سے سینچی جاتی ہیں، اُن کی اُپج کے مطابق آدھا، تہائی یا چوتھائی محصول لگانا چاہیئے۔ جو زمین اوسر یا بنجر ہو اُس کی اُپج کا چھٹا حصہ ہی لینا چاہیئے"

"اراضی کا یہ محصول ہر کاشتکار سے الگ الگ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ گانوں بھر کی زمین کا محصول ایک ہی دولتمند شخص سے وصول کر لیا جاتا تھا۔ محاصل کی ساری ذمہ داری اُسی شخص پر ہوتی تھی اور کسان لوگ اُسی کو اپنے اپنے لگان کا حصہ دیدیا کرتے تھے" پھر قابل مورخ نے شکرنیتی کا ترجمہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "محاصل کے طے ہو جانے پر اُسے پورا کا پورا گانوں کے ایک دھنی آدمی سے لے لینا چاہیئے یا گانوں کے کسی ایک آدمی کو ضامن بناکر اُس سے ایک مقررہ مدت کے بعد لگان لیتے

رہنا چاہیئے"۔ شکرنیتی میں زمیندار کے لئے "دھنک" (دولتمند) کا لفظ مستعمل ہوا ہے، اور باتیں منوسمرتی ہی کے وقت کی معلوم ہوتی ہیں۔

لگان وصول کرنے والے تنخواہ دار ملازم الگ تھے جن کی تنخواہ کے متعلق شکرنیتی میں لکھا ہے کہ اُن کا مشاہرہ وصول کئے ہوئے لگان کا $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{8}$، $\frac{1}{10}$، $\frac{1}{12}$ یا $\frac{1}{16}$ ہوتا تھا۔ شری پرکاش صاحب ٹھیک لکھتے ہیں کہ زمینداری اور چیز ہے اور مشاہرہ والی تحصیلداری یا کلکٹری اور چیز۔ ہمیں تو شکرنیتی اور آج کے زمانہ میں فرق یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب تنخواہیں بڑی بڑی اور نقد روپے میں ہیں کسی بھی زراعتی ملک میں زیادہ نقد تنخواہوں کا ہونا اُس کے لئے بہت سے دُکھوں کا سبب بنتا ہے، کیونکہ ہمارے ملک میں تو سدا ہی پیسہ کی کمی رہتی ہے۔ تاریخ مذکور کے صفحہ ٢ پر شکرنیتی کا ترجمہ یوں دیا ہوا ہے :-

"سرکار کو کسانوں کی آمدنی دیکھکر ہی اُن پر لگان لگانا چاہیئے"۔

"راجہ کو زمینداروں سے لگان اس طرح لینا چاہیئے جیسے مالی پیڑوں سے پھول توڑتا ہے تاکہ زمینداروں کا ناش نہ ہو، لگان کوئلے کے بیوپاریوں کی طرح نہ لینا چاہیئے"۔

اب مورخ اپنے الفاظ میں یوں لکھتا ہے :-

"کوئلے کے بیوپاری کوئلہ بنانے کے لئے لکڑی کو جلا کر اُس کا ناش کر دیتے ہیں، مگر مالی ہمیشہ پھولوں کو اس طرح چنتا ہے کہ اُس سے درخت کو کسی طرح نقصان نہ پہونچے۔ لگان جمع کرنے کی یہ تشبیہ اس قدر عمدہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اسے اپنی آئین اکبری میں درج کیا"۔ بقول شکراچاریہ جی اُس وقت رعیت واری نہیں بلکہ زمینداری کے رواج کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ زمیندار خود کسان ہیں۔ وہ جتنی زمین پر کاشت کرتے ہیں اُس پر اُن کا آزادانہ حق ہے"۔

مغل حکومت کے زمانہ سے آج تک کے تاریخی حالات اتنے مشہور ہیں کہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے مکان میں خود اُس وقت کے شاہی پروانے موجود ہیں جن میں "مالگذار" اور "تعلقہ" کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ کیا مذکورہ بالا صراحت سے یہ واضح نہیں ہو گیا کہ زمینداری سسٹم کسی نہ کسی صورت میں بہت قدیم ہے اور جب سے یہ رواج ہے اُسی وقت سے زمینداروں کو سیر کرنے کا حق ہے؟

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

علامہ اقبال کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت سپرو خاندان کے رکن تھے، مگر دو تین سو سال ہوئے وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

آپ کا خاندان خوشحال، فقیر دوست اور تصوف پسند تھا، اور یہ تمام باتیں آپ کو ورثہ میں ملی تھیں۔

آپ ۱۸۷۵ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں پہلے مکتب میں بیٹھے پھر مدرسہ میں داخل ہوئے اور پانچویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ اسی طرح مڈل اور انٹرنس کے امتحانات بھی وظیفہ کیساتھ پاس کر کے، اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو کر ایف۔ اے پاس کیا۔ بعدہٗ گورنمنٹ کالج سے فلسفہ و حکمت، انگریزی و عربی میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ جس کے صلہ میں دو طلائی تمغے انعام اور وظیفہ بھی ملا۔ عربی و فارسی کی تکمیل آپ نے شمس العلماء مولوی سید میر حسن مرحوم سے کی تھی، اور چونکہ فلسفہ و حکمت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے پروفیسر آرنلڈ کے زیر ہدایت اس کی بھی تکمیل کرتے رہے۔ اور ایم۔ اے کی ڈگری بھی امتیاز خاص کے ساتھ لی اور اُسکے صلہ میں بھی آپ کو تمغہ ملا۔ جس کے بعد آپ اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ و اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ و انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے، اسی زمانہ میں آپ نے ایک کتاب "علم الاقتصاد"[1] کے نام سے اردو میں تصنیف فرمائی۔

یوروپ کا سفر | چونکہ تحقیق و مطالعہ کتب کا شوق آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس لئے آپکی طبیعت ہمیشہ مزید قابلیت حاصل کرنے کے لئے بیقرار رہتی تھی۔ چنانچہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر مزید تکمیل تعلیم کے ارادہ سے آپ ۱۹۰۵ء میں انگلستان تشریف لے گئے، اور تین سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر فلسفہ و اخلاق کا مزید مطالعہ کر کے فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے بعد آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ جہاں "فلسفۂ ایران" پر ایک تحقیقی مضمون لکھ کر میونخ یونیورسٹی سے "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی فرسٹ کلاس ڈگری لی۔ یہ مضمون فصیح و بلیغ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اور لندن میں شائع

[1] اس پر زمانہ میں ایک مفصل تنقید شائع ہوئی تھی۔

ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔
جرمنی سے لندن واپس آکر وہاں کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی دوران میں آپ نے لندن میں "مذہب اسلام" پر چھ لکچر دئے جو بہت مقبول ہوئے۔ انھیں دنوں میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر آپ چھ ماہ کیلئے لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کے قائمقام پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ جس کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں آپ انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ آپ نے دوران قیام یورپ میں اسپین و فرانس کی بھی سیر و سیاحت کی، اور واپسی پر لاہور میں باقاعدہ بیرسٹری کرنے لگے۔
آپ کو سیاسی میدان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ آپ کا مذاق عالمانہ اور فلسفیانہ واقع ہوا تھا۔ تاہم احباب آپ کو مجبور کر کے ۱۹۲۶ء میں پالٹیکس کے میدان میں کھینچ لائے۔ اور پنجاب کونسل کے انتخابات میں بہ حیثیت امیدوار کھڑا کیا۔ اسمیں آپ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ چونکہ آپکو مزدوروں اور کاشتکاروں سے ہمیشہ سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ کونسل میں ان طبقوں کی ہر دم حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بانیاں مذاہب اور بزرگان دین پر نامناسب حملوں کے خلاف پنجاب میں ریگولیشن نافذ کرایا، جو ابتک قائم ہے۔ تلوار کو قانون اسلحہ سے مستثنیٰ کرانے اور انسداد شراب نوشی کے لئے آپ نے کوشش کی اور ایک تقریر میں وصولی مالگذاری کے سلسلہ میں جو زیادتیاں ہوتی ہیں اُن پر روشنی ڈالی۔
دسمبر ۱۹۲۸ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو چند لکچر دینے کے لئے میسور مدعو کیا۔ جہاں آپ کا ہندو مسلم انجمنوں نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے اور علیحضرت حضور نظام سے شرف نیاز حاصل کیا۔ ۱۹۳۶ء میں آئین جدید کے ماتحت انتخابات ہوئے تو آپ بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست بھوپال نے آپ کے لئے تاحین حیات پانسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ جس سے آپ یک گونہ فکر معاش سے آزاد ہو گئے۔ اس اثنار میں آپ نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس اور بعض دیگر اسلامی جلسوں کی صدارت کی۔
شاعری اقبال کی شاعری کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں جب آپ لاہور آئے تو نقاد سوسائٹی کی بدولت طبع رسا پر مزید صیقل ہوئی۔ اور آپ کی شاعری کا شہرہ طلبار کے حلقہ سے نکل کر عوام تک پہونچا۔ آپ نے کچھ دنوں مرزا داغ سے اصلاح لی۔ بعدہٗ آپ کو کسی سے

مشورہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن نکتہ چینوں کے اعتراضات پر آپ ہمیشہ توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا حسرت کے اُردوئے معلیٰ میں جو سلسلہ مضامین آپ کے متعلق شائع ہوا۔ اُس سے آپ نے بخوبی فائدہ اُٹھایا

بہر حال اقبال کی شاعری کو پانچ دور میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک رہا۔ جب آپ کی اکثر نظمیں شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہیں اس دور کی سب نظمیں حب وطن میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور آپ انھیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلی نظم جو آپ نے ۱۸۹۹ء میں انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی نالۂ یتیم تھی۔ "ہندوستان ہمارا" "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" نامی نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور میں اقبال خالص ہندوستانی تھے۔ "ہندوستان ہمارا" پر آپ نے اپنی نظم کا صحیح و مستند ایڈیشن رسالہ زمانہ کو اشاعت کے لئے عنایت فرمایا تھا۔ چنانچہ دفتر زمانہ میں آپکے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ابھی تک محفوظ ہے اور اس پرچہ میں ہدیہ ناظرین ہے

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۳ء تک رہا۔ جب وہ قومی شاعر کے بجائے اسلامی شاعر بنگئے۔ "وطنیت" کو "بت" سمجھنے لگے۔ انھیں دنوں کا شعر ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ‏ جو پیرہن اس کا ہے' وہ مذہب کا کفن ہے

بہر حال اقبال کا نظریہ اب یہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کو وطن سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ سارا جہاں ان کا وطن ہے۔ خضر راہ، شمع و شاعر اور طلوع اسلام وغیرہ اسی دور کی نظمیں ہیں۔ اسرارِ خودی، رموز بیخودی اور پیام مشرق میں اسی دور کا کلام ہے۔

چوتھا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک رہا۔ جب اُنھوں نے اردو شاعری سے کنارہ کش ہوکر اس کو بالائے طاق رکھدیا۔ زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر، اسی زمانہ کی یادگار فارسی مثنویاں ہیں۔

پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء یعنی تادم آخر رہا۔ اس دور میں اقبال کی طبیعت پھر اردو نوازی کی طرف مائل ہوئی۔ چنانچہ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم نامی مجموعہ کلام اسی زمانے میں شائع ہوئے۔

اقبال کے ابتدائی کلام میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ صحیح معنی میں ایک ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان اُن کی نظروں میں جنت نشان ہے۔ انھیں ہندوستان کتنا پیارا اور دلآویز نظر آتی ہے۔ حُبِ وطن میں سرشار ہوکر وہ کس والہانہ خلوص کیساتھ کہتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ‏ ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ بوستاں ہمارا

اقبال کا یہ ترانۂ وطن آج تک ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اسی طرح وطن کے غم میں گھل کر ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جب ہندوستان کے شمال میں قدرت کی تعمیر کردہ سدِ سکندری یعنی کوہستان ہمالیہ کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ مترنم ہوتے ہیں ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اقبال کے اکثر کلام میں حکیم قاآنی جیسا وجد اور ترنم اور الفاظ میں آبِ رواں کی سی روانی ہے مثلاً وہ بہار کا خیر مقدم کس رنگین پیرایہ میں کرتے ہیں ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار ۔ طوطی و دُرّاج و سار ۔ برطرفِ جوئبار ۔ کشتِ گل و لالہ زار ۔ چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

ستاروں کا جو گیت لکھا ہے، اُس کے الفاظ کی روانی میں کسقدر کیف آور ترنم ہے ؎

ہستیِ ما نظامِ ما مستیِ ما خرامِ ما گردشِ بے مقامِ ما زندگیِ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما، می نگریم و می رویم
بیشِ تو نزدِ ما کمے سالِ تو نزدِ ما دمے اے بکنار تو یمے ساختۂ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے، می نگریم و می رویم

اللہ اللہ! اوپر کے بند کے اس ٹکڑے میں "اے بکنار تو یمے ساختۂ بہ شبنمے" انسان کو خود شناسی اور جدوجہد کا کسقدر زبردست سبق دیا گیا ہے۔

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اقبال زراعت پیشہ لوگوں اور مزدوروں کے بیحد ہمدرد تھے۔ دراصل وہ موجودہ نظامِ اقتصادیات میں ایک انقلابِ عظیم کے حامی تھے۔ آجکل جبکہ کانپور میں مالکان کارخانجات اور مزدوروں کے درمیان زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ اقبال کے مندرجہ ذیل

نعرۂ انقلاب خاص قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

من درون شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام　　　آنچناں زہرے کہ از وے ماربا در پیچ و تاب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

ایک جگہ مزدوروں کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر اس طرح نادر حکم سناتے ہیں ؎

اُٹھو! مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو　　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　　جس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

آجکل ہندوستان میں جیسے دیکھئے تقلیدِ مغرب کی رَو میں بہا چلا جاتا ہے۔لیکن اقبالؔ مرحوم جو مغربی تہذیب و تمدن کا غور سے مطالعہ فرما چکے تھے، اس کے سخت مخالف ہیں۔ اور اہلِ مغرب کی مادہ پرستی سے سخت بیزار ہیں۔ چنانچہ طنزیہ لہجہ میں فرماتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

ایک جگہ مغربی تہذیب سے بیزار ہوکر اس طرح آہنگِ فریاد بلند کرتے ہیں ؎

فریاد ز افرنگ و دلاویزیٔ افرنگ　　　فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ　　　معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

ہندوستان کے چار شاعر اپنی خصوصیات کے لئے مشہور ہیں۔ امیر خسروؔ کے الفاظ کی روانی، بیساختگی اور ترنم، میر تقی میرؔ کا سوز و گداز، خواجہ میر دردؔ کا تصوف اور مرزا غالبؔ کا فلسفہ و حکمت۔ لیکن قدرت نے ان چاروں کی خصوصیات کو جس شخص واحد کی طبیعت میں سمو دیا ہے، وہ سر محمد اقبالؔ ہیں۔ روانی و ترنم کے نمونے تو ہم اوپر نذر کرچکے ہیں۔ سوز و گداز کی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے　　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تیت کے لئے دِل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ___ یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب ___ کیا لطف انجمن کا جب دِل ہی بجھ گیا ہو

اقبال کا کلام تصوف میں بھی بے نظیر ہے۔ خصوصاً جہاں وہ "ما عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کی تشریح کرتے ہیں تو پڑھنے والے میں ایک شانِ خودی، خود داری پیدا ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش ___ زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ___ ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بھگوت گیتا میں اسی بات کی تلقین ہے کہ انسان کے افعال و اعمال صلہ کے خیال سے بے نیاز ہونے چاہئیں، یعنی کام کئے جاؤ چاہے معاوضہ ملے یا نہ ملے۔ لیکن دُنیا کی کیفیت یہ ہے کہ جو پوجا پاٹ کی جاتی ہے وہ مکتی کے شوق میں اور جو سجدہ ہوتا ہے وہ حور و قصور کے خیال میں، اسی بات پر بگڑ کر اقبال فرماتے ہیں ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ___ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اقبال کے مجموعۂ کلام سے اسی قسم کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

فلسفہ و حکمت میں اقبال مولانا رومؒ کے مقلد ہیں۔ اور ان کا فلسفہ جد و جہد اور سعی و عمل کا پیغام ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چمکائے اور اپنی خودی کو فروغ دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو خدائی پر قابض ہو سکتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ___ خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

دیکھئے سُست کار اور غافل انسان کو کس طرح درسِ عمل دیتے ہیں ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا ___ دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کانپتا ہے دِل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ___ ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا ___ مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں ___ تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خود داری چمن سے توڑ کر تجھ کو ___ کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا ___ جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ خاموشی کہاں تک، لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

اقبال کو ریاکار و مکار مذہبی رہنماؤں سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ریاکار پیرانِ طریقت کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ حریص لیڈروں کی بابت فرماتے ہیں ؎

جن کو سالار میسر ہوں شکم کے بندے — یہی قوموں کی ترقی کی حقیقت معلوم
ہر گھڑی رنگ بدلتا ہو نیا جن کا ضمیر — حُریت کا بھی سمجھ سکتے ہیں کیا وہ مفہوم؟

مکار صوفیوں اور سیہ کار پیروں پر بھی خوب لے دے کی ہے، فرماتے ہیں ؎

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے — قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابتدا میں اقبال پُرخلوص وطن پرست شاعر تھے مگر ۱۹۱۰ء کی جنگِ بلقان کے بعد اُن کی طبیعت نے یک لخت پلٹا کھایا۔ اور وہ وطنیت سے نفور ہو کر عالمگیر اسلامی اخوت کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں وہ پہلے ہندوستان کو سب سے اچھا سمجھتے تھے۔ اب بیساختہ کہنے لگے کہ ؎

نہ ہیں عجمی و ہندی، نہ عراقی و حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

آخرکار اقبال کو وطنیت سے اس درجہ بیزاری ہو گئی کہ وہ یہ شعر کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نوحۂ اقبال

از اختر بریلوی

آہ دُنیا سے اُٹھ گیا اقبال / شاعرِ باکمال و با اقبال
خوش بیاں، خوش نصیب، خوش قسمت / نیک خو، نیک طبع، نیک خصال
نکتہ رس، نکتہ سنج، نکتہ شناس / آدمی صورت و فرشتہ مثال
دُور بیں، زیرک و فہیم و ذکی / آئینہ دارِ حال و استقبال
حق رس و حق شناس و حق آگاہ / باہنر، باخبر، بلند اقبال
فہم و ادراک و فطنت و دانش / اس ہمہ داں کے تھے یہ راس المال
تھا جہاندیدہ و مآل اندیش / دولتِ علم و فن سے مالا مال
مغربی فلسفہ سے تھا آگاہ / مشرقی نکتوں سے بھی واقف حال
نازشِ دودمانِ نیک دلاں / فخرِ اوتاد و صوفی و ابدال
آشنائے رموزِ درویشاں / واقفِ جادۂ حرام و حلال
اُسکی شہرت سے گونجتا تھا جہاں / مشرق و مغرب و جنوب و شمال
تھا وجیہہ و شکیل و کوہ وقار / صاحبِ رعب و داب و جاہ و جلال
جسمِ خاکی میں اُس کے تھی شاید / طاقتِ بوترابؓ و روحِ بلالؓ
تھی طبیعت میں اس کی ہمواری / صفتِ خاص اُس کی استقلال
خضرِ ملت تھا ناخدائے وطن / قوم کے حق میں تھا وہ گویا ڈھال
خاص عنصر تھے اُس کے جود و سخا / تھا نہ کوتاہ اُس کا دستِ نوال
اُس کے افعال نیک و صالح تھے / قابلِ رشک اُس کے تھے اعمال
نقش ہیں دِل پہ اہلِ دانش کے / اُس کے پند و نصائح و اقوال
ایشیا اُس پہ رشک کرتی ہے / اُس کی معدوم ہے جہاں میں مثال
شاعری اُس پہ ختم ہے واللہ / کچھ نہیں اس میں جائے قیل و قال

شاعرِ اعظم ایشیا کا تھا ہند ہی میں گڑی ہے اُس کی نال
اُس کے دم سے فروغِ اُردو تھا اُس کے اُٹھنے سے آگیا ہے زوال
اُس سے دعویٰ کرے تقابل کا نہ ہوئی آج تک کسی کی مجال
خوب ہوتا تھا اُس کا استنباط اور اُس سے بھی بڑھ کے استدلال
عارضِ تابناکِ اُردو پر تھا وہ بیشِ نظر چمکتا خال
شاعری میں نہ پاؤ گے اُس کی رنجِ شامِ فراق و عیشِ وصال
تھا خیال اُس کا ارفع و اعلےٰ بال کی وہ نکالتا تھا کھال
اُس پہ بس شاعری کا کیا کہنا ہیچ تھے اُس کے آگے رستم و زال
سُن کے اُس کا کلام آتا ہے وجد صوفی کو محتسب کو حال
ہجر ہے اُس کے غمگساروں کی ہوگئیں روتے روتے آنکھیں لال
رہ گیا شاہبازِ سدرہ نشیں[1] اُس کے دم توڑنے سے بے پروبال
خاک کو بھی نہ اُس کی پہونچیں گے ایڑیاں لاکھ رگڑیں گر نقال
اُٹھ گیا اُس کا سایہ دُنیا سے ہے عنقا ہے آج اُس کی مثال
سب ہیں غمگین اُس کے مرنے سے صاحب جاہ اور اہلِ کمال
سوگ میں اُس کے ہیں کہیں مہین اُسکے ماتم میں ہیں اناث و رجال
میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا روح نے اُسکی جھاڑے جب پروبال
حوریں غرفوں سے تاکتی تھیں اُسے اور کہتی تھیں سب تعالیٰ تعال
بات کل کی یہ ہے کہ تھا ہر سُو رونق افروز و ہر اُس کا جمال
آج عالم ہے اُس کے ماتم میں کل کی باتیں ہوئیں ہیں خواب و خیال
کس طرح وہ جیئے گا اُس کے بعد زندگی جس کی ہوگئی ہو وبال

نازشِ بزمِ ایشیا نہ رہا
لُٹ گیا شاعری کا بیت المال

---

[1] اُردو۔ [2] آ۔

اقبال

حضرت طالب چکوالی بی۔ اے، ایل ٹی

اے کہ تو نے وا کئے عالم پہ اسرارِ حیات
اے کہ تو نے کر دیا شاداب گلزارِ حیات

اے کہ تو نے آسماں کے راز ہم سے کہہ دئے
بزمِ انجم، کر دیا تو نے ہی بازارِ حیات

نغمۂ "ہندوستاں" نکلا تھا تیرے ساز سے
اہلِ گلشن نے سبق سیکھا تری آواز سے

آہ کیا جادو تھا جو تجھ پر کیا احباب نے
اے مفکر! ہم کو بھی آگاہ کر اس راز سے

اے کہ تیری حریت نوائی ہے "حصارِ دیں" میں تنگ
طبعِ رنگیں ہے طلبگارِ نگارِ شوخ و شنگ

اے کہ عالم کو تجھے دینا تھا پیغامِ عمل
تنگ نظری کے گوارا کر لئے کیوں رنگ ڈھنگ

اُس پہ بھی تو ہند کا تھا شاعرِ جادو نوا
اب نہ سن پائینگے محفل میں تری رنگیں صدا

جا رہے ہیں کیسے کیسے عندلیب اس باغ سے
برق صورت اس کا اب اقبال بھی جاتا رہا

علامہ سر اقبال

ڈاکٹر اقبالؔ وہ روحِ سخن
اِس جہاں سے ناگہاں جاتا رہا

بن گئی بزمِ سخن ماتم کدہ
شاعرِ معجز بیاں جاتا رہا

ہو رہی ہے آج اُردو سوگوار
شاید اُس کا پاسباں جاتا رہا

کس قدر حیران ہیں اہلِ سخن
آج اُن کا ہم زباں جاتا رہا

گلستانِ ہند ہے سنسان آج
بلبلِ ہندوستاں جاتا رہا

معرفت کہتی ہے آج اسلام کا
نکتہ دان و رازداں جاتا رہا

آج ہیں سب مضطرب جس کیلئے
وہ خدا جانے کہاں جاتا رہا

ذرہ ذرہ محوِ ماتم ہے کہ "حیف
شاعرِ جادو بیاں جاتا رہا"
۱۳۵۷ھ

حفیظ الرحمٰن امین پنجابی

تنقید کتب

مسلمانوں کا روشن مستقبل[1]

عرصہ سے مسلمانوں پر افسردگی اور مایوسی کا دور طاری ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے مگر اس کتاب کے مصنف نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی مایوسی کا دور اب ختم ہو رہا ہے اور اُن کا اچھا زمانہ آرہا ہے۔ اسی کے لئے مصنف نے بالعموم اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں کی گذشتہ تین صدیوں کی اقتصادی اور تمدنی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ لکھی ہے۔ اسمیں ایک بڑی اجدّت یہ ہے کہ دس بنیادی حقوق قائم کرکے اُنکی تفصیل کی گئی ہے اور تین سو سال کے تین دور کرکے ہر دور کی جانچ ان دس حقوق کے معیار سے کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کو ہر زمانہ کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ اسمیں بالعموم اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کس حد تک محفوظ رہے اور کہانتک تلف ہوئے۔ یہ حقوق باعتبار اہمیت حسب ذیل ہیں:۔

روٹی کا مسئلہ، حفاظت جان و مال، عدل و انصاف، مذہبی حفاظت، تہذیب و زبان، تعلیم، حقوق ملازمت، یکساں شہری حقوق و مساوات، حقوق ملکیت یعنی آزادی، سیاسیات۔

ان حقوق کی بنا پر اول مسلمانوں کی سلطنت کے آخر زمانہ کی جانچ کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اس وقت اہلِ ہند کی مالی حالت کسقدر عمدہ تھی، ملکی حفاظت میں ان کا کسقدر حصہ تھا۔ بغیر کسی خرچ اور بلا امتیاز قوم و ملت کے عدالتوں میں انصاف ہوتا تھا۔ جملہ اقوام کے مذاہب اور انکی تہذیب و زبان کی حفاظت تھی۔ تعلیم عامہ کے حصول کے کسقدر مواقع تھے۔ سب کو یکساں طور پر ملازمت اور شہری حقوق حاصل تھے۔ اور رعایا کو ملکی امور میں کہانتک دخل تھا۔ دوسرا دور ایسٹ انڈیا کمپنی کی صد سالہ حکومت کا قرار دیا گیا ہے، جسمیں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان سے کسقدر زرکشی کی گئی۔ یہاں کی صنعت و حرفت برباد کرکے ملک کو تباہ کیا گیا۔ ہندوستانیوں کو تمام بڑے عہدوں سے خارج کیا گیا۔ قدیم طریقہ کی تعلیم عامہ کو ختم کرکے اُسکی جگہ نام نہاد علوم جدیدہ کی تعلیم جاری کی گئی۔ جسکی غرض مذہب عیسوی کی اشاعت تھی یا ہندوستان میں غلامانہ ذہنیت

---

[1] مصنفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب سالق ایم۔ ایل سی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۲۵ صفحات، اچھی طباعت، خوبصورت جلد۔ قیمت فی جلد عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس، بدایوں

پیدا کرنی تھی۔ اِس سلسلہ میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کی عمدہ تاریخ دی گئی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ سلطنت جانیکے بعد سے بالعموم اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے بالخصوص مسلمان بالکل بجھ گئے تھے مگر اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ باوجود مختلف حالات کے ۱۸۵۷ء تک علماء کرام وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کی مذہبی اور تمدنی اصلاح کرتے رہے۔ دینی مدارس قائم کرکے وسیع پیمانہ پر اشاعتِ علوم اور مذہبی تبلیغ میں مصروف رہتے تھے۔ نیز مذہبی حفاظت کے لئے منظم طور پر جانبازیاں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان بے جان یا مردہ ہو گئے تھے۔ مجاہدین کے یہ حالات پڑھ کر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ بالآخر ۱۸۷۰ء سے وہ وقت شروع ہوا جبکہ حکومت نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی بدلی اور اُن کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور سرسید احمد خان صاحب نے مسلمانوں کی تمدنی، مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی عظیم الشان تحریک شروع کی۔ اس وقت سرسیّد نے جدید تعلیم اور ملازمت میں مسلمانوں کی پسماندگی دیکھکر اُن کی حالت پر مرثیہ خوانی شروع کی جو ایک عارضی علاج تھا۔ مگر مصنف کے نزدیک اُسے مستقل طور پر اختیار کر لینے سے مسلمان اپنے کو دیگر اقوام ہند سے ہر اعتبار سے کمزور سمجھنے لگے اور ان پر روز بروز زیادہ افسردگی چھاتی گئی۔

سرسیّد کی تحریک کے تینوں شعبہ جات یعنی اصلاح تمدن، مذہب اور تعلیم کے تاریخی حالات نہایت جامع مگر مختصر طور پر دئے گئے ہیں، جن کے پڑھنے سے تحریک سرسیّد کے بارہ میں پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں علیگڈھ کالج قائم ہونیکے وقت سے لیکر یونیورسٹی بننے تک کے مفصل حالات درج ہیں۔

تمام مندرجہ بالا حالات اول پانچ ابواب میں دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد باقی ماندہ پانچ ابواب سیاسیات کے لئے مخصوص ہیں۔ جنمیں سب سے اول ہندوستان میں سیاسی احساس پیدا ہونے کی تاریخ ہے۔ پھر سرسید احمد خاں کے سیاسی کاناموں کے سلسلہ میں اُن کی تصنیف 'اسباب بغاوت ہند' سے دکھایا گیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صد سالہ عہد میں اہلِ ہند کے بنیادی حقوق کس حد تک پامال ہوئے تھے۔ جسکی وجہ سے اُنھوں نے مجبور ہو کر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا کیا۔

اس کے بعد اس پچیس سالہ دَور کے مفصل حالات دئے گئے ہیں جسمیں کہ علیگڈھ کے تین انگریز پرنسپلوں نے مسلمانوں کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے خاص سانچہ میں ڈھالا۔ مسلمانوں کو حکومت اور برادرانِ وطن سے ڈرا ڈرا کر انھیں بزدل بنایا۔ اور اُن میں غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ دراصل اس باب کو صحیح طور پر کتاب کا قلب کہا جاسکتا ہے جس کا مطالعہ ہر ہندی مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

مسلم لیگ کو قائم ہوئے چار پانچ سال ہو چکے تھے جبکہ سنہ ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ سے نکلی اور مسلمانوں کی سیاست کا اچھا زمانہ شروع ہوا۔ تب سے مسلمانوں کا قدم میدانِ سیاست میں روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مسلم لیگ کے علاوہ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء، جماعت احرار، خدائی خدمتگار اور شیعہ پولیٹیکل کانفرنس قائم ہوئیں۔ ان تمام جماعتوں کے نشو و نما اور ترقی کے مفصل حالات مع سالانہ اجلاسوں کی تجاویز کے دیئے گئے ہیں اور مسلمانوں کی سیاست کے تدریجی ارتقاء کو فلسفیانہ طریقہ سے دکھایا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح ٹرکی میں نوجوانوں نے وہاں کا سیاسی مسئلہ حل کر کے اپنے ملک کو اتحادیوں کے چنگل سے نکالا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کی ایک مقدس جماعت نے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کر دیا ہے جس سے ہندوستان انجام کار آزاد ہو کر رہے گا۔

باب دہم میں جو آخری ہے تاج برطانیہ کے اسی سال کے عہد میں ہندوستان کے دستی بنیادی حقوق کی جو حالت رہی اُسے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مشکل سے کوئی قومی مسئلہ ایسا ہو گا جس پر فاضلانہ تبصرہ نہ کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اعداد و شمار سے دکھایا گیا ہے کہ سیاسی جدوجہد کرنے سے ہر حق میں سے کتنا حصہ مل گیا اور کتنا باقی ہے اور کتنے عرصہ میں پورے حقوق ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اِس باب میں مسلمانانِ ہند کے تین سو سال کے حالات پر پورا تبصرہ کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ملک کی آزادی کی جنگ میں کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جسمیں مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت سیاسی جدوجہد میں پیش پیش نہ رہی ہو۔ اور وجوہ و دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ نہایت کٹھن منزلوں سے گذرنے اور سخت آزمایشوں میں پڑنے پر بھی ان میں کافی زندگی باقی رہی۔ البتہ نصف صدی کیلئے ان کا آفتاب اقبال کسوف میں آگیا تھا۔ جسمیں سے وہ روز بروز نکل رہا ہے اور اب تمام سامان ایسے جمع ہو گئے ہیں۔ جس سے اُن کا مستقبل بیّن اور بدیہی طور پر روشن نظر آرہا ہے۔

مصنف نے مسلمانوں کی ذہانت میں تبدیلی، ہندو مسلمانوں کی مشترک سیاسی اور اقتصادی پارٹیوں کے وجود میں آنے اور مسلم عوام کی پوچھ گچھ ہونے، سیاسیات میں علماء دین کی شرکت کو مسلمانوں کے روشن مستقبل کے آثار سے تعبیر کیا ہے۔ ہندوستان کی آئندہ سیاسی جنگ کے متعلق مصنف "روشن مستقبل" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ جس قسم کی پُرامن جنگ ہندوستانیوں نے

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء میں لڑی اور جس کے بعد کانگریس نے سات صوبوں میں انتخابات میں اکثریت حاصل کرکے جدید آئین کے تحت میں کانگریسی حکومت قائم کی۔ یہی پُر امن جد و جہد ہندوستانیوں کو کامل آزادی کے درجہ تک پہونچائے گی۔ اور اس کا انحصار رعایا کی واحد سیاسی جماعت یعنی کانگریس کی قوت پر ہوگا۔ اِس سیاسی قوت میں مسلمانوں کا حصّہ کیا ہوگا؟ اسکی بابت لکھا ہے کہ جمہوریت کے متحدہ مقصد میں اِس کا سوال باقی نہیں رہتا لیکن یہ پیشگوئی صحیح طور پر کی جا سکتی ہے کہ اس ایثار اور بے نفسی کی دوڑ میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہینگے۔ کتاب کی اشاعت کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ دلدل سے نکال کر جمہوریت کا صحیح اصول سمجھایا جائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کرے گی اور مسلمان ٹھنڈے دِل سے اس کا مطالعہ کریں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ قابل مصنف اس کتاب پر نظر ثانی کرنے کے بعد اُسکا دوسرا ایڈیشن "ہندوستان کا روشن مستقبل" کے نام سے جلد شائع کرسکیں۔ کیونکہ جس طرح مسلمانوں میں فرقہ وارانہ خیالات کے لوگ موجود ہیں، اُسی طرح دوسری قوموں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کو قوم پرستی اور جمہوریت کا صحیح مفہوم بتایا جائے۔ اسوقت حکومت کے سامنے مدارس کے نصاب میں تبدیلی کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بالخصوص جو تاریخیں ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور اُن سے جو فرقہ وارانہ خیالات پیدا کئے جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی جگہ لینے کے لئے "ہندوستان کا روشن مستقبل" جیسی کتابیں لکھی جائیں۔ (ن)

دِلّی کا سنبھالا[1]

یہ لاجواب کتاب غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل کی "دِلّی کا مرقع" ہے۔ جسمیں مشہور و معروف ماہرین علوم و فنون کی جیتی جاگتی قلمی تصویریں پیش کیگئی ہیں۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ "جمنا جی کے نرمل جل اور اُجلی دھار" میں دھلی ہوئی ٹھیٹ دہلی کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی پاس بیٹھا ہوا بیان کررہا ہے۔

اسمیں غدر سے پہلے دہلی کے مشہور و معروف علماء فضلا اور اُستادوں میں سے تقریباً ساٹھ کا حال مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ شروع میں دِلی کی گذشتہ تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:-

"صاحب سُنی سُنائی بات ہے، بڑوں نے کہی ہمارے کان پڑی، آپ تک پہونچادی، پانچ پت آباد ہوئے، چار کا پتہ چلتا ہے، پانچویں کا نشان نہیں ملتا۔ پانی پت، سونی پت، ماریت، باگپت، خیال ہے کہ پانچواں پت جو لاپتہ ہے، دہلی بن گیا۔ راجہ اننگ پال اس راجدھانی میں

[1] قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ: [illegible]

راج راج رہا تھا کہ فرشتۂ اجل نے فرمانِ قضا دیا۔ اولاد نرینہ نہ تھی، نواسہ پر تھوی راج جو اجمیر کا راجہ تھا، وارثِ تاج و تخت ہوا۔"

درحقیقت خواجہ محمد شفیع دہلوی نے یہ کتاب لکھکر بڑا احسان کیا ہے۔ ایسی پیاری زبان کہاں پڑھنے میں آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس فن کے استاد کا تذکرہ کیا ہے، اسی فن کا تلازمہ بھی استعمال کیا ہے، جس سے آج بیسویں صدی میں بیٹھے ہوئے، فسانہ عجائب اور سروش سخن کی زبان کا لطف آجاتا ہے۔ محمد بیگ ضلع جگت کے اُستاد کا کمرہ ملاحظہ ہو:۔

"زمانہ بھر کے آزاد منش، تیز طبع، حاضر جواب جمع ہیں۔ زبان درازی فقرہ بازی کا بازار گرم، ہر ایک کی زبان تیز طرار، تیغ بُراں، خنجر آبدار۔ آداب محفل نرالے ہیں۔ اس بزم کے انوکھے آئین ہیں۔ دعا سلام کا یہاں نام نہیں، تہذیب کا یہاں کام نہیں، نہ آداب اخلاق سے سروکار، نہ مغلظات سے اُن کو عار۔ آزاد ہیں، پابند نہیں۔ ان کے قول وفعل پر کوئی قید وبند نہیں، جو منھ میں آتا ہے سو کہتے ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ فقرہ چست ہو بندش درست۔ الفاظ چبھتے ہوتے، جواب کھبتا ہوا، برجستہ۔ ایک طرف آزاد منش رند مشرب بیٹھے ہیں ایک طرف مست مولا مستان۔ اس محفل میں امتیاز مراتب نہیں۔ امیر بھی ہیں، غریب بھی۔ فقیر بھی ہیں، رئیس بھی۔ سب ایک حمام میں ہیں اور ایک رنگ میں۔ میدانِ تمسخر میں سمندِ زبان گامزن ہے، ضلع پھبتی جگت کی جولانگاہ میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے۔ کسی نے فقرہ کسا اور سمندِ ناز پر تازیانہ ہوا۔ ترارا بھرا آسمان کے تارے توڑ لایا۔ ایسا جواب دیا کہ سب لاجواب ہوگئے۔ محفل سے تحسین و آفریں کا غلغلہ آسمان تک پہونچا۔ ساکنانِ کرۂ خاک کی داد فلک الافلاک پر فرشتوں نے دی۔"

ایک اور بزم مئے کا خاکہ یہ ہے:۔

"تاجدار مکان ہے۔ سامنے لبریز حوض، حوض کے بیچ میں فوارہ جام مئے کی طرح چھلک پڑتا ہے۔ گرداگرد تنوار روشنی کی گئی ہے۔ مکان جگمگا رہا ہے۔ آگے پائیں باغ۔ لالہ جام در دست گلاب گلابی لئے۔ نونہالانِ چمن مست و مخمور جھوم رہے ہیں، سبزہ کا منھ چوم رہے ہیں، چشم میخوار نرگس بیمار لڑکھڑا رہی ہے۔ بادِ بہاری مستانہ وار آرہی ہے۔ بزم مئے ہے، جام و مینا سجے ہیں۔ گلہائے خوشرنگ و خوشبو کے انبار۔ عطردان کھلے دھرے ہیں۔ گلاب پاش بھرے رکھے ہیں۔ عود سوز سُلگ رہے ہیں۔ دھواں مستانہ وار اٹھتا ہے۔ اور مینا کا طواف کرتا

گذر جاتا ہے۔ شمع کے گرد پروانہ، مست مستانہ، سرگشتہ و دیوانہ، آگ سے کھیل رہا ہے۔

اب آتش کا دور چل رہا ہے۔ شعلہ آشام دو آتشہ اور سہ آتشہ سے دل کی لگی بجھا رہے ہیں، کدورت کا یہاں نام نہیں۔ انقباض کا کام نہیں۔ صاف دل پاک دروں جمع ہیں کھل کھیل رہے ہیں، جن سے دل کھلی ہے وہی موجود ہیں۔ پہلے ساقی کے نام کی زمین پر گرائی، پھر شغل شروع ہوا۔ جوان سفید رنگ کی پی رت ہیں۔ سال خوردہ سرخ۔ ساقی سیم ساق مزاج داں، طبع شناس، گلاب و بید مشک ملا کر لایا ہے۔ حسینانِ مخمور چشم خدمت کو حاضر مطربِ خوش نوا ساز سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔"

دِلّی اور لکھنؤ میں اب تو کچھ نہیں رہا ہے۔ مگر کسی زمانہ میں یہاں فن قصہ گوئی کے بڑے استاد موجود تھے۔ جنھیں اصطلاح میں "داستان گو" کہتے تھے۔ دِلّی والے داستان گویوں کا اسلوب بیان ملاحظہ فرمائیے:۔

"صاحبان! ایک عرصہ کی بات ہے۔ مدتیں گذریں زمانہ ہوگیا۔ ہماری جوانی تھی۔ پاؤں پر منگل سوار تھا، سر پر سنیچر۔ دِل میں آئی کہ چلو ہم بھی جہاں گشت بنیں۔ "سیروا فی الارض" پر عمل کریں۔ ذرا دنیا دیکھیں۔ سامانِ سفر تیار کر چل کھڑے ہوئے۔ نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی۔ چلا چل چلا چل۔ راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز، ایک مقام پر پہونچے۔ کہ نام تھا اس کا وحشی نگر۔ بانگڑ پور تعلقہ جہالت آباد۔ شہر میں قدم رکھتے ہی دماغ جہالت سے پراگندہ ہوگیا۔ لوگ گندہ دہن، کم رو، چھوٹے چھوٹے سر، حماقت مآب، جانگلو، احمق، خرنا شخص۔ طبیعت تو وہاں پل بھر بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتی تھی، پر کیا کرتا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آفتاب سر بام تھا، جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ رات سر پر آرہی تھی، ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی سرا ہے، تو عجب ادائے استغنا سے فرماتے ہیں۔ "ہم تو گھر میں رہتے ہیں۔" میں نے عرض کی خدا آپ کو گھر میں رہنا مبارک کرے۔ میں مسافر ہوں، تو ارشاد ہوا، جمعرات کو آنا۔ قسمیہ آگ ہی تو لگ گئی۔ دِل میں آیا اتنا جُتیاؤں کہ ساری عمر یاد کرے۔ اجنبی جگہ سمجھ کر چپ ہوگیا۔ دِل میں ٹھان لی، یا قسمت یا نصیب، سرا ملے چاہے نہ ملے، اب کسی سے پوچھونگا نہیں، تھوڑی دُور گیا تھا، مقدر سامنے تھا، سامنے سرا دکھائی دی۔ شکر باری تعالیٰ بجا لایا۔ اور سیدھا ہی بھٹیاری کے پاس گیا۔ کالی کلوٹی بیگن لوٹی خنگری سی ایک عورت،

میلے دسمال کے رنگ کے کپڑے پہنے چولہے کے آگے بیٹھی
پسینہ بہ رہا تھا۔ یقین مانیئے وہ بھی کالا۔ گلوری منھ میں۔ اِی
کسی کا کلیجہ کھا کر آئی ہے۔"

غرض شروع سے آخر تک کتاب زیرنظر بہت دلچسپ ہے۔ جو لوگ دلّی د
چاہیں۔ وہ اِس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ آخر میں مشاعرہ کی کیفیت بھی پڑھنے
ہم اِس کتاب کی اشاعت پر مکتبہ جامعہ ملیہ کو داد دیتے ہیں۔ اِس کا کچھ حصّہ ریڈیو پر
جا چکا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ، سرورق دلچسپ، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۵۶ اصفحہ

ثمر دار باغبانی[1]

ہندوستان زراعتی ملک ہے لیکن یہاں کے زراعت پیشہ طبقہ کی حالت حد درجہ خراب ہے۔
مگر پھل دار درختوں کے باغ لگانے اور عمدہ قسم کی ترکاریاں بونے سے زراعت پیشہ
لوگوں کی آمدنی میں خاصہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسکی مثالیں ملیح آباد کے باغات انبہ، دربھنگہ
اور مظفر پور میں باغات آم و لیچی اور ناگپور میں باغات سنترہ موجود ہیں۔ لیکن اس فن سے ہمارے
زراعت پیشہ طبقہ کو بہت کم واقفیت ہے۔ اِس لئے چودھری بھوانی داس صاحب بی۔ اے، مالک
پرکاش نرسری، مظفر گڈھ پنجاب نے باغات کے شوقین اصحاب کیلئے یہ کتاب لکھ کر ملک کی
رہنمائی کی ہے۔ اِس کتاب کے مختلف ابواب میں انتخاب زمین، ترتیب باغ، طریقہ کاشت
اشجار، پودوں کا درمیانی فاصلہ، آبپاشی، کاٹ چھانٹ، آلات باغبانی کے متعلق مفصل ہدایات
درج ہیں۔ اِس کی زبان بھی سلیس اور عام فہم ہے اور مختلف مضامین کو نقشوں اور تصویروں
کے ذریعہ بھی سمجھا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آم، بیر، جامن، شہتوت، کھجور، انار، امرود، انجیر،
سیب، سنترہ، ناشپاتی، لوکاٹ، انگور، آڑو، کیلا، آلوچہ، فالسہ وغیرہ ہندوستان کے عام پھلوں
کے ضروری حالات، اُن کے بونے کیلئے ضروری آب و ہوا، قسم زمین، کھاد، بونے کا موسم، آبپاشی،
کاٹ تراش، قلم لگانا، تخم بونا، ان کی بیماریاں، کیڑے وغیرہ، اور ان کے دفعیہ اور علاج کی ترکیبیں،
بھی، تفصیل کے ساتھ بتادی گئی ہیں۔ اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ کس موسم میں اور کن حالات کے اندر
کون سا پھل، کیسی زمین میں بویا جائے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحہ پر ختم ہوئی ہے۔

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ چودھری بھوانی داس بی۔ اے، آنریری مجسٹریٹ و مالک
پرکاش نرسری مظفر گڈھ، پنجاب۔

رفتار زمانہ

ـی نئی پالیسی جو مسولینی اور ہٹلر کو بہر حال خوش کرنے کی ہے اور جس کا لازمی نتیجہ

ـی طاقتوں سے علیحدہ کرکے بحال خود رہنے دیا جائے۔ نیز وسط یورپ کی چھوٹی چھوٹی

ـری نظر کرم کا محتاج کرکے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔ کہیں بھی مقبول نگاہوں سے

ـائی۔ مسٹر موصوف نے جب پارلیمنٹ میں یہ بیان کیا کہ ہمیں اس دھوکہ میں نہ رہنا چاہئے اور
ـی چھوٹی اور کمزور ریاستوں ہی کو اس دھوکہ میں رکھنا چاہئے کہ دست درازی ہونیکی صورت
میں مجلس اقوام انھیں بچا سکیگی۔ اس بیان کے دو تین ہفتوں کے بعد ہی جرمن فوجیں آسٹریا میں
داخل ہوگئیں۔ چیکوسلاویکیہ کی حالت بھی بہت نازک ہے کچھ خبر نہیں کہ جرمنی کب کیا کر بیٹھے۔ ریاستہائے
بالٹک بھی ہٹلر کے غاصبانہ طرز عمل سے خائف ہیں اور اپنی سلامتی کی خیر منا رہی ہیں۔ جب ورسیلز کا
صلحنامہ ہوا تو مفتوح سلطنتوں کے ٹکڑے کرکے اقلیتوں کے حقوق اور حکومت خود اختیاری کے اصولوں
کے اصول پر نصف درجن ریاستیں علیحدہ علیحدہ قائم کر دی گئیں۔ اب جرمنی اُس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا
چاہتا ہے۔ اُن ریاستوں یعنی چیکوسلاویکیہ وغیرہ میں اقلیتیں ہیں۔ لہذا جرمنی کہتا ہے کہ انھیں اصولوں
کے بموجب ان سلطنتوں کے مزید ٹکڑے کرکے علیحدہ علیحدہ ریاستیں کیوں نہ قائم کر دی جائیں۔ اِس طرح
جنگ عظیم کے فاتحان اور صلحنامہ ورسیلز کے بانیاں پر "چاہ کن راہ چاہ درپیش" کا مسئلہ صادق آتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلستان نے کیوں ایسی پالیسی روا رکھی۔ اس کے دو وجوہ ہیں اوّل یہ کہ
ابھی برطانیہ جنگ کے لئے پورے طور پر تیار نہیں ہے اور ہٹلر و مسولینی کی دھمکیوں کو ہیچ سمجھتا ہے۔
دوسرے یہ کہ برطانیہ میں اسوقت برسر اقتدار پارٹی سرمایہ داروں کی ہے وہ نازیت اور فاسسیت کو
اشتراکیت کا شاطر اور کامیاب حریف خیال کرتی ہے۔ اور برطانیہ و فرانس کی رفاقت میں اسقدر خلوص
نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ فرانس کی موجودہ گورنمنٹ شاٹمپ، ڈیلبوس اور بلم کے ماتحت اشتراکیت
کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی خفیہ طور پر یہی رہی ہے کہ یورپ پر فرانس
کا غلبہ مسلط نہ ہونے پائے۔ اس لئے برطانیہ فرانس کے حریف جرمنی کو ترقی پذیر ہونے میں در پردہ مدد
دینے پر مجبور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے برطانیہ نے جرمنی کی توسیع اسلحہ کی
کارروائی پر خاموش طور رضامندی دے کر اور بحری سمجھوتہ کرکے فرانس کو رضامند کیا کہ وہ رائن لینڈ

Communism Self-Determination. Rights of Minorities
Anti-feudal. Chautemps, Delbos, Blum.

میں جرمن فوجوں کے قابض ہوجانے پر (جو صلحنامہ ورسیلز کی
یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ برطانیہ نے پولینڈ پر بھی اثر ڈالا کہ وہ جرمنی سے
میں جرمنی اور پولینڈ کے درمیان ایک غیر مصافی معاہدے پر دستخط ثبت کر
جاتا ہے کہ چونکہ برطانیہ یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی کے خلاف فرانس اور روس کے
اور روس میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں فرانس کے ساتھ صلحنامہ لوکارنو کے
جنگ میں شامل ہونا پڑے۔ اِس لئے اُس نے بلجیم کو یہ ترغیب دی کہ وہ صلحنامہ لوکارنو کی رو
سے گلو خلاصی کرلے جنگی رو سے کسی کی طرف سے صلحنامہ ورسیلز کی خلاف ہونے پر دستخط کنندگان
لوکارنو کو ایک دوسرے کی مدد کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ چنانچہ بلجیم نے اِس بات کا اعلان کردیا ہے کہ ایسی
حالت میں وہ اپنی پوزیشن غیر جانب دار رکھے گا۔

برطانیہ کے خلاف یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے چیکوسلاویکیہ کی ہینلین پارٹی کی حوصلہ افزائی کی کہ
وسط یوروپ کی ریاستوں کے شیرازہ کو ڈھیلا کردے۔ کیونکہ یہ ریاستیں فرانس کے زیر اثر تھیں۔

اب ذرا برطانیہ اور اٹلی کے معاملات پر غور فرمایئے۔ اِسمیں شبہ نہیں کہ اٹلی اسپین کی جنگ
میں دراصل اسپین کے خلاف نہیں بلکہ برطانیہ کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ کیونکہ اُس کا مدعا یہ ہے کہ
بحیرہ روم میں برطانیہ کے خلاف پورا اقتدار حاصل کرلے۔ اُس پر بھی برطانیہ نے اٹلی سے سمجھوتہ کرلیا ہے،
حالانکہ مسولینی اب بھی بہ بانگ دہل اِس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ وہ جنگ اسپین میں لازمی طور پر
جنرل فرانکو کی فتح کا طالب ہے۔ برطانیہ میں برسرِ اقتدار پارٹی کے امراء اس بات سے اپنی تشفی کرلیتے
ہیں کہ جنرل فرانکو کے فتحیاب ہونیسے اسپین میں اشتراکیت کی علمبرداری باقی نہ رہیگی۔

برطانیہ اور امریکہ کے تعلقات پر سرسری نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ برطانیہ کے موجودہ برسرِ اقتدار
امراء کی پارٹی جو کلائیوڈن گروپ کے نام سے مشہور ہے، امریکہ کے پریسیڈنٹ روز ویلٹ کے بالشویک
رجحانات کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔ امریکہ اور برطانیہ کے تواریخی تعلقات کے ماتحت ہمیشہ
بنیادی اختلاف رہا ہے گو جنگ عظیم کے آخر وقت میں برطانیہ نے امریکہ کو ملا لیا تھا اور اِسوقت بھی
جو اتفاق و یگانگت برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ہے۔ اس کا اصلی باعث چین میں جاپان کی مداخلت
ہے۔ کیونکہ امریکہ اور برطانیہ دونوں کا مفاد چین کی آزادی سے وابستہ ہے۔ امریکہ اور روس میں
زیادہ گہرے تعلقات ہوجانے کا امکان ہے، مگر برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی، اٹلی اور فرانس کو
ملاکر روس کو تمام طاقتوں سے علیحدہ کردے اور اس کی یہ بھی کوشش ہے کہ امریکہ کو روس سے

Cliveden Group. & German Poland non-aggressive Pact

ی سے فرانس، امریکہ اور وسط یوروپ کی ریاستوں کو جو اعتماد برطانیہ
دوسرے پہلو پر غور کیا جائے تو دراصل برطانیہ خود بے یار و غمخوار رہ گیا ہے
نشوں کے باوجود بھی برطانیہ کو بالآخر جرمنی کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اُس وقت
طاقتور ہوچکا ہوگا۔ اور بجز فرانس کے جو کسی طرح برطانیہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ کوئی
ن برطانیہ کا ساتھ نہ دیگی۔ چنانچہ برطانیہ کی جدید پالیسی کے خلاف انگلستان ہی میں بڑا شور و
برپا ہے اور تمام دیگر پارٹیوں نے مسٹر چیمبرلین کی پالیسی سے آزردہ ہو متحد ہو، پارلیمنٹ میں انکا اقتدار
ں کرنا چاہا۔ لیکن ٹریڈ یونین پارٹی خالص طور پر برسرِ اقتدار آنا چاہتی ہے اور دوسری پارٹیوں کے
ساتھ شامل ہوکر حکومت کرنا مناسب نہیں سمجھتی، ورنہ چیمبرلین پارٹی کا ابتک خاتمہ ہوگیا ہوتا۔
اُدھر جرمنی کے دانت چیکوسلاویکیہ پر لگے ہوئے ہیں۔ روس کو بھی جرمنی سے برابر اندیشہ لگا
رہتا ہے اور وہ یقیناً چیکوسلاویکیہ اور ریاستہائے بالٹک کے معاملات پر جرمنی اور پولینڈ سے برسرِ پیکار
ہونے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایسی صورت میں جاپان دوسری طرف اُس کے لئے
مشکلات پیدا کردے گا۔
میکسیکو کی گورنمنٹ بھی اشتراکیت کی طرف مائل ہے اور جب برطانیہ نے اسپین کو اسلحہ جات اور
دیگر سامانِ جنگ فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ تو میکسیکو نے ہر طرح سے اسپین کی مدد کی۔ لہٰذا
برطانیہ اشتراکیت کی حامی حکومت کو کس طرح پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ اِس لئے جذبات کے
اظہار کے لئے موقعہ کی تلاش تھی، چنانچہ حال میں برطانیہ پچھلے قرضے کی ادائیگی کا تقاضا کر بیٹھا۔ گو خود
برطانیہ جنگ عظیم کے زمانہ کے امریکہ کے قرض کی ادائیگی سے معذور ہے۔ میکسیکو کی گورنمنٹ نے
اِس تقاضے سے کبیدہ خاطر ہوکر برطانیہ سے تعلقات منقطع کرلئے ہیں۔ برطانیہ سے تعلقات منقطع
کرنے پر میکسیکو کو تیل کی کانوں کے متعلق دوسرے ممالک سے کاروبار کی آزادی رہیگی۔ انگریزوں
کے ہاتھوں سے میکسیکو کا بازار نکل گیا۔ جس سے یانکی (Yankee) کے سرمایہ داران خوش ہیں۔
مشرق بعید میں چین اور جاپان کے مابین جو جنگ چھڑی ہوئی ہے اسکا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ عارضی
فتوحات کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیئے۔ جاپان غالباً خود بہت زیادہ پریشان ہے۔ اگر وہ جنگ کا سلسلہ جاری
نہیں رکھتا۔ تو آیندہ کے لئے اُسکا دبدبہ مٹا جاتا ہے۔ لہٰذا اُس کے لئے اِس کے سوا اور کوئی صورت نہیں
کہ چین کے ساتھ جنگ کا سلسلہ جاری رکھے۔ اِسلئے اگر یہ لڑائی برسوں چلتی رہے تو کوئی تعجب نہیں۔

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح ... بیان، ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر بے نظیر کتاب ہے، نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد صہ غیر مجلد للعہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

میدان عمل

منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ ملیہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اسمیں ملک کی موجودہ بیدار و بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملینگے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو، کتابت اعلیٰ، کاغذ نفیس، روشن طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور پرکیف نظموں کا بہترین مجموعہ ہے، جو آپ کو بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیگا شاعر اعظم کا لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد نہایت خوشنما پوش سے آراستہ ہے۔

قیمت صرف تین روپیہ آٹھ آنے،

ملنے کا پتہ

زمانہ بک ایجنسی کانپور

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلما مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے جسمیں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ انکی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور مشہور انشا پردازوں نے اس نمبر کیلئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ نمبر قابل قدر یادگار حالی کہلانیکا مستحق ہے۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

پرنٹر پنڈت سری بلبھ' بیسوال پریس کانپور

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نراین نگم بی۔ اے

The ZAMANA, June 1938

جون ۱۹۳۸ء | مرتبہ: دیانرائن نگم بی۔ اے۔ | جلد ۷۰ نمبر ۶

فہرست

قیمت سالانہ: پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۲۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔
زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند
کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ پینتس ۳۵ سے اردو زبان
وادب کی کس قدر انہماک وسرگرمی سے خدمت
کررہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ
نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین
حاصل کرچکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریں
میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی
رہ گئی ہیں۔ خریداروں کیساتھ حسب ذیل رعایت کیجائیگی
۱۔ گیارہ ۱۱ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ۴۰ روپیہ
۲۔ چار سال کے خریدار سے تین ۳ روپیہ فی فائل سالانہ
۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۴ علاوہ محصول
نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئے
فائل ۱۹۲۶ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء
میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۵ء تک
مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔
مینجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ
نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ قیمت ۱عہ علاوہ
محصول، ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

کچھ بگڑے ہوئے بچوں کے متعلق

ایک امریکن جرنلسٹ نے جو پچھلے دنوں یوروپ کی سیر و سیاحت کرکے واپس آیا ہے لکھا ہے کہ "یوروپ بھر میں کسی جگہ بھی سڑکیں اسقدر صاف نہیں ہیں، نہ کہیں دروازوں پر لگے ہوئے گھنٹی بجانے کے بٹن اس قدر چمکدار پالش کردہ ہیں اور نہ کہیں ٹریم گاڑیاں سڑکوں کے موڑ پر اسقدر شور و غل کے ساتھ گھومتی ہیں جسقدر کہ "لالہ زار" ہالینڈ کے بڑے بڑے شہروں میں۔"

اُس اخبار کے ناظرین میں سے ایک شخص نے ایڈیٹر اخبار مذکور کو ایک خط لکھا کہ "ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یوروپ میں کوئی ایسا ملک بھی ہے۔ جہاں کے حکام لوگوں کی صحت کا اسقدر خیال رکھتے ہوں، جتنا کہ امریکہ میں رکھا جاتا ہے۔ ہمارے سوشل قوانین کو ہی دیکھئے جس کا صحت کے بیمہ سے تعلق ہے اور جنکی بدولت ایک بیمار مزدور کو اُس وقت تک جب تک وہ کام کرنیکے قابل نہ ہو جائے اس کی اُجرت کا ایک معقول حصہ ملتا رہتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا ملک کسی خاص بات میں ہمارے ملک سے بہتر ہے تو ہم بہت جلد ہار ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں، لیکن ہم اپنے ملک کے اس محکمہ کو فراموش نہیں کرسکتے جس کا تعلق صحت کے بیمہ سے ہے۔"

ایڈیٹر موصوف کے پاس اِس مضمون کا جواب نہ ہوتا تو اُسے ایڈیٹری کون کہتا، چنانچہ اُس نے نامہ نگار مذکور کو یہ جواب دیا کہ میں بھی اپنے اُن اہلِ مُلک کا قدرتاً بہت بڑا احترام کرتا ہوں جن کے دِل قومی جذبات سے معمور ہیں، اسلئے میں اپنے محترم نامہ نگار کے دلچسپ ریمارک کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعی ہمارا ملک اپنے ایسے شہریوں پر بھروسہ کرسکتا ہے۔ لیکن میں نے اِس چھوٹے سے ملک (ہالینڈ) میں ایک اور بات بھی دیکھی جس کا میں اِس موقع پر اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہالینڈ میں اُن لوگوں کو جو پبلک محکموں میں ملازم ہیں، حفاظتی تدابیر اختیار کرکے بیمار ہونے سے بچایا جاتا ہے اور اس کا طریقہ آپ سے عرض کئے دیتا ہوں۔ کبھی نہ کبھی آپ نے گفتگو یا لکچروں میں یہ ضرور سُنا ہوگا کہ سمندر کے کنارے جو نشیبی مُلک ہوتے ہیں، وہاں جاڑوں کا زمانہ صحت کے لحاظ سے بہت خراب ہوتا ہے۔ اکتوبر سے لیکر اپریل تک تمام باشندوں کی چھینکتے اور کھانستے زندگی بسر ہوتی ہے۔ بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کو انفلوئنزا اور دوسری بیماریوں کے جراثیم سے متاثر ہونے کا پورا خطرہ رہتا ہے، مثلاً ٹریموے کے کنڈکٹر اور ڈرائیور۔ شہر ہیگ کی کونسل (ہیگ وہ مقام ہے جہاں ہالینڈ کی ملکہ رہتی ہے) صرف اتنا کرتی ہے کہ اُس نے اپنے تمام ملازموں کو اوقات مقررہ پر تین گرین کونین کی گولی کھانیکا حکم دے رکھا ہے جو انفلوئنزا کی بے خطا دوا ہے۔ اور اسی وجہ سے کونسل کے تمام ملازمین انفلوئنزا کے خطرناک حملوں سے قطعی محفوظ رہتے ہیں۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ میونسپلٹی کے ملازم حکماً دوا کھائیں؟ ہم نے بحر اٹلانٹک کے اس طرف ایسی بات کبھی نہیں سُنی۔

یہ واقعہ واقعی ذکر کرنے کے قابل ہے بعض اوقات چھوٹے چھوٹے ملک بڑے ملکوں کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

زمانہ

جلد ۷۰ — جون ۱۹۳۸ء — نمبر ۶

فارسی اور سنسکرت کے تلفّظ میں مطابقت

(از مسٹر سلیم جعفر)

فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کے تلفظ کا یکساں ہونا بالکل فطری ہے۔ لیکن اپنے سامی ہمسایوں کا اثر قبول کرکے فارسی نے کسی قدر اپنا تلفظ بدل دیا ہے۔ جس کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں اُس کے طریقِ اِملا پر غور کرنا پڑے گا۔ اَوَسْتا کے رسم الخط میں زند اَوَستا اور پاژند یا پہلوی کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ مگر بالعموم فارسی خواں اس سے ناواقف ہیں اس لئے یہاں کچھ مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔ اس خط میں لفظ کا ہر حرف ہی الگ الگ نہیں لکھا جاتا بلکہ حروف علت جن سے اعراب کا کام لیا جاتا ہے وہ بھی الگ الگ اور اُس حرف صحیح کے بعد ہی لکھے جاتے ہیں جو ان کا معمول ہے۔ اس کا اور رومن خط کا جس سے انگریزی خط نکلا ہے ایک ہی حال ہے۔ مثلاً لفظ زَرْدْ اوستا کے رسم الخط میں لکھنا ہو تو ﴿…﴾ لکھا جائیگا، اس میں پہلا حرف زَ ہے، دوسرا فتحہ اور تیسرا دْ ساکن۔ اسی کو اگر زَدَ لکھنا ہو تو فتحہ کے لئے آخر میں ایک حرف اور بڑھانا اور یوں لکھنا پڑتا ہے ﴿…﴾۔

اب دو نمونے ملاحظہ فرمائیے:-

اَوَسْتا = (۱) [Avestan script]

کَہْ شْ نَ اُو ثْہ رَ اَ ہْ رَ ہْ ←

[illegible]

مَ زْ دَ اُد تَ رُ و ءِ دِ ی تِ ے آ نْ رَ ہِ ے

[illegible]

مَ ہُ نْ ے اُ شُ

ترجمہ = خوشنودی ہرمزد کی (نصیب ہو) لعنت ہو اہرمن پر۔

پاژند یا پہلوی = (۲) [illegible]

اَ ہُ رَ مَ زْ دَ کُھ دَ وَ ء ے اَ ژ

[illegible]

ہَ مَ ا گُ نَ ا ہُ پ تِ ے ت

[illegible]

پَ شِ ے مَ انُ نْ وَ مْ

اَہُرَمَزْدَ کھُودائے اَژ ہَما گُنَاہ وپَتیتْ پَشیمانُومْ ۔

ہمارے قواعد فارسی کے ہندوستانی مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ فارسی میں لفظوں کے شروع میں ایک الف آتا ہے جسے الف وصلی کہتے ہیں۔ جن لفظوں کے شروع میں یہ الف آتا ہے وہ مع اس کے اور بغیر اس کے دونوں طرح لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں وہ یہ دیتے ہیں

اُگر۔ اَبَر۔ اَبا۔ اَیے۔ اِشکم۔ اِستَم۔ اِشکرہ۔ اُشتر۔ اُشتلُم۔ اُمجُوبہ۔
اِستر۔ اَشگرف۔ افراسیاب۔

اس الف وصلی کے بڑھانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عربی میں کوئی لفظ ابتدا بساکن نہیں ہوتا۔ غیر زبانوں سے عربی نے جو لفظ لئے ہیں اُن میں جب اسے اس قسم کے لفظوں سے سابقہ پڑا ہے تو اس نے بوقت تعریب ایک الف بڑھا دیا ہے تاکہ تلفظ میں دقت نہ ہو۔ مثلاً Plato افلاطون sponge اسفنج۔ عربوں کے اس قاعدہ کو ایرانیوں نے بھی اختیار کرلیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ان کی زبان کے لفظوں میں بہت سے ایسے لفظ تھے جو ابتدا بساکن تھے مثلاً مذکورہ بالا دو مثالوں میں سے پہلی مثال کے پہلے لفظ کے شروع کے دونوں حرف ملاحظہ کیجئے جو ساکن ہیں۔ لیکن ایرانیوں نے اس حذف و اضافہ میں بے اصولی سے کام لیا۔ انھوں نے اکثر وہاں الف گرا دیا جہاں لفظ کا پہلا حرف ساکن نہ تھا گو سہولت تلفظ جو عربی کا اصلی مقصد تھا

اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیا یعنی حذف الف کے بعد انھوں نے اس کے مابعد کو اگر متحرک نہ تھا تو متحرک کر دیا۔ مثلاً اگر جس کو میں سنسکرت کا اَگْرَ (अग्र) سمجھتا ہوں، حذف الف کے بعد اس کا کاف مفتوح کر دیا۔ اَبَر۔ جس کا مترادف سنسکرت کا اُپرِ (उपरि) ہے اسے مخفف کر کے بَرْ بنا دیا۔ عربی سے ب بمعنی معیت لی تو اس کے آگے پیچھے دونوں طرف الف بڑھا کر اَبا گھڑا۔ اور بے جس کا مترادف سنسکرت کا وِ (वि) ہے اس پر بے وجہ الف لگایا۔ درحقیقت ان میں سے پہلے دو یعنی اگر اور اَبَرْ میں تو الف وصلی ہے ہی نہیں۔ عربی کی بِ بمعنی معیت وغیرہ جب کسی لفظ کے شروع میں آتی ہے تو ہمیشہ متحرک ہوتی ہے۔ اسی طرح بے بذاتِ خود متحرک ہے ان دونوں میں الف وصلی کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ اَستر سنسکرت کا اَشْوَتَرَ (अश्वतर) ہے۔ مگر اصول کی اصلیت بھول جانے کے بعد بے اصولی نے اپنا کرشمہ دکھایا۔

اِشکَنْ کے اشتقاق و ماخذ کا پتہ نہیں۔ اِشتَم کا مادہ شتم ہے جو دسویں گن (باب) میں ستانا کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اِشکَرہ کا مادہ اُس + کُرِ (उस + कृ) ہے۔ ان میں سے۔ اِستم میں الف وصلی ہے، لیکن اشکرہ میں الف اصلی ہے جسے استعمالِ عام نے گرا دیا۔

اُشتلم - اعجوبہ - اشتر اور افراسیاب میں پہلا ترکی ہے اور دوسرا عربی جس کی نسبت صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں "بضم ہمزہ بمعنی عجیب و انچہ مردم را در تعجب اندازد نہ بغیر ہمزہ - از مزیل الاغلاط"۔ یوں بھی یہ عجیبہ کی جمع ہے۔ اشتر سنسکرت کا اُشْٹْرَ (उष्ट्र) ہے۔ افراسیاب کی اصل ہے فْرَاَنْ هْرَسْيَ (اوستا)۔ ... شروع کے تینوں لفظوں میں الف اصلی ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں الف اصلی ہے اور استعمال عام نے گرا دیا۔ الف اصلی کے گرا دینے کا ثبوت انھیں چند مثالوں سے نہیں ملتا بلکہ اُفتادن۔ افروختن۔ افزودن افسردن۔ افشاندن۔ افشردن اور افگندن، جن کا آ، سنسکرت کے اَپَ (अप) کا مترادف ہے اور جن میں سے الف گرا دیا گیا ہے، سب اس کی تائید کرتے ہیں کہ فارسی الف گرا دیتی ہے۔

اس صورت میں کثرت کو قلت پر ترجیح دینے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جو الف اصلی لفظ کے شروع میں آتا ہے فارسی اکثر اس کو گرا کر اس کے مابعد کو متحرک کر دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم مذکورۂ بالا مثالوں ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوتے تو شاید اس الف وصلی کا ذکر بھی نہ کرتے، مگر دائرۂ تحقیقات تنگ نہ ہونے کی بنا پر چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سنسکرت میں جو لفظ ابتداً ساکن ہیں ان میں فارسی

نے ایک الف بڑھایا ہے۔

ابرو (بَھرُو = भ्रू) اخروش = خروش (کُرُش = कुश = مادّہ) استادن = ستادن (سْتھا = स्था = مادّہ) استارہ = ستارہ (سْتَرَ = स्तर) استاندن = ستاندن (سُتینَ = स्तेन्)۔ استم = ستم (سْتَم = स्तम् = مادّہ) استوار (سْتھاور = स्थावर =) اُستور = ستور (سْتھُوَرَ = स्थूर) استون = ستون (سْتھُونا = स्थूणा) اَردشیر ऋतक्षत्र - اَرِش ऋषि -

درحقیقت ہمارے قواعد نویس نے مثالوں کے انتخاب میں غلطی کی ورنہ اس کے نظریہ کی تائید کے لئے فارسی میں بہت سے لفظ ملتے ہیں۔ غرض یہ کہ الف وصلی ثابت کرتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانہ میں بعض فارسی لفظوں کا تلفظ ابتدا بساکن کیا جاتا تھا جیساکہ آج کل بھی سنسکرت میں پایا جاتا ہے۔

واو معدولہ بھی ہمارے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے تین محل استعمال بتائے جاتے ہیں،

(۱) "بیانِ ضمہ و اتمام لفظ" جوکہ" تو۔ چو۔ دو" میں پایا جاتا ہے۔

(۲) عطف جیسے" کرد وگفت"

(۳) "اِشمامِ ضمہ" جوکہ" خود۔ خویش" وغیرہ میں ملتا ہے۔

تو (त्वम्) اور۔ دو (द्व) میں واو اصلی ہے۔ اور بیانِ ضمہ و اتمام لفظ کے لئے نہیں بڑھایا گیا۔ بعض وقت ضرورتِ شعری یا اورکسی وجہ سے انھیں مخفف کر دیتے ہیں، اس وقت بیشک ان کی آواز تائے مضموم اور دال مضموم کی سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرورت نہ ہو تو ان کے تلفظ میں واو کی آواز صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ اور آج کل کے ایرانی انھیں بالکل اس طرح بولتے ہیں گویا ان میں واو معروف ہے۔

واو عطف عربی سے لیا گیا ہے اور دو لفظوں کے بیچ میں آتا ہے تو اپنے ماقبل کو ضمہ دے کر اس سے مل جاتا ہے۔ یہ تلفظ پتا دیتا ہے کہ فارسی میں بھی سنسکرت کی سَندھی (सन्धि) کے آثار موجود ہیں۔ سنسکرت کا طریقہ ہے کہ جب دو لفظ ملائے جاتے ہیں اور ان میں سے پہلے لفظ کا حرف آخر مفتوح (अ) ہو یا الف ماقبل مفتوح (आ) اور دوسرے لفظ کا حرفِ اول الف مضموم (उ) ہو تو دونوں تلفظ مل کر اَو (ओ) ہو جاتا ہے۔ جیسے مَہا + اُپادھیایَ (महा+उपाध्याय) کو مَہوپادھیایَ (महोपाध्याय) بولتے ہیں۔

تیسرا محلِ استعمال سنسکرت سے نسبت کا بیّن ثبوت ہے۔ فارسی نے عربی کے اثر سے کیئے یا

سہولتِ تلفظ[1] کی غرض سے عرصہ سے لفظوں کو ابتدا بساکن بولنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے اس نے خواب۔ خواہر۔ خواندن۔ خوردن وغیرہ میں سے حرف دوم سے اشمام کا کام لے کر اور خود اس کو ساکن کر کے حرف اوّل پر ضمّہ لگا دیا۔ اس قسم کے تمام لفظوں کے سنسکرت کے مادّوں میں سُوَ (स्व) پایا جاتا ہے۔ مثلاً خواب۔ خواندن اور خوردن کے مادّے بالترتیب سُوَپْ (स्वप) سُوَن (स्वन) اور سُوَرْدْ (स्वर्द) ہیں۔ خواہر کا مترادف سنسکرت سُوَسُر (स्वसृ) ہے اور خَے (مخفف خوے = پسینہ) کا مرادف سوِید (स्वेद) ہے جس کی دال بدل کر تی ہوگئی۔

ہائے مختفی تیسرا حرف ہے جو ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس کے چار محلِ استعمال ہیں جن کی مثالیں بالترتیب دندانہ۔ یکسانہ۔ گفتہ اور جامہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے میں یہ نسبت وشباہت کے لئے لگائی گئی ہے، دوسرے میں تشخیص وتعیین مدت کرتی ہے، تیسرے میں انتہا وا تمامِ حرکت کا کام دیتی ہے اور چوتھے میں بیانِ فتحہ کے لئے بڑھائی گئی ہے مگر معنی میں دخل نہیں دیتی۔ درحقیقت پہلی اور دوسری مثالوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی ہ سنسکرت کے کَ (क) یا کاف ماقبل مفتوح (आक) کا بدل ہے۔ گفتہ کی ہ سنسکرت کے وِسَرگ (विसर्ग) کے جواب میں ہے، اس کو چاہئیے تو اتمام حرکت کے لئے مان لیجئے۔ سنسکرت تائید کرے گی لیکن جامہ کی ہ کی نسبت کوئی بات تحقیق سے نہیں کہی جاسکتی۔ پلاٹس نے اپنے لغات "ہندوستانی۔ کلاسکل ہندی اور انگریزی" میں اس کا مادّہ یَم یا ئیم بتایا ہے لیکن اس کی تائید نہ تو دھاتُ پاٹھ سے ہوتی ہے اور نہ اَمر کوش سے۔ اگر پلاٹس کی تحقیق صحیح مان لی جائے تو اس میں بھی اسی قسم کی ہ ہوگی جو دندانہ اور یکسانہ میں ہے۔ ہائے مختفی جہاں درحقیقت اتمام حرکت کا کام دیتی ہے وہ الفاظ کہ (بیانیہ) چہ (کیا۔ استفہامیہ) نہ (نہیں) اور پاشنہ وغیرہ ہیں۔ یہ طریق اظہار تلفظ درحقیقت عربی سے لیا گیا ہے اگرچہ تقلید کلّی نہیں۔ شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کے عرب غیر زبانوں کے ان لفظوں میں جن کے آخر میں واو مجہول آتا ہے حرفِ ماقبل آخر کی حرکت ظاہر کرنے کو اگر وہ مضموم ہو تو ہ بڑھایا کرتے تھے۔ مثلاً کارلو (Carlo) کو معرّب کر کے قارلہ لکھتے تھے۔

تلفظ سنسکرت کی دونوں خصوصیتیں یعنی (۱) لفظوں کے پہلے حرف کا ساکن ہونا اور (۲) لفظوں کے حرفِ آخر کا بالعموم متحرک ہونا فارسی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس نے ہندوستانی زبانوں کی طرح ان پر پردہ ڈال دیا۔

---

[1] میں اس کو سہولتِ تلفظ ہی کے کرشمے سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس کا پتا ہندوستانی زبانوں میں بھی چلتا ہے۔ دیکھئے مضمون "حسنِ ارکان الفاظ" زمانہ بابت فروری ۱۹۳۶ء

"مَیں کیا ہوں؟"

از جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔ اے۔ ایل ایل بی

ہزار حیف اسیرِ طلسمِ دُنیا ہوں — فریب خوردۂ نیرنگیِ تمنّا ہوں
کبھی ہوں بزم طرازِ سرورِ عالم میں — کبھی رہینِ ستمہائے چرخِ مینا ہوں
گلے کا طوق ہے یہ الفتِ زن و فرزند — اِسی کو راحتِ قلبِ حزیں سمجھتا ہوں
کوئی رفیق ہے میرا نہ کوئی ہمراہی — سرائے دہر میں اک رہروِ جریدہ ہوں
فدائے جلوۂ صورت ہوں وائے نادانی — جہاں میں آکے حقیقت کو بھول جاتا ہوں

مِرے وجود میں مضمر ہے حسنِ لا فانی — اُفق پہ زیست کے گو صبح کا ستارہ ہوں
کرے نہ رنج کوئی اپنی بے ثباتی کا — کہ مَیں پیامِ بقائے دوام لایا ہوں
نہ سمجھو خاک کے ذرّوں سے ہے مری تخمیر — بہارِ باغِ لطافت ہوں مرغِ سدرہ ہوں
کیا ہے ذوقِ اسیری نے ایسا وارفتہ — کہ اُڑ کے خود قفسِ عنصری میں آیا ہوں
نگاہِ دیدۂ تحقیق سے مجھے دیکھو — کہ جس کو بحر سے نسبت ہے مَیں وہ قطرہ ہوں
مِرے جمال سے روشن ہے محفلِ عالم — مَیں وجہِ گرمیٔ ہنگامہ ہائے دنیا ہوں
بجا ہے، گر مجھے کہیئے خلاصۂ ہستی — کہ مَیں نظامِ دو عالم کا اصل منشا ہوں
کبھی ہوں مَیں اَرنی گوئے وادیِ ایمن — کبھی وفورِ تجلّی سے برقِ سینا ہوں
فراق ہو تو مجسّم غمِ محبت ہوں — وصال ہو تو سراپا جمالِ یکتا ہوں
طلسم خانۂ ہستی میں چشمِ بینا کو — نیاز و ناز کی نیرنگیاں دکھاتا ہوں
یہ کائنات حجابِ رخِ حقیقت ہے — مَیں بزمِ دہر میں ازِ درونِ پردہ ہوں

مجھے کیا ہے مری خود فروشیوں نے عیاں
کہ ذرّے ذرّے میں دنیا کے جلوہ فرما ہوں

اگلے وقتوں میں شادی بیاہ اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت[1]

ازدیانراین نگم

شاعر کا قول ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہو، لیکن صحیح نقطۂ خیال سے دیکھئے تو ان بزرگوں کو موجودہ زمانہ کے سامنے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ معاشرت، وضع قطع اور خیالات سب میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے، اور اگلوں کی بعض خوبیاں اب کمزوریوں میں شمار ہونے لگی ہیں۔ لیکن ہر زمانہ کی وضعداری وخوش باشی کا معیار خاص ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کے طور طریقوں کو اسی معیار سے جانچنا چاہئیے۔ مثلاً اگلے وقتوں میں برادری، کُنو یا کنبہ کا جتنا خیال تھا آج اُس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ شادی بیاہ کے متعلق اگلے زمانہ کی پابندیاں اب بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہیں۔ ساٹھ سال پہلے برادری کے باہر شادی بیاہ کا خیال ممکن نہ تھا، اب یہ معمولی بات ہوگئی ہے، اور سول میرج کا رواج شروع ہو گیا ہے۔ آگے چلکر اس میں اور ترقی ہوگی۔

سوشل تقریبات کی وقعت میں بھی عام طور پر فرق آگیا ہے۔ ختنہ۔ عقیقہ۔ کن چھیدن مونڈن، مکتب یا ودیا آرنبھ وغیرہ رسمیات جس دھوم دھام سے پہلے منائی جاتی تھیں جس شوق سے عزیزا قارب، یار آشنا اِن تقریبات میں جمع ہو جاتے تھے اس کا آج کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے موقعوں پر دعوت۔ جلسہ۔ دادودہش اور مہمان نوازی، سب میں لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی موقعے لباس و زیور کے دکھاوے کے ہوتے تھے، جاڑے میں ہر براتی کے پاس دو شالہ ہونا ضروری تھا غریب رشتہ داروں کے لباس کی فکر کرنا پڑتی تھی۔ بعد میں انگریزی تعلیم نے کوٹ۔ پتلون۔ کالر ٹائی کا رواج پھیلا کر نئی پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں اور اب دھوتی کرتا یا پاجامہ ہی سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن پچاس ساٹھ سال اُدھر کوئی شریف اس وضع سے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ لکھنؤ میں تو کوئی شخص چوگوشیہ یا دو پلی ٹوپی کے ساتھ گلے میں تہ کیا ہوا

---

[1] ۲ مئی ۱۹۳۸ء کو یہ مضمون لکھنؤ براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا تھا۔ ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے اب یہ "زمانہ" میں شائع ہو رہا ہے۔ (ا۔ز)

رومال یا دوشالہ ڈالے بغیر نظر نہ آتا تھا۔ شریفوں کی وضع قطع سے ریاست و تمکنت کا اظہار ضروری تھا۔ آج کی بول چال، نشست و برخاست میں بھی ایک خاص سلیقہ نمایاں رہتا تھا۔ غرض اُن کی ہر بات میں تکلف تھا۔ غریب بھی اپنے رنگ میں مست تھے، اور ایرل کا کہنا ہی کیا۔ اس انداز سے چوک کی سیر کو نکلتے کہ "گلے میں منت کے طوق پڑے ہیں، بازو میں امام ضامن بندھا ہوا ہے، چست انگرکھا زیب بدن، چوڑیدار پاجامہ پنڈلیوں سے چپکا ہوا۔ نکے دار ٹوپی سر پر، پسینہ سے اُکی ہوئی۔ مصاحبین ساتھ، خدمتگار کے ہاتھ میں خاصدان اور بغل میں بٹیروں کی کابک دبی ہوئی۔" حقہ کا اس قدر رواج تھا کہ گلی کوچہ اور میلوں ٹھیلوں میں جگہ جگہ حقہ پلانے والے موجود، کوئی محفل حقہ سے خالی نہ تھی۔ وکیل مختار صاحبان کچہری میں بھی اپنا پیچوان ساتھ رکھتے تھے اور پالکی گاڑیوں میں بیٹھے حقہ نوش فرماتے ہوئے کچہری آتے جاتے تھے۔

مردوں میں زیور کا رواج عام تھا۔ دس بارہ سال کی عمر تک کان میں بالیاں، ہاتھ میں جوشن پہونچیاں، گلے میں تعویذ کنٹھا، موہن مالا، اور پاؤں تک میں کڑے اور چھلے پہننا معمولی بات تھی۔ اور جوشن، زنجیر مالا اور انگوٹھیاں تو مُسن لوگ بھی تقریبات وغیرہ میں پہنا کرتے تھے۔

عورتوں کا زیور و لباس اس سے بھی بھاری تھا۔ ایک انگریز لیڈی نے نصیر الدین حیدر کی ایک چہیتی بیگم کا حال یہ لکھا ہے کہ "اس کا سڈول نقشہ دیکھ کر مجھے بار بار ٹامس مور کی ہیروئن "لالہ رُخ" کی یاد آتی تھی۔ اس کی پوشاک سرخ کمخواب کی تھی، بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے، زلفیں بکھری تھیں، پیشانی پر ایک چھوٹا سا جھومر لٹک رہا تھا جس میں بڑے بڑے موتی اور زمرد جڑے تھے۔ کانوں میں بہت سی بالیاں تھیں جن میں بیشمار لال و زمرد و موتی جڑے تھے۔ گلے میں موتی کے متعدد مالاؤں کے علاوہ کئی ہار اور کنٹھے تھے۔ ناک میں نتھ تھی جس میں دو بڑے بڑے موتی پڑے تھے اور بیچ میں بیش قیمت زمرد تھا۔"

اگلے زمانہ میں عورتوں کے کان کئی کئی جگہ سے چھدے ہوتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی عورت کے بچے کی لو فقط ایک یا دو جگہ سے چھدی ہو تو یار لوگ اس پر یہ پھبتی کستے کہ بھانڈوں کے ساتھ نلچنے والا لونڈا معلوم ہو رہی ہے۔ بیگمات کا ذکر ہی کیا۔ اُن کی لونڈیاں باندیاں بھی طرحدار اور ماما ئیں مغلانیاں بھی ضلع جگت میں طاق ہوتی تھیں۔

لہ جگت بست

مگر معمولی لوگوں کو یہ سج دھج نصیب نہ تھی، تاہم ہر عورت کم سے کم چاندی کے زیور سے لدی اور سرمہ۔ مسّی اور کنگھی چوٹی سے آراستہ رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ عوام میں بےفکری کا دَور دَورہ تھا، زندگی کی ضروریات کم تھیں، دنیا کا غم بھی اتنا نہ تھا، خبر رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ دنیا بھر کے حادثوں کی روزمرّہ خبر ہوتی رہے، ٹیکس کا بھی کوئی بار نہ تھا، غرض ایک محدود دنیا تھی جس میں رونا دھونا تو کبھی کبھار مگر روزمرّہ ہنسی ٹھٹھا میں وقت کٹتا تھا۔ آئے دن گھروں میں کسی نہ کسی بہانہ سے پکوان پکا کرتے، دعوتیں ہوتی رہتیں اور ڈھولک بجا کرتی تھی۔ اب زندگی کا معیار بلند ضرور ہو گیا ہے لیکن خوشحالی اور بےفکری رخصت ہو گئی ہے۔

انیسویں صدی کے خاتمے کے ساتھ یہ حالت ختم ہو گئی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ نے اور بھی انقلاب برپا کر دیا۔ اب ہندوستان کی پرانی وضعداری کا بالکل خاتمہ سمجھئے، نئے خیالات، نئے نظریے اور نئی باتیں رواج پا رہی ہیں۔ سادگی۔ صفائی۔ اور ستھراپن کا نیا تصوّر قائم ہو رہا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر سادگی پسند کی جانے لگی ہے۔ اگلے زمانہ میں کس سج دھج اور دھوم دھام سے براتیں نکلتی تھیں۔ ہاتھی گھوڑے۔ اونٹ، پالکی۔ نالکی۔ رتھ بہل۔ باجا گاجا۔ آرایش۔ آتشبازی اور رقص و سرود کے تمام لوازمات کے ساتھ براتیں شاہی جلوس کے ڈھنگ پر ترتیب دی جاتی تھیں۔ ہزاروں روپیہ نقد و جنس کی صورت میں لٹا دیا جاتا تھا۔ کانپور میں ایک مارواڑی صاحب کی برات نکلی تو روپے گنّیوں کی اس قدر بارش کی گئی کہ میونسپلٹی کی بیسیوں لالٹینیں چکنا چور ہو گئیں۔ غدر کے بعد ہی ایک کالستھ رئیس کے یہاں لکھنؤ سے برات آئی تو انھوں نے شہر بھر کے بنیوں اور حلوائیوں کو حکم دیدیا کہ تین دن تک جس قدر سامان مٹھائی لوگ لینا چاہیں اُس کی قیمت وہ خود ادا کر دیں گے۔ جا بجا کنوؤں میں شکر کی بوریاں ڈلوا دی گئیں۔ آج کل یہ باتیں حماقت و جہالت میں داخل سمجھی جائیں گی۔ لیکن اُس وقت یہی نام و نمود کا ذریعہ تھیں۔

رسمیات میں بڑی پابندی برتی جاتی تھی۔ اور شادی بیاہ رشتہ داروں اور برادری والوں کے مشورہ کے بغیر طے نہ ہوتی تھی حسب و نسب کا لحاظ مقدم تھا۔ بات کا بھی بڑا پاس تھا اور یہ مثل تو اب تک مشہور ہے کہ زبان ہی سے لوگ بیٹا بیٹی ہار جاتے ہیں۔ غرض زبان کا بڑا لحاظ تھا۔ ایک مرتبہ جو بات طے ہو گئی ہو گئی۔ قرارداد وغیرہ کے مطالبات بھی مقررہ اصولوں سے باہر نہ ہوتے تھے۔ کُل مرحلے بزرگ خاندان اپنی اور اپنے ہمعصروں کی رائے

سے طے کر دیا کرتے تھے، چھوٹوں کا تعمیل کے سوا اور کوئی فرض نہ تھا۔ آج گھریلو معاملات
میں آزادی رائے اور ذاتی حقوق پر زور دیا جا رہا ہے، لیکن ہمارے حق طلب اور آزاد خیال
نوجوان کچھ اگلے وقتوں سے زیادہ خوش و خرم زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں!

جب تک بچپن کی شادیوں کا رواج رہا، والدین کو ایک خاص پوزیشن حاصل رہی سمدھیوں
کی غیر معمولی عزت کی جاتی تھی۔ بات بات پر لڑکی والے سمدھی کو نذرانے دیتے اور ہر وقت اُن
کی آؤ بھگت کرتے رہتے تھے۔ اب بقول شخصے داماد اپنے قبضہ میں ہو جائے تو سمدھی کمبخت
سے واسطہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

کم سنی کی شادی کا ہندو مسلمانوں دونوں میں عام رواج تھا۔ میرے ایک ڈپٹی کلکٹر دوست
کی جو اب پنشن لے کر ایک ریاست کے منیجر ہو گئے ہیں، نو برس کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ بیوی
ان سے بھی دو سال چھوٹی تھیں۔ چنانچہ شادی کے دوران میں ایک گلدستے کے پیچھے ننھے
میاں بیوی میں خوب دھول دھپا ہوا۔ وہ تو خیر سے اُن کے والد بزرگوار نے ڈانٹ ڈپٹ کر
بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ورنہ خدا معلوم کیا نوبت پہونچتی۔ کمسن دولھا اکثر دو دو تین تین سال تک اپنی
بیبیوں سے شرمایا کرتے تھے

براتیوں کے دماغ بھی ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔ "لنکا میں سبھی باون گز کے" یہ مثل انھیں پر
صادق آتی تھی۔ "لڑکی والوں کی سب چیزیں ناقص" یہ ایک معمولی اصول تھا۔ براتیوں کو ہر قسم
کی فرمایش کا حق تھا۔ اور خدمتگاروں کو بھی گالی سے بات کرنے میں تکلف نہ ہوتا۔ سواری کے گھوڑوں
بیلوں کے لئے دانہ گھاس کے علاوہ سیروں گھی اور روٹیاں طلب کی جاتیں اور دینا پڑتی تھیں۔
بعض بعض براتیوں کو فی کس آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کا کھانا دینا پڑتا تھا۔ دعوتوں میں تکلف
و نمایش کو بڑا دخل رہتا تھا۔ کھتریوں میں سمدھیوں کے سامنے ایک پتّل کے بجائے کئی کئی
پتّل لگانے کا رواج تھا۔ لطف یہ کہ کُل کھانا سامنے آ جانے پر مہمان اُسے ہاتھ لگائے بغیر
صرف ملاحظہ فرما کر اُٹھ جاتے تھے اور تمام کھانا نائی باریوں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کانکبج برہمنوں کی
براتی چال مشہور تھی۔

برادری والوں کو اپنی اہمیت جتانے کے یہی موقع ہوتے تھے۔ "بھات" کی دعوت تمام
جھگڑوں کی جڑ تھی مگر شکر ہے اب اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ برہمنوں میں تو یہ مشہور
مثل ہے کہ "آٹھ قنوجیا نو چولھے" لیکن کم و بیش سبھی ذاتوں میں اس طرح کے جھگڑے برپا

ہوا کرتے تھے، کوئی کہتا کہ "میں فلاں شخص کے ساتھ نہ کھاؤں گا" اور "فلاں مہمان میرے ساتھ بیٹھنے کے لایق نہیں ہے۔" غرض اس قسم کے جھگڑے ہند و براتوں کے معمولی واقعات تھے۔ ایک برات میں تو یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ دولہا کا کام ہی تمام کردیا گیا اور شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

جن فرقوں میں شراب کی ممانعت نہ تھی اُن کے یہاں سرور کی حالت میں خوب مزیدار باتیں ہوجاتیں، اور بعض اوقات مناظرہ، مباحثہ بلکہ مجادلہ تک کی نوبت آجاتی۔ لڑکے شعرخوانی اور بیت بازی کرتے تھے اور بڑے بوڑھے بھی اُن کی پارٹیوں میں پڑکر اُنھیں لڑاتے، پیٹھ ٹھونکتے اور لطف اُٹھاتے تھے۔

ناچ کا رواج مہذب سوسائٹی نے اب بالکل اُٹھا دیا ہے، لیکن چالیس پچاس سال اُدھر رنڈی بھانڈوں کے ناچ سے سب کو دلچسپی تھی۔ تقریبات میں مہمانوں کے لئے انھیں انعام دینا بیوہار میں داخل تھا۔ عزیزوں کے نام لے لے کر گالیاں بھی گائی جاتی تھیں۔ مستورات بھی اِن گالیوں سے مستثنیٰ نہ رہتی تھیں اور لطف یہ کہ انھیں بھی گالیوں کے عوض انعامات دینا پڑتے تھے۔ کبھی کبھی رنڈیوں کو انعامات دیتے دیتے یار لوگوں میں مقابلہ ہوجاتا تھا۔

شادی کی تعداد میں مردوں کو پوری آزادی تھی۔ کُلین، برہمنوں میں دس بارہ بیاہ کرکے تمام عمر سسرال کی روٹیوں میں کاٹ دینا کوئی غیرمعمولی بات نہ تھی۔

عورتوں کا اخلاقی معیار جداگانہ تھا۔ مسلمانوں میں بھی ازدواج بیوگان کی رسم بند سی ہوگئی تھی مگر دولتمند لوگ بے تکلف کئی کئی شادیاں کرلیتے تھے۔ رنڈیوں کا ملازم رکھنا اور اُن سے تعلق رکھنا بھی کوئی عیب نہ تھا۔ بیویاں اِن باتوں کو مردوں کے لئے جائز سمجھنے لگی تھیں اور بعض تو شوہر کی عشق بازیوں پر علانیہ فخر کیا کرتی تھیں۔ ایک بڑی بوڑھی کا ذکر ہے کہ اُنھوں نے شوہر کی وفات کے بعد اُس کی داشتہ کو بڑی خاطرمدارات سے زندگی بھر اپنے ساتھ رکھا۔ کانپور کے ایک پُرانے رئیس کا ذکر ہے کہ وہ اپنے عیش پسند و جواں مرگ بیٹے کی رنڈی کو تاحیات اس کی پوری تنخواہ جاری رکھنے کو تیار تھے بشرطیکہ وہ گھر میں مرحوم کی بیوہ کی طرح رہے۔ ایسے بھی لوگ تھے جن کو اپنے نفقہ و سعادتمند اولاد کی بدشوقی کی شکایت رہتی تھی۔ غرض اگلے وقتوں میں سوسائٹی نے مردوں کو عیش اُڑانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی۔ البتہ منچلی عورتیں اُس وقت بھی اپنے حقوق منوا کر رہتی تھیں۔ ایسی حالت میں دو بیویوں والے شوہر کی جو گت

ہوتی ہے اس کے اکثر لطیفے مشہورِ عام ہیں۔

مردوں کی دنیا بالکل جداگانہ تھی، گھر کی عورتوں سے وہ قطعی الگ تھلگ رہتے تھے۔ عورتیں اب بھی "مستورات" کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، مگر اُس وقت اُن کو واقعی زنانہ مکان کی چار دیواری میں بالکل بند پردہ میں رہنا پڑتا تھا۔ گھر والوں تک سے پردہ ہوتا تھا۔ لڑکے یا چھوٹے بھائی کی بیوی سامنے نہ آسکتی تھی، اور تو اور خود بیوی کو اپنے میاں سے حجاب کرنا پڑتا تھا۔ علانیہ بے تکلفی تو بہت دنوں تک جائز نہ سمجھی جاتی تھی، اور کیا مجال جو کوئی بڑی بوڑھی کسی میاں بیوی کو بات چیت کرتے دیکھ لے۔ نئی بیوی کو پلنگ تک اُس وقت جانے کا موقعہ ملتا تھا جب سارا کنبہ محوِ خواب ہو جاتا۔ اُس کے لئے صبح منھ اندھیرے سب کے جاگنے سے پہلے بستر سے اُٹھ آنا بھی لازمی تھا۔ عرصہ تک شوہر بھی بے تکلف زنانخانہ میں نہ جا سکتا تھا، اور لڑکے کے بیاہ کے بعد کوئی باپ اطلاع کئے بغیر گھر میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

ہندو مسلمان دونوں میں عورتیں اور مرد علٰحدہ علٰحدہ کھانا کھاتے تھے۔ عورتوں کو مردوں کے بعد کھانے کا موقعہ ملتا تھا۔ بچے والی عورت کے ساتھ البتہ رعایت ہو جاتی تھی۔ بڑوں کے سامنے کوئی شخص اپنے بچے کو نہ گود میں لے سکتا تھا اور نہ اُس سے بات چیت کر سکتا تھا۔ زیادہ اولاد خوش نصیبی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کو یہی دعا دی جاتی تھی کہ "دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو"

مشترکہ خاندان اپنی پوری شان کے ساتھ قائم تھا۔ فردِ واحد کی کوئی حیثیت نہ تھی ایک کماتا سب کھاتے۔ بھائی بہن۔ بیٹے بھانجے۔ سالے بہنوئی سب خاندان کے ضروری رُکن تھے۔ بیٹے بھتیجے میں کوئی فرق نہ تھا۔ خاندان کے یتیم، بیواؤں کی پرورش اور لاوارث لڑکیوں کی شادی کا بوجھ خاندان کے ہر شخص پر رہتا تھا۔

انکسار و تکلف کو بڑا دخل تھا، خطوط میں لمبے چوڑے القاب و آداب لکھنے کا عام رواج تھا سب لوگ اپنے کو "کمترین" "احقر" "عاصی" وغیرہ لکھنے کے عادی تھے۔ اپنے گھر کو غریب خانہ کہنا اور دوسرے کے مکان کو دولت خانہ کے نام سے یاد کرنا تہذیب میں داخل تھا۔ نشست برخاست میں رُتبے کا بڑا خیال رہتا تھا، سواری میں داہنے بائیں کا پُورا لحاظ ہوتا تھا۔ چھوٹوں کو بڑوں کے سامنے بات کرنے کی جرأت نہ تھی، اُن کے سامنے ہنسی مذاق در کنار حقّہ۔ پان تمباکو کا استعمال بھی ناجائز تھا۔ پان پہلے بڑوں کو تقسیم کئے جاتے، پانی پہلے چھوٹوں کو پلایا جاتا تھا۔ غرض ہر بات

کے لئے اصول اور قاعدے مقرر تھے، اور انھیں کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کے سامنے جو بات کہی جاتی بحاظ رکھکر اختصار کے ساتھ کہی جاتی۔ رائے کا اظہار ہمیشہ معذرت کے ساتھ ہوتا تھا، مثلاً ذاتی رائے کے اظہار سے پہلے اس قسم کا فقرہ کہ "میری رائے ناقص" یہ ہے۔ ضروری تھا۔

نوجوان اپنی نشست وبرخاست بزرگوں سے علحدہ رکھتے اور بزرگ بھی ان کی صحبتوں سے دُور ہی رہتے تھے۔ اتفاق سے کبھی کسی کا گذر ہوگیا تو سناٹا سا چھا جاتا تھا، اور لوگ بڑے میاں کے سامنے بھیگی بلی بن کر دو زانو ہوکر چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے۔

مہمانداری میں بڑا اہتمام ہوتا تھا، معمولی لوگ بھی مہمانوں کے لئے قسم قسم کے کھانے تیار کرانا ضروری سمجھتے تھے اور اس بات کا بڑا خیال تھا کہ مہمان کو گھر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ اگر کوئی چیز بازار سے منگانی ہوتی تو سات پردے میں چھپا کر لائی جاتی۔ سسرال جاکر پیٹ بھر کھانا معیوب تھا، اس کے متعلق بڑے فریدار لطیفے مشہور ہیں۔

خیر یہ تو معمولی باتیں تھیں، اگلے وقتوں کی سب سے زیادہ قابل قدر چیز عام وضعداری قواعد کی پابندی اور فرض شناسی تھی۔ ایک دفعہ جس سے جس قسم کا سلوک ہوگیا، مرتے دم تک وہی برتاؤ قائم رہا۔ اگلے لوگ زبان کے سچے اور بیوہار کے بڑے پکے تھے۔ اب تو تحریر کی بھی وہ وقعت نہیں جو اگلے وقتوں میں زبان کی تھی۔ قول سے منحرف ہونا شرافت پر بٹہ لگانے کے برابر تھا۔ اسی زبان ہی سے لوگ بیٹی بیٹے ہار جاتے تھے۔"

مذہبی چھوت چھات اور کھانے پینے میں پرہیز آج سے کہیں زیادہ تھا لیکن دلوں میں رواداری کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے عزیزوں کو اپنا عزیز سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کے رسم ورواج اور طریقوں کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ مثلاً کوئی مسلمان اپنے ہندو دوست کے داماد سے ملتا تو اُنھیں مراسم کو ملحوظ رکھتا تھا جو ہندوؤں میں رائج ہیں، اور ہندو دوستوں کی لڑکیوں کے یہاں کے پانی تک کا روادار نہ تھا۔ لڑکے شہر اور محلہ کے بزرگوں کا خالی نام نہ لیتے تھے، بلکہ کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑکر انھیں مخاطب کرتے تھے۔ دہلی۔ بہار۔ آگرہ و اودھ وغیرہ کے قدیم خاندانوں میں ابھی تک یہی طریقہ رائج ہے لیکن اب یہ وضعداریاں مٹتی جاتی ہیں۔

تیوہاروں میں بھی چنداں تخصیص نہ تھی۔ ہولی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ محرم۔ چہلم وغیرہ سے

سبھی لوگوں کو برابر دلچسپی تھی، اور فقیر فقرا کے ساتھ یکساں اظہارِ عقیدت ہوتا تھا۔

رفاہِ عام کا خیال بھی موجود تھا۔ شوالہ۔ مندر۔ مسجد۔ سرائے۔ کنواں وغیرہ بنوانے کا عام دستور تھا۔ وطن کا موجودہ تصور تو تھا نہیں لیکن لوگ اپنے مولد و منشا کی بڑی قدر کرتے تھے، اور پیدائش و ابتدائی تربیت کے مقام کو اپنا اصلی وطن سمجھتے تھے۔

حکیم اور وید اپنے پیشے کو روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ سمجھتے تھے۔ فیس کا رواج نہ تھا بلکہ اکثر دوا بھی مفت ملتی تھی۔ ہاں ذی اثر اور دولتمند لوگ اُن کے گذر اوقات کا خیال رکھتے تھے۔

تاش گنجیفہ۔ شطرنج۔ چوسر سے عام دلچسپی تھی۔ ناچ مجرے ہوا ہی کرتے تھے۔ پردے کے رواج نے شاہدانِ بازاری کو بڑا موقعہ دیدیا تھا، اور اربابِ نشاط کو شرفا کی صحبتوں میں خاصہ دخل مل گیا تھا۔ شہروں میں بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ کبوتر بازی سے عام لوگوں کو شوق تھا۔ دیہات میں تیتر لڑانا، بلبل اور طوطے پالنا لوگوں کا عام مشغلہ تھا۔ کشتیاں۔ تیراکی اور پٹہ بازی وغیرہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ آگرہ۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ بنارس وغیرہ میں برسات کے زمانہ میں باغوں کی سیر اور جھولے کی دعوتوں کا عام رواج تھا۔ غرض لوگ مزے کی زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سی باتیں جو اب معیوب سمجھی جاتی ہیں جائز تھیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کا کوئی اخلاقی معیار نہ تھا۔ بعض کمزوریوں کے باوجود اگلے لوگوں میں چند خاص خوبیاں تھیں جو اب نظر نہیں آتی ہیں۔ اس لئے ہم کو انھیں کمتر سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ بھی نہ بھولئے کہ اگر آج ہم اپنے پیشروں کا مضحکہ اُڑائیں گے تو آنے والی نسل ہماری دھجیاں بھی اڑا کر رکھدے گی۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

قطعہ

عالم میں ہیں ہزاریوں تو گورے کالے　　اِس پر بھی بہت شاذ ہیں حکمت والے

پھرتی ہیں جہالتیں نہ جانے کتنی　　کاندھوں پہ عبائے علم و دانش ڈالے

جوشؔ

کلامِ فراق

از حضرت فراق گورکھپوری۔ ایم۔ اے

عشق فسردہ ہی رہا غم نے جلا دیا تو کیا / سوزِ جگر بڑھا تو کیا دل سے دھواں اٹھا تو کیا

پھر بھی حیاتِ عشق میں حسن کی وہ کسک کہاں / ہر دلِ بیقرار میں درد دبا دیا تو کیا

پھر بھی تو شبنمی ہے آنکھ پھر بھی تو ہونٹ خشک ہیں / زخمِ جگر ہنسا تو کیا غنچۂ دل کھلا تو کیا

پھر بھی تو بیخودانِ غم رازِ سکوں نہ پا سکے / تو نے نظر کی لوریاں دے کے سلا دیا تو کیا

پھر بھی مری صدائے درد تیرے لئے سکوت ہے / ہل گیا آسماں تو کیا کانپ اٹھی فضا تو کیا

عشق کی غفلتیں نثار چھیڑ نہ اے خیالِ یار / تو نے جگا دیا تو کیا غم نے اٹھا دیا تو کیا

کون سا فرق آ گیا گردشِ روزگار میں / عشق تڑپ اٹھا تو کیا اشک ٹپک پڑا تو کیا

صبر طلسم در طلسم ضبط فریب در فریب / اشک بھی تھم گیا تو کیا دل بھی سنبھل گیا تو کیا

اور الجھ کے رہ گیا قصۂ حیات و موت کا / زیست کے راز کھولتی بحثِ فنا بقا تو کیا

منزلِ بیخودیِ عشق موت کو بھی نہ مل سکی / جائے گی اتنی دور تک عمرِ گریز پا تو کیا

دیکھ فضائیں جاگ اٹھیں زندگی جگمگا اٹھی / سازِ جنونِ عاشقی چھیڑتے ہی سو گیا تو کیا

عمرِ دوام مل گئی عالمِ سوز و ساز کو / مجھ کو مٹا دیا تو کیا دل کو بجھا دیا تو کیا

عذرِ ستم کی جان تھی رنجشِ بے سبب تری / جھک بھی گئی نظر تو کیا آ بھی گئی حیا تو کیا

اب تو تری صدا بھی ہے میری صدائے بازگشت / آج سوالِ عشق پر آئی بھی اک ندا تو کیا

اور اداس کر دیا رنگِ سکوتِ ناز نے / وجہِ ملال پوچھتی نرگسِ آشنا تو کیا

دیکھنے والے کو ترے حسرتِ دید رہ گئی / پردہ سا اٹھ گیا تو کیا جلوہ سا ہو گیا تو کیا

تھیں مری بیقراریاں محرمِ عشوۂ نہاں / ہوش نہ تھے بجا تو کیا دل نہ ٹھکانے تھا تو کیا

وہ تو کسی کا بامِ ناز راہِ جنوں سے مل گیا / کاٹتی یہ چڑھائیاں عقلِ شکستہ پا تو کیا

دیکھ رہا ہوں اور کچھ حسنِ کرشمہ ساز میں / ناز تو کیا ادا تو کیا عشوہ تو کیا حیا تو کیا

سُود و زیاں کے لفظ بھی وہم و گماں ہیں سر بسر — حُسن بھی پا سکا تو کیا عشق بھی کھو سکا تو کیا
اپنی نگاہ سے کر غریب رازِ نشاطِ عشق ہیں — دیدۂ شوق بھی ترے حُسن کو دیکھتا تو کیا
غربت دل ہی کا نام گو حیرتِ یار رکھ دیا — گو تھیں تمام منزلیں عشق کے زیر پا تو کیا
کوئی مزاج داں نہ تھا گردشِ روزگار کا — حُسن تھا شادماں تو کیا عشق اداس تھا تو کیا

پھر بھی تری نگاہ یاد آ ہی گئی فراق کو
بارِ نیاز و نازِ عشق حُسن سے اُٹھ سکا تو کیا

خریداریِ حسن

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے

رہیں حُسن کی ہم خریداریوں میں — بکیں عشق کی گرم بازاریوں میں
گذر جائے گی ان حسینوں کے دم سے — حیاتِ دوروزہ پرستاریوں میں
ہر اک غم کے لذت چشیدہ رہیں گے — حسینوں کی پیہم دل آزاریوں میں
ہوئی عشق ورزی ہے طینت میں داخل — کٹیں گے نہ دن سہل انکاریوں میں
جفاؤں سے چھوٹے گریباں سے اُلجھے — نہیں اہلِ دل رہتے بیکاریوں میں
نہ آیا الہوس دیکھکر ہم کو خنداں — جفاؤں کی ان گرم بازاریوں میں
لکھایا تھا تھا نام اپنا روزِ ازل ہی — غمِ عشق کی ناز برداریوں میں
ملا ہے ہمیں وہ بھی محبوب ایسا — نہ اقراریوں میں نہ انکاریوں میں
ترے ہاتھ رنگ دیں گے ہم خونِ دل سے — بہارِ محبّت کی گُل کاریوں میں
تری سرد مہری کی ہو گی تلافی — وفا کی مری گرم بازاریوں میں
دکھا ہم کو زاہد نہ ظاہر نمائی — ریاضت کہاں ہے ریاکاریوں میں

چُھپایا ہے ظلمات میں آبِ حیواں
نہ جا تو ہماری سیہ کاریوں میں

محروم اور فلسفۂ غم

از مسٹر جے کرشن چودھری ایم اے، ایل ایل بی

محروم کی شاعری کا سب سے پُر زور نغمہ اُس کا بیانِ غم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے اثرات اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں۔ اور اُسکی تخیلات کی دُنیا کو آہ و فغان سے معمور کر دیا ہے۔ انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر شیلی کے اِس نظریہ میں کہ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں گیت وہ ہیں جو انتہائی جذبۂ غم کا بیان کرتے ہیں" محروم کی ہر دلعزیزی کا راز پنہاں ہے۔

شاعر انسان کے جذبات کا ترجمان ہے۔ اس کا درجہ اتنا ہی بلند اور رفیع ہوتا ہے جتنا کہ وہ انسانی دِل کی گہرائیوں اور پوشیدہ جذبات کے آشکارا کرنے میں ہمارا مدد و معاون ہوتا ہے۔ محبت، حسد، رشک۔ خوشی اور غم کے جذبات یوم تخلیق سے ہمارے دِل کی گہرائیوں میں پیوست ہیں محبت سے بڑھکر نہیں تو اِس جذبہ کے قریب قریب غم کا جذبہ انسان کے دِل میں تلاطم بپا کر دیتا ہے۔ اور کوئی جذبہ اتنی شدت سے انسان کے دل پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ خوشی کے جذبات چند لمحات تک رہتے ہیں۔ لیکن دُکھ درد کے جذبات جان گسل اور دیر پا ہوتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ زمانہ خود بخود زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن ذرا سی نئی تکلیف اُن کو پھر ہرا بھرا کر دیتی ہے۔ اور دُنیا میں قہقہوں کیساتھ آنسوؤں کی جھڑی بھی ہے۔ ایک شاعر کے لئے یا بالفاظ دیگر ایک حسّاس شخص کے لئے دُنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے، اُس کا قہقہہ بھی آنسوؤں سے آزاد نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

بارانِ غم سے جب گلِ آدم بھگو چکے　　اک قطرہ عیش کا بھی ملایا تبرکاً

اسواسطے میرے خیال میں جو شاعر ہمیں اِس اولین فطری جذبہ سے لذت اندوز کراتا ہے وہ ہمارے دِل کے عمیق اور نازک تاروں کو چھیڑتا ہے۔ یقیناً ایسے شاعر کا کلام دیر پا ہوتا ہے۔ شاعر کا کام ہمیں محض ہنسانا یا تفریح طبع کا سامان پیدا کرنا نہیں، یہ تو ایک معمولی درجہ کا مذاحیہ نویس بھی کر سکتا ہے، اگر شاعر کے کلام میں سُوز نہیں، جذبات کی فراوانی نہیں، دِل کی شکست کی آواز نہیں یا درد و کرب کی تصویر نہیں، تو وہ شاعری نہیں۔

غالب کے کلام کی جاذبیت کی یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو اُس کے کلام میں اپنی پُر حسرت اور

پُر درد زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔ ہر شعر اُس کو حسب حال دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے جسے دُنیا میں کانٹوں سے الجھنا نہیں پڑا، جسے درد و غم، حسرت و یاس سے پالا نہیں پڑا، جسے آنسوؤں کے موتی پرونے نہیں پڑے۔ کیا غالب کا ذیل کا شعر اُن کے واسطے آہنگ بے ہنگام ہو سکتا ہے؟ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اِس شعر میں سوز کا ایک سمندر ہے بے پایاں۔ اور تسکین قلب کا ایک سرچشمہ ہے ابدی اور روح پرور۔ زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

غالب موت کو قاطع آلام سمجھتا ہے۔ لیکن محروم کا زاویہ نگاہ موت کے متعلق قدرے مختلف ہے محروم اُس کی تباہ کاریوں، اُس کی جفا کشیوں اور اُس کے مظالم کو ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح دیکھتا ہے۔ موت محروم کی نظر میں دُنیا کے رنج و محن کا آخری، تاریک اور نہایت ہی خوفناک انجام ہے جس سے بچنے کیلئے وہ بچے کیطرح سعیٔ لاحاصل کرتا ہے۔ کبیر کی طرح اُس کے دل سے موت کے لئے خوش آمدید کی آواز نہیں نکلتی ؎

جا مرنے سے جگ ڈرے، میرے من آنند
کب مریہوں کب پا یہوں پورن پرمانند

کبیر اپنے محبوب کے وصل کی امید سے موت سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔ ٹیگور موت کو اپنے مالک کا پیغامبر خیال کرتا ہے۔ اور خوشی کے ترانے گاتا ہے۔ لیکن محروم کے دل میں یہ خوشی کا ولولہ نہیں۔ گو اُس نے کسی کسی جگہ موت کے متعلق گیتا کے نظریہ کو نظم کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کی تعلیم نے محروم کے دماغ پر تو اثر کیا ہے لیکن دل پر نہیں۔ "موت" کے عنوان سے آپ اُنکی نظم پڑھیئے۔ موت کے مظالم کی حسرت بھری تصویریں کھینچی ہیں۔ اور اُن کے آخیر میں گیتا کی فلاسفی سے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بعینہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ سانپ کے ڈر سے سہمے ہوتے بچے کو کوئی بھولا ہوا منتر یاد آجائے۔ دراصل محروم نے موت کو شاعر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا ایک عام آدمی کے خیال سے دیکھا ہے۔ اور اِس پہلو سے اس کی تصویریں نہایت قابل قدر ہیں۔

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دُور
ماں باپ سے بہت پرے، بھائی بہن سے دُور

لاشہ کوئی پڑا ہے، مزار و کفن سے دُور
دست صدائے شیون، و شور و محن سے دُور

پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دُور
گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دُور

موت کی وادی کی کیا ہی پُر حسرت تصویر ہے؟

موت کی اِس قسم کی دردناک تصویریں میرے خیال میں اُس ذاتی صدمہ کا نتیجہ ہیں، جو محروم کو

عین عالم شباب میں اپنی بیوی کی موت سے پہونچا ہے۔ یہ صدمہ عین اُسوقت ہوا، جب اوائل شباب کی مسرتوں کے اُمید و آرزو کے گلبن کھلتے ہیں۔ اور حسرت و یاس کے خار پہلو میں نہیں کھٹکتے ایسے وقت میں اپنے حبیب کی موت اپنی آرزوں کی موت معلوم ہوتی ہے اور یہ درد اتنا جگر سوز ہوتا ہے کہ اس کا اثر ساری زندگی پر چھاجاتا ہے۔ جس کا کوئی مداوا نہیں، کوئی تسکین نہیں، کوئی اُلفت کا سامان نہیں۔ آپ محروم کی نظمیں جو "طوفانِ غم" کے نام سے لکھی گئی ہیں پڑھیے۔ آپ کو شاعر کی شدتِ غم کی حقیقت اور اُس کے بیانِ غم کی چابکدستی معلوم ہوگی۔ میں نے اِس حصۂ نظم کو کئی دفعہ پڑھا ہے۔ اور ہر دفعہ میں درد و غم کے طوفان سے چیخ اُٹھا ہوں ؎

کسی کے پھول جو گنگا میں ہم بہا کے چلے — جگر پہ آہ! نئے داغ اور کھا کے چلے
وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے کنارِ گنگا پر — کہ نہر پہلوئے دریا میں اک بہا کے چلے
گھٹے نہ آہ ذرا بھی تو سوزِ پنہانی — پلٹ پلٹ کے نہائے، نہا نہا کے چلے
چلے ہیں ویسے ہی جیسے کہ آئے تھے محروم — وطن کو بادلِ غم دیدہ پھر پھرا کے چلے

موت کے مقابلہ میں اِنسان کی ہستی کتنی بے مقدار ہے، فرماتے ہیں ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے، کہ ہم — جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی — اشکوں کو کیا کروں کہ وہ خود سر بلا کے ہیں

یہ صدمہ اُن کے لئے سوہانِ روح بن گیا ہے۔ اور یہی اُن کی شاعری کی روح ہے

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے، اِسی مضراب سے (اقبال)

بہر حال کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ اِس روح فرسا صدمہ کی وجہ سے محروم کی شاعری انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ کہیں دوستوں کی وفات پر آنسو بہاتے ہیں۔ کہیں انکی جو کبھی جاہ و حشمت کے مالک تھے اور موت کے بیرحم ہاتھوں سے گوشۂ خاک میں سوگئے، پر ارمان زندگی اور پرحسرت موت کی داستانِ عبرت چھیڑ دی ہے۔ کہیں انجامِ گل۔ سبزۂ نو۔ شمع و سحر کے زیرِ عنوان غیر فانی زندگی کا تذکرہ ہے، اور کہیں فریادِ یتیم۔ شکوۂ صیاد، بلبل کی فریاد۔ چڑیا کی زاری۔ مچھلی کی بیتابی۔ کولھو کا بیل، اور اِسی قسم کی دوسری نظمیں اِنسانی ستم و تغافل کے شکار، بے زبانوں کے درد و غم کی داستانیں ہیں۔ محروم کی آنکھیں ہر وقت دوسروں کے غم میں آنسو بہاتی ہیں۔ اُن کا دل ہر دم ہمدردی سے لبریز رہتا ہے اور اُنکا تخیل اُن کے دکھ درد کی تصویریں کھینچنے میں وقف ہے۔ کون ہے جو اِن نظموں کو پڑھے، اور درد کے احساس

سے تڑپ نہ اٹھے" کوآہو کا بیل" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا
ہم چلے جاتے ہیں دن رات جگر ہے اپنا

کاش! اسی راہ میں آپڑتا عدم کا رستہ
اُلٹا افسوس! نصیبا ہی مگر ہے اپنا

تیل ٹپکے ہے پڑا کو لہو سے قطرہ قطرہ
خشک ہوتا ہے ادھر لوہو سے قطرہ قطرہ

مرغزاروں میں نہ جاکر کبھی سبزہ دیکھا
بہتے دریا کا نہ سرسبز کنارہ دیکھا

چار دیواری ہی سی تیلی کے گھر کی دیکھی
اور اِس قید دوامی میں بھلا کیا دیکھا

اب "یتیم کی فریاد" سنیئے ؎

گہن قسمت میں تھا اپنی، وگرنہ نور برساتے
کسی کے مطلع امید پر مثلِ قمر ہم بھی

.. ..

جگہ دیتا ہے۔ باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں
اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو

.. ..

وہ لاغر ہیں کہ احسان موت کا بھی اُٹھ نہیں سکتا
عدم کی سمت کوئی بے اجل کردے رواں کوئی

بُلبُل کی فریاد سے ایک آدھ شعر سنیئے ؎

اِس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے
میرا بھی کچھ تو چارہ پروردگار ہوتا

شاخِ نہال پر یا پنجرہ مرا لٹکتا
پنجرے میں یا ہجوم سرو چنار ہوتا

اِنسانی جور و جفا کی داستانیں چڑیا کی زاری اور مچھلی کی بیتابی میں دی گئی ہیں۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

نزدیک نسلِ اِنسان ہرگز کوئی نہ آئے
اپنے جگر پہ ہرگز تیغِ ستم نہ کھائے

.. ..

حیرت میں ہوں نہنگ قضا ہے کہ آدمی
جاندار پر ہیں دانت بلا ہے کہ آدمی

خوابِ جہانگیر اور نورجہان کا مزار بھی اسی رنگ میں خوب نظمیں ہیں۔ جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

منتظر محفلِ عشرت ہے شہا جاگ کہیں
او صبوحی کش مستانہ ادا! جاگ کہیں

لیکن نورجہان کا مزار، درد و غم کا ایک مرقع ہے، اور سارا پڑھنے کے قابل ہے۔ ذیل کے اشعار میں غضب کا درد بھرا ہے ؎

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

کٹتا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے   دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

اُنھوں نے فطرت کی رنگینوں کی تصویر بھی کھینچی ہے، لیکن اُنمیں بھی درد و غم کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ قدرت کا انتہائی نکھار اُن کے فطرتی جذبۂ غم پر تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ "کنارِ راوی" پڑھئے۔ آپکو اِس امر کی حقیقت کا علم ہوگا ؎

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں   ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشنِ دہر میں فراغ کہاں   چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں
شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

. . . .

آنکھ کھولی اِدھر ستاروں نے   جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کئے ہزاروں نے   آنکھ کھولی نہ غم کے ماروں نے
شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

. . . .

سیکڑوں میں چراغ روشن ہیں   نور مئے سے ایاغ روشن ہیں
کر یک شب چراغ روشن ہیں   یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

"رخصتِ سرما" میں بھی اِسی قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں ؎

مگر آہ! جس چمن کا میں ہوں عندلیب نالاں   ہوئیں مدتیں کہ اسمیں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں   جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی

جب غم کے ہاتھوں زندگی دوبھر ہوگئی ہو تو عہدِ طفلی کی یاد بے طرح دل کو تڑپاتی ہے۔ بچپن ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ بے حد شیریں اور بے حد مختصر! "سندھ کو پیغام" پڑھئے ؎

طفلی وہ مری، اور وہ معصوم اُمنگیں   لے دے! وہ دل خوش کن موہوم اُمنگیں
وہ کھیلنا مرا تری امواج سے دن بھر   وہ چھیڑ مری بلبلے کے تاج سے دن بھر
خورشید جہانتاب کا وہ حجب سے نکلنا   محروم کا وہ شوق سے بستر سے اُچھلنا
نورانی دوپٹے میں کرن کا وہ نکھرنا   سو ناز سے اُس کا وہ عروسانہ اُترنا

از میر طاہر کاشمیری ڈراماٹسٹ

قمر! تو نور کا منبع، خدائے کیفِ ضیا ترے ظہور کی دنیا کمالِ حسن جلا
ضیا فروشی سے تیری جہاں کی سیم تنی

ہے بے نیاز حدود و قیود تیری چمک شبابِ عمر کا حاصل ہے تیری ایک جھلک
فقیر ہے ترے در کا فروغِ حسنِ غبی

ہے تیری گود میں پلتی نشاطِ روح بشر تری نگاہوں میں مضمر ہے مرہموں کا اثر
فنائے درد و صعوبت ہے تیری جلوہ گری

ترے جہان میں ہے بے صدائیوں کی صدا کمالِ نغمۂ خاموش تیرا حسنِ ضیا
ہر اک شعاع میں تیری ہے زورِ نغمہ گری

تری دمک میں ہے بیداریِ عروسِ خیال تری جبیں پہ جھلکتا ہے شاعری کا کمال
لطیف جذبوں کی مادر ہے تیری سادہ روی

رباعی

جب فکر نے راہ پر لگایا مجھکو حکمت نے جب آئینہ دکھایا مجھکو
ذرات سے لے کے تا بہ انجم واللہ جز اپنے کوئی نظر نہ آیا مجھکو

جوش

اہلیا بائی

مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی

مرہٹہ سرداروں میں ملہار راؤ ہلکر کا نام تاریخ ہند میں بہت ممتاز ہے۔ یہ سترھویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا تھا۔ ابھی چار پانچ برس ہی کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی اپنی سسرال والوں سے اَن بن ہوگئی اور وہ اپنے کمسن بچے کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔ ملہار راؤ اپنے ماموں کیساتھ کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا اور کئی برس تک اسی کام میں لگا رہا۔ ملہار راؤ کے متعلق ایک عجیب وغریب روایت ہے جس نے گویا اُس کی کایا پلٹ کردی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ بہت دیر تک دھوپ میں کام کرتا رہا۔ جب تھک کر چور ہوگیا۔ تو آرام کرنے کے خیال سے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ ایک تو محنت کی تکان اور پھر آرام دہ سایہ اور ٹھنڈی ہوا، تھوڑی ہی دیر میں نیند آگئی۔ اسی اثناء میں اُس کا ماموں اپنا کام ختم کرکے گھر جانیکو تیار ہوگیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ملہار راؤ کا پتہ نہ تھا۔ سوچا کہ لڑکا گھر چلا گیا ہوگا۔ گھر پہنچا تو وہاں بھی نظر نہ آیا۔ اُس کے ماموں اور ماں دونوں کو تشویش ہوئی۔ دونوں کھیت پر پہنچے، اور بڑی تلاش وجستجو کے بعد اُس کو ایک درخت کے نیچے سوتے پایا۔ مگر اُنھوں نے ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھا۔ ایک کالا ناگ ملہار راؤ کے چہرہ پر سایہ کئے تھا۔ اِن لوگوں کے پہنچتے ہی سانپ وہاں سے چل دیا۔ اِس واقعہ نے اُس کے ماموں کو یقین دلا دیا کہ ملہار راؤ "بڑا آدمی" ہوگا۔ اُس نے ملہار راؤ کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ فوج میں اُس نے ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ پیشوا اُس پر لٹو ہوگیا۔ ملہار راؤ بہت جلد فوج کا کمانڈر ہوگیا اور مالوہ کا علاقہ اُس کو فوجی مصارف کے لئے دیدیا گیا۔

اہلیا بائی، ۱۷۳۵ء میں مالوہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اُسکے والدین غریب کاشتکار تھے برسوں تک اُن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ وہ بہت افسردہ اور مُلول خاطر رہتے تھے۔ اولاد کی اُنھیں بڑی تمنا تھی۔ جب اہلیا بائی پیدا ہوئی تو وہ بیحد خوش ہوئے۔ ایک پنڈت کو زائچہ بنانے کے لئے بُلایا تو اُس نے اہلیا بائی کے باپ سے کہا کہ تمہاری بیٹی کی شادی کسی راجہ کیساتھ ہوگی، اور وہ خود بھی بہت مشہور حکمران ہوگی۔ اہلیا بائی کے باپ کو پنڈت کی بات کا یقین نہ ہوا۔ وہ کہنے لگا کہ

ایک غریب کسان کی بیٹی اتنے بڑے مرتبہ پر کیسے پہونچ سکتی ہے؟

جب اہلیا بائی کی عمر نو برس کی ہوئی تو باپ کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لیکن اُسے کوئی خاطر خواہ لڑکا نظر نہ پڑا۔ اُسی زمانہ میں چند مرہٹہ سردار جو ایک لڑائی سے واپس آرہے تھے مالوہ سے گذرے، اور اتفاق سے اُسی گاؤں میں ٹھہرے جہاں اہلیا بائی رہتی تھی۔ اِن سرداروں میں ملہار راؤ ہلکر بھی تھا، جس کی نظر اہلیا بائی پر پڑ گئی۔ اُس نے اس لڑکی کو دیکھ کر تاڑ لیا کہ وہ بہت ذہین اور عقلمند ہے۔ اُس نے دریافت کیا کہ یہ کس کی لڑکی ہے؟ اتفاق سے اہلیا بائی کا گُرو بھی وہیں موجود تھا۔ اُس نے ملہار راؤ کو اہلیا بائی کے باپ کا نام بتایا اور اُس پنڈت کی پیشگوئی کا بھی ذکر کیا، جس نے اُس کا زائچہ بنایا تھا۔
یہ سُنکر ملہار راؤ بہت خوش ہوا۔ اُس نے اہلیا بائی کے باپ کو بُلا کر اُس کی شادی اپنے بیٹے کھانڈے راؤ کے ساتھ ٹھہرائی۔ کھانڈے راؤ بھی اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ ابتدائی رسوم تو اُسی وقت ادا ہوگئیں، اور ایک ماہ کے بعد پونا میں شادی ہوگئی۔

غریب اہلیا بائی اپنے جھونپڑے سے نکل کر اندور کے عالیشان محل میں پہونچی۔ اُس کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوگیا۔ اُس کے لئے اپنے ساس سُسر کو خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ایک غریب کسان کی لڑکی تھی اور ملہار راؤ اندور کا راجہ اور ایک جنگجو اور تُندمزاج سپاہی تھا۔ اُس کی بیوی گوتم ایک مغرور، چڑچڑی اور نازک مزاج عورت تھی، لیکن اہلیا بائی نے دونوں کی ایسی خدمت کی اور اِس قدر نیک دلی اور شیریں کلامی سے کام لیا کہ دونوں اُسے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھنے لگے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کھانڈے راؤ جو بہت ہی لاابالی تھا۔ اُس کے عادات و اطوار میں بھی نمایاں تبدیلی ہونے لگی۔ وہ اپنی بھی اصلاح کرنے لگا اور حکومت کے امور سے بھی دلچسپی لینے لگا۔

اہلیا بائی جب سن تمیز کو پہونچی تو محل کا سارا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کرنے لگی۔ گھرگرہستی کے کاموں سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ ہر کام کا ٹھیک وقت پر بندوبست کر دیتی تھی۔ اُس نے اپنی فہم و فراست سے محل کے تمام قدیم جھگڑے مٹا دئے اور خاندان کے سب لوگ آپس میں محبت سے رہنے لگے۔
اب سارا خاندان اُس کی عزت کرنے لگا۔ خاندان کا ہر فرد اُس پر جان نثار کرنے کو تیار تھا۔ ملہار راؤ پر جب اپنی بہو کی اعلےٰ قابلیتیں ظاہر ہوگئیں تو وہ روز بروز اُس پر حکومت کا بوجھ ڈالتا گیا۔

لیکن اہلیا بائی کو سہاگ کی خوشی بہت عرصہ تک نصیب نہ رہی۔ ابھی اُس کی عمر انیس سال [illegible] بھی نہ ہوئی تھی کہ اُسکا شوہر ایک مہم میں مارا گیا۔ اور وہ بیوہ ہوگئی۔ اُسوقت تک اُس [illegible] ہوئی تھیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام مالی راؤ اور لڑکی کا نام مُکتا بائی تھا۔ کھانڈے راؤ [illegible]

موت کا صدمہ ملہار راؤ کو تو تھا ہی، لیکن اہلیا بائی کی نظروں میں دُنیا تاریک ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنی جان دینے پر آمادہ تھی لیکن اُس کے خسر ملہار راؤ نے بڑی منت سماجت کرکے اُسے ستی ہونے سے باز رکھا۔ اُس نے کہا کہ کھانڈے راؤ مجھے اس بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ گیا۔ اگر تم نہ ہوگی تو میں کس کے بھروسے پر زندہ رہوں گا۔ میری ضعیفی کا خیال کرو اور رنج و غم کو دل سے دُور کردو۔ میں تمھیں اپنی اولاد کی طرح رکھونگا اور سارا راج پاٹ اور جو کچھ میرے پاس ہے، تمہارے سپرد کردوں گا۔

اہلیا بائی نے ستی ہونے کا ارادہ ترک کردیا اور اپنے شوہر کی جگہ اپنے خسر کی خدمت کرنے، اور حکومت کا کام سنبھالنے کو تیار ہوگئی۔ جب ملہار راؤ فوج لے کر لڑائی پر جاتا تھا تو اہلیا بائی حکومت کا انتظام خود کرتی تھی۔ اُس نے ہر کام کو ایسی قابلیت، دانائی اور ہنرمندی سے انجام دیا کہ ملہار راؤ نے حکومت کا تمام انتظام اُس کے سپرد کردیا۔

ایک دن آیا کہ ملہار راؤ بھی اِس دُنیا سے چل بسا۔ وفات کے وقت اُسکی عمر ۷۶ سال تھی۔ اُس نے چھیالیس برس تک بڑی ناموری اور شہرت کے ساتھ فوج کی کمان کی، اور مرہٹہ سرداروں میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ملہار راؤ کا اکلوتا بیٹا کھانڈے راؤ اپنے باپ کی زندگی ہی میں فوت ہوچکا تھا۔ لہذا اُسکا پوتا یعنی اہلیا بائی کا بیٹا مالی راؤ اندور کی گدی پر بیٹھا۔ لیکن نو ماہ کے اندر اندر وہ بھی چل بسا۔ سچ پوچھو تو اُس کا مرنا اندور کے حق میں بہت اچھا ہوا وہ بالکل نالائق تھا اور اُس میں ماں کے اوصاف نہ تھے بلکہ وہ اِسقدر ظالم اور بدخصلت تھا کہ جو کپڑے برہمنوں کو خیرات دیتا تھا اُنمیں بچھو رکھدیا کرتا تھا اور جب وہ ڈنک مارتے تھے تو برہمنوں کی تکلیف اور پریشانی دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اہلیا بائی اپنے بیٹے کے کرتوت دیکھ دیکھکر غم کے آنسو بہایا کرتی تھی۔ مالی راؤ نے ایک زردوز کو قتل کرادیا تھا جس کی بیگناہی قتل کے بعد ثابت ہوگئی۔ لوگ عام طور پر اُس زردوز کو صاحب کرامات سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے مالی راؤ کو اُس کے قتل سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اگر اُس کو قتل کیا گیا تو اُس کا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔ بیماری کے دِنوں میں مالی راؤ پر جب خفقان کی کیفیت طاری ہوتی تو لوگ یہی خیال کرتے کہ زردوز کی روح اُس پر مسلّط ہے۔ خود اہلیا بائی کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ دن رات مالی راؤ کے بستر سے لگی بیٹھی رہتی اور رو رو کر خُدا سے دعائیں مانگتی۔ لیکن سب بے سود۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی کہہ رہا ہے کہ اُس نے مجھے بلا قصور قتل کیا ہے، میں بھی اُسکی جان لے کر چھوڑوں گا۔

... مالی راؤ کے بعد گدی پر بیٹھتا۔ آخر اہلیا بائی نے ارادہ کیا کہ وہ خود

حکومت کرے ۔ اور حق یہ ہے کہ اُس سے زیادہ حکومت کی اہلیت کسی میں نہ تھی ۔ ساری رعایا اُس سے خوش تھی ۔ تاہم ایک شخص ایسا بھی تھا جو اہلیا بائی کی حکومت کے خلاف تھا ۔ یہ ملہار راؤ کا بدباطن وزیر گنگا دھر جسونت تھا ۔ اُس کی خواہش تھی کہ گدی پر کوئی نابالغ لڑکا بیٹھے اور میں اُس کی طرف سے حکومت کروں ۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حکومت پر خود قابض ہونا چاہتا تھا ۔ بہرحال اُس نے اہلیا بائی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ تم عورت ہو ، اتنی بڑی حکومت کا بوجھ تم سے نہ سنبھل سکیگا ۔ پھر حکومت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے تم اپنے مذہبی فرائض بھی ادا نہ کرسکو گی ۔ اندور کی رعایا عورت کی حکومت سے مطمئن اور خوش نہ ہوگی اور اگر کوئی لڑائی چھڑ گئی تو فوج کو میدانِ جنگ میں کیونکر لے جاؤ گی ؟ اس لئے اپنے خاندان کے کسی نابالغ لڑکے کو گدی پر بٹھا کر مجھے اُسکا ولی بنادو ۔ اگر ایسا نہ کرو گی تو دشمن چاروں طرف سے چڑھ آئیں گے اور عورت ہوکر تم اُن کا مقابلہ کیسے کرو گی ؟

لیکن اہلیا بائی بہت دلیر عورت تھی ، اور حکومت کے خطروں سے بھی اچھی طرح واقف تھی ۔ اُس نے کہا کہ "میں ایک راجہ کی بیوی اور دوسرے کی ماں ہوں ۔ وہ دونوں مرگئے اب قانونی طور پر حکومت میری ہے اس پر میں خود حکومت کروں گی ، کوئی اور نہیں ۔ اگر چاہوں گی تو کسی اور کو گدی پر بٹھا دونگی "۔

اہلیا بائی کے جواب سے گنگا دھر جسونت کی امیدوں پر پانی پھر گیا ۔ اُس نے پیشوا کے چچا رگھوبا کو لکھ بھیجا کہ اندور کی گدی پر آجکل ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے ۔ تم یہاں آؤ اور آکر حکومت پر قبضہ کرلو ۔ اہلیا بائی نے یہ کیفیت سُنی تو رگھوبا کو لکھا کہ اِس غلط اقدام سے باز رہئے ۔ یاد رکھئے کہ میں حکومت کی جائز حقدار ہوں اور یہ میرے ہی قبضے میں رہیگی "۔

رگھوبا پر طمع تو پہلے ہی غالب تھی ، اب وہ آپے سے باہر ہوگیا ۔ کہنے لگا کہ ملہار ہمارا ملازم تھا ۔ اُس کی بیوہ اب اتنی خودسر ہوگئی ، میں اِس عورت کا غرور توڑ کر رہونگا ۔ اُس کے بعد اُس نے اندور پر حملہ کرنے کے لئے فوج تیار کی ۔

اہلیا بائی نے بھی لڑائی کی تیاری کی ، اُس نے اپنے تمام سرداروں کو دربار میں طلب کیا ، اور انھیں جرأت دلاکر کہا کہ لڑنے کے لئے تیار ہوجاؤ ۔ اس کے بعد اُس نے تمام راجاؤں سے جنکو وہ اپنا دوست تصور کرتی تھی مدد کی درخواست کی ۔ وہ سب خوشی خوشی اُس کی مدد کو آپہنچے ۔ رگھوبا اندور کے قریب پہونچا تو اہلیا بائی کی زبردست فوج دیکھکر دنگ ہوگیا ۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اندور پر حملہ کرونگا تو اہلیا بائی میرے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگی اور مجھ سے رحم کی درخواست کرے گی ۔ لیکن یہاں پہنچ کر صورتِ حال کچھ اور ہی نظر آئی ۔ اُس نے دیکھا کہ خود میری فوج اہلیا بائی کی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ تاہم پلٹ جانے میں شرم مانع تھی ۔ اُس نے

اپنی خیریت بتانے کے لیے سپہ سالار تکوجی کو کہلا بھیجا کہ "میں لڑنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں نے مالی راؤ کے انتقال کی خبر سُنی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اُس کی بیوہ ماں حکومت کا سب انتظام تنہا کرتی ہے۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ اگر اُسے میری امداد کی ضرورت ہو تو چل کر اُسکا ہاتھ بٹاؤں"۔

اُس کے جواب میں تکوجی نے اس کا ثبوت طلب کیا تو رگھوبا چند رفقاء کو ساتھ لے کر اہلیا بائی کے لشکر میں چلا آیا۔ تکوجی نے اُس کا شاندار استقبال کیا۔ بعد ازاں اُس کو اہلیا بائی کی خدمت میں حاضر کیا۔ اہلیا بائی نے بھی اُس کے شایاں شان خاطر و مدارت کی اور اندور لے جا کر اپنا مہمان رکھا۔ رگھوبا کو یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ اہلیا بائی حکومت کے تمام کاموں کو اُسی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے، جیسے مرد انجام دیتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ اہلیا بائی سے اتحاد کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔ اس طرح گنگادھر جسونت کی تمام تدبیریں خاک میں مل گئیں اور وہ اندور کی سکونت ترک کرکے کسی اور طرف نکل گیا۔

اہلیا بائی کو اب کوئی کھٹکا نہ رہا۔ وہ اطمینان کے ساتھ اندور میں حکومت کرنے لگی۔ اُس کا زیادہ وقت حکومت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا، اور اپنی رعایا کی خوشحالی کے لیے وہ سخت محنت کرتی تھی۔ تاہم وہ اپنے مذہبی فرائض یا دھرم کے کاموں سے بھی غافل نہ تھی۔ وہ بہت سویرے اُٹھ کر پوجا پاٹھ میں مشغول ہوتی تھی۔ اُس سے فارغ ہو کر رامائن یا مہابھارت پڑھتی۔ اُس کے بعد غریبوں اور محتاجوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کرتی تھی۔ بعد ازاں کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر دربار میں آتی اور وزراء سے بات چیت کرکے حکومت کے تمام معاملات کا تصفیہ کرتی۔ جو شخص اُس سے ملنے آتا اور کچھ کہنا چاہتا اُسے فوراً بلا لیتی تھی اور اُس کی عرض و معروض کو نہایت توجہ و غور سے سُنتی تھی۔ غرض وہ دن بھر کام میں لگی رہتی تھی۔

غروب آفتاب کے وقت وہ پھر پوجا کرتی اور کچھ ناشتہ کرکے تھوڑی دیر آرام کرتی تھی۔ اس کے بعد نو بجے پھر حکومت کے کاموں میں مشغول ہوتی اور اکثر رات گئے تک اپنے وزراء سے صلاح و مشورہ کیا کرتی تھی۔

اہلیا بائی کی حکومت میں ہر طرف امن و امان تھا اور اندور کی رعایا ہر لحاظ سے خوش و خرم تھی۔ ملک کی تجارت اور پیداوار میں اتنی ترقی ہوئی کہ خزانہ میں بیشمار روپیہ جمع ہو گیا۔ جب اہلیا بائی نے دیکھا کہ خزانے میں ضرورت سے کہیں زیادہ روپیہ موجود ہے تو اُس نے روپے کو دھرم کے کاموں میں صرف کرنیکی تجویز کی۔ لیکن اسی کے ساتھ روپے کو وہ بلا ضرورت خرچ کرنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس کا سپہ سالار تکوجی فوجی جمعیت کے ساتھ جے پور کے مقابلہ کو گیا اور شکست کھائی۔ اُس نے اہلیا بائی کو [illegible] لیے لکھا۔ اہلیا بائی نے مطلوبہ رقم تو بھیج دی لیکن یہ بھی لکھدیا کہ آیندہ اور روپیہ ہرگز نہ بھیجا جائیگا

تم مقابلہ کرو اور فتح پاؤ۔ اگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا تو میں خود اگر دشمن کا مقابلہ کروں گی۔ اُس زمانہ میں اہلیا بائی کی عمر ۶۵ برس کی تھی۔

رگھوبا کی بدنیتی کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے کہ کس طرح اُسنے اندور پر قبضہ کرنیکی کوشش کی تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ اندور کے خزانے میں بیشمار دولت جمع ہے تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے کسی نہ کسی تدبیر سے روپیہ اینٹھنے کی فکر کی۔ آخر اُس نے قرض کے بہانے سے اُس روپے کو لینا چاہا' اور اہلیا بائی کے پاس پیغام بھیجا کہ آجکل روپے کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ اہلیا بائی اُس کے مطلب کو سمجھ گئی۔ اُس نے جواب دیا کہ "خزانے میں جو روپیہ موجود ہے وہ میری ذاتی ملکیت نہیں ہے ملکی ضروریات کے سوا کسی اور غرض سے میں اُس میں سے ایک حبہ بھی نہیں لے سکتی۔ لیکن تم برہمن ہو' اس لئے اگر چاہو تو خیرات کے نام پر تمہیں کچھ روپیہ دیا جا سکتا ہے"۔

اہلیا بائی کا جواب سُن کر رگھوبا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ "میں کوئی بھکاری برہمن نہیں ہوں کہ خیرات لوں' جو کچھ مجھے لینا ہے' خود آکر لے لوں گا"۔ اُس کے بعد فوج لے کر وہ پھر اندور کی طرف چلا۔ اِس بار اہلیا بائی نے اُس کے مقابلہ کے لئے فوج نہیں اکٹھا کی بلکہ ایک اور ہی تدبیر سے کام لیا۔ اُس نے سپاہیوں کی طرح خود ہتھیار لگائے اور پانسو مسلح عورتوں کو ساتھ لیکر رگھوبا کے مقابلہ کو چلی' ایک بھی مرد اُس کے ساتھ نہ تھا۔

راگھوبا نے یہ رنگ دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ اُس نے اہلیا بائی سے دریافت کیا "کیا یہی تمھاری فوج ہے؟ عورتوں سے میں کیسے لڑ سکتا ہوں"۔ اہلیا بائی نے جواب دیا کہ "میں مقابلہ کے لئے نہیں آئی ہوں۔ کسی زمانے میں اندور کے حکمران پیشوا کے نمکخوار تھے۔ اور آپ پیشوا کے چچا ہیں۔ آپ کے مقابلہ پر میں تلوار نہیں اُٹھا سکتی۔ البتہ آپ مجھے مار ڈالیں۔ پھر سب کچھ آپ کا ہے۔ لیکن جب تک میرے دم میں دم ہے' میرے خزانے سے ایک حبہ بھی آپ کو نہیں مل سکتا"۔ رگھوبا سے اب کچھ نہ بن پڑا' شرماکر چپ ہو گیا۔

اہلیا بائی کی زندگی کے آخری ایام میں اُسے ایک جانکاہ صدمہ سے دو چار ہونا پڑا۔ اُس کا داماد یعنی مکتا بائی کا شوہر فوت ہو گیا۔ تو مکتا بائی نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ اہلیا بائی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنے ارادہ سے باز رہے لیکن مکتا بائی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اہلیا بائی اُس کے قدموں میں گر گئی اور زمین پر لوٹنے لگی کہ دُنیا میں اُسے اکیلا نہ چھوڑ جائے۔ مگر وہ اپنے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہی۔ اُس نے کہا: "اماں! تم عمر طبعی کو پہونچ چکی ہو' برس دو برس میں تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا شوہر مر چکا ہے' اور پھر جب تم بھی مجھے چھوڑ جاؤ گی تو میرے لئے دُنیا میں کون سہارا باقی رہ جائے گا۔ میرے لئے یہی بہتر ہے کہ

عزت کے ساتھ دُنیا سے چل دوں"۔ مکتا بائی اپنی محترم والدہ کی آنکھوں کے سامنے ستی ہوئی۔ اِس دلدوز نظارے نے اُس کو بے حال کر دیا۔ اُس کو چپ لگ گئی، اور تین روز تک بے آب و دانہ پڑی رہی۔ اِس المناک حادثہ نے اہلیا بائی کو موت کے قریب پہنچا دیا۔ آخر ساٹھ برس کی عمر میں وہ بھی اِس دُنیا سے چل بسی۔ اُس کا شوہر کھانڈے راؤ جب اجمیر کے جاٹوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اُس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی۔ اُس کا بیٹا مالی راؤ گمراہ اور مخبوط الحواس تھا۔ لیکن اہلیا بائی نے ان باتوں کا اثر قبول نہ کیا، بلکہ اپنی زندگی کو اپنے مُلک اور مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ کھانڈے راؤ کی موت کے بعد اُس نے کوئی رنگین کپڑا اپنے بدن پر نہیں پہنا اور نہ کبھی زیورات سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ وہ ہر قسم کی آزمائشوں سے گھری ہوئی تھی، لیکن اُس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

اہلیا بائی کوئی خوبصورت عورت نہ تھی۔ لیکن اُس کی پاک زندگی اور اُس کی نیکیوں نے اُسے لوگوں کی نظر میں نور کی پُتلی بنا رکھا تھا۔ آخر وقت تک اندور میں اُس نے نہایت عقلمندی سے حکومت کی اور اُس کا ملک روز بروز ترقی کرتا گیا۔ اُس کے زمانۂ حکومت میں کئی بڑے بڑے شہر آباد ہوئے، جا بجا کنویں اور گھاٹ بنے، بہت سی سڑکیں بنیں اور مسافروں کے آرام و آسائش کے لئے بہت سے دھرم شالے تعمیر ہوئے۔ ان تدبیروں سے تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ مُلک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ اور سوداگر بے کھٹکے اپنا مال لاتے لیجاتے تھے۔ کوئی کسی پر ظُلم نہ کر سکتا تھا، نہ کہیں لوٹ مار ہو سکتی تھی۔ وہ بدمعاشوں کو بہت سخت اور عبرت انگیز سزائیں دیتی تھی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اہلیا بائی بڑی نیک اور اپنے مذہب کی نہایت پابند تھی۔ اُس کی مذہب پرستی کا یہ حال تھا کہ اُس نے دُور دُور کے مندروں میں روزانہ گنگا جل پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مزدور مقرر تھے۔ گنگا جل پہنچانا اُن کا کام تھا۔ ایک جگہ کا مزدور گنگا جل کا کلس دوسری جگہ کے مزدور کو پہنچاتا تھا۔ ہر مزدور اپنے آگے والے مزدور کو دے آتا۔ اِس طرح مندروں تک تازہ گنگا جل روزانہ پہنچ جاتا تھا۔

اہلیا بائی نے اپنے ملک کو تو فائدہ پہنچایا اسلئے وہ اپنی فیض رسانی کے باعث تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اُس کے قائم کردہ سدابرت ہندوستان کے بعض مشہور تیرتھوں میں آجتک قائم ہیں۔ اُس کی موت پر ہندو مسلمان سب اُسے یکساں طور پر روتے تھے، کیونکہ اُس کی ذات سے سب کو یکساں فائدہ پہنچتا تھا اور اُس کی تمام رعایا اُس پر اپنی جان دیتی تھی۔

جہانگیری اِنصاف

(از حضرت سحرؔ ہنگامی)

ایک دن نور جہاں پہونچی محل کے اوپر
اور لگی دیکھنے جمنا کا سہانا منظر

صبح کا وقت جو تھا ارض و سما پر طاری
تازہ دم ہو کے فضا کھیل رہی تھی یکسر

مچھلیاں بھی پئے تفریح وہیں دریا میں
اُٹھ کے پانی سے اُچھلتی تھیں اِدھر اور اُدھر

دیکھتے ہی یہ سماں، نور جہاں نے سوچا
آزمائش ہو نشانے کی کچھ اِس موقعے پر

لے لیا ہاتھ میں پھر اُس نے طپنچہ فوراً
ایک مچھلی پہ اُسی وقت پڑی جا کے نظر

اور اُسی وقت طپنچے کی کڑک سے ہر سو
ایک لمحے کو ہوا رنگِ سماں زیر و زبر

لیکن افسوس کہ چاہی ہوئی مچھلی کے بجائے
ایک دھوبی پہ پڑا جا کے نشانے کا اثر

جان سے اپنی ہی وہ ہاتھ غرض دھو بیٹھا
پارچے دھونے کو پانی میں گیا تھا جو اُتر

صدمۂ غم سے یکایک تڑپ اُٹھی دھوبن
پہونچی دربارِ شہی میں وہ ملول و مضطر

کی شہنشاہِ جہانگیر سے جا کر فریاد
اور رو رو کے کہا حالِ وفاتِ شوہر

اِس قدر رنجِ رعیّت سے ہوا دل کو الم
خود شہنشاہ کی آنکھوں میں بھی اشک آئے بھر

یہ ہوا حال مگر دیکھتے ہی دیکھتے پھر
آ گیا چہرۂ عالی پہ معاً رنگِ دگر

ہو کے سنجیدہ وہیں اُس نے طپنچہ اپنا
رکھ دیا ہاتھ پہ دھوبن کے بلا خوف و خطر

ساتھ ہی سینہ سپر ہو کے ہوا استادہ
اور یہ الفاظ ہوئے اُس کے دہن سے باہر

"اس طپنچے سے مجھے جلد ہی کر تو بھی ہلاک
تاکہ ہو جائے اب اس طرح مداوائے ضرر

کیونکہ انصاف کا بے شبہ تقاضا ہے یہی
بیوگی ہی میں ہو بیگم کی بھی اب عمر بسر!"

سُن کے اُس وقت جہانگیر کے منہ سے یہ بات
جو بھی موجود تھے دربار میں سب تھے ششدر

اور اُن سب سے بُرا حال تھا فریادی کا
یعنی دھوبن بھی کھڑی کانپ رہی تھی تھر تھر

آخرش اُس نے طپنچے کو پٹک کر اُس جا
یوں کہا ڈال کے قدموں پہ جہانگیر کے سر

"ہے شہنشاہ کا ارشاد بجا اور درست
ایسے انصاف کی تو چاہ نہیں مجھ کو مگر

جس سے یک گونہ رعیّت ہی کی حالت ہو جائے
بیوگی کی بھی زبونی سے زیادہ ابتر

پس یہ بہتر کہ اب اس حال میں جو کچھ گزرے
مجھ سی بس ایک ہی بیوہ پہ وہ سب جائے گزر"

سحرؔ البتہ شہنشاہ کی فیاضی سے
اپنے گھر لے کے گئی سیم و زر و لعل و گہر

ہندو مسلم سمجھوتہ کی تحریک اور اُس کی ابتدائی تاریخ

از مسٹر منظر رضوی

پچھلے کچھ دنوں سے مسٹر جناح اور پنڈت جواہرلال و مہاتما گاندھی سے ہندو مسلم سمجھوتہ کے سوال پر خط و کتابت ہو رہی تھی۔ اس کے بعد بمبئی میں مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی کی ملاقات ہوئی اور صیغۂ راز میں باتیں ہوئیں اس ملاقات میں کون کون مسئلے زیر بحث آئے۔ اس کے جاننے کے لئے کچھ دنوں اور انتظار کرنا پڑیگا۔[1] اس کے بعد سبھاش بابو اور مسٹر جناح میں بھی گفتگو ہوئی، اور ایک مرتبہ پھر مہاتما جی مسٹر جناح سے بات چیت کرنے ان کے بنگلے تشریف لے گئے، ورکنگ کمیٹی میں غور و فکر ہوئی اس تحریک کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس تحریک کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا بیجا نہ ہوگا۔

اس کا سلسلہ اُس وقت شروع ہوا تھا جب ۱۹۱۷ء میں ہوم رول کا گیت گایا جا رہا تھا۔ لکھنؤ کا معاہدہ کتنا ہی مایوس کُن کیوں نہ ہو مگر اس کا فوری نتیجہ کئی حیثیتوں سے کامیاب ثابت ہوا تھا، خاصکر اس اعتبار سے کہ جو لوگ بات چیت کرنے بیٹھے تھے وہ "کچھ کر کے" اُٹھے تھے مگر چند ہی سال کے بعد دلوں میں یہ بات سما گئی کہ کاغذ کی یہ ناؤ چلنے والی نہیں، اور اس سے عوام میں اتحاد نہیں ہو سکتا ہے۔ عوام کے مسئلے دوسرے اور خواص کے مسئلے دوسرے ہیں۔ ایک کے فائدے میں دوسرے کا نقصان ہے۔ اور سمجھوتوں کی باتیں جب کبھی ہوتی ہیں تو اس میں خواص ہی کے مسئلے آتے ہیں۔ اور لوگ ان خواص کے مسئلوں کو حل کرنے کے بعد توقع کرتے ہیں کہ پورے سماج، عوام کا مسئلہ حل ہو جائیگا اور عام لوگوں میں ملاپ ہو جائیگا تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری سمجھ کا فتور ہے۔ ہندو مسلم عوام میں ملاپ تو جبھی ہوگا جب اُن کو اپنے طبقاتی مفاد کا صحیح احساس و شعور ہو جائے۔ خیر اس ٹیڑھے سوال کو اس وقت چھوڑ دیئے۔

۱۹۱۷ء کے سمجھوتے کے بعد ہی ہندوستان میں بلوے اور عام لوگوں میں خون خرابہ ہونے لگا مسجد اور مندر کی کشمکش، تبلیغ و تنظیم، شدھی اور سنگٹھن کی گرم بازاری رہی، اور خوب خوں ریزی بھی ہوئی۔ گاندھی جی نے برت رکھا، لیڈروں میں ہلچل مچی، مولانا محمد علی نے بیان دیا، جواہرلال بولے، شردھانند کی آواز اُٹھی، اور دہلی میں اتحاد کانفرنس بیٹھی۔ اور اس میں شہری آزادی اور ضمیر کی آزادی کا اصول

---

[1] اب یہ تمام خط کتابت شائع ہو گئی ہے۔

تسلیم کیا گیا۔ مذہبی رسمیات کی ادائیگی میں کوئی روک ٹوک نہ ہو، قربانی اور جھٹکا، گائے اور سور، اذان اور سنکھ، نماز اور گھنٹہ، محرم اور درگا پوجا ان سب کو ادا کرنے کی ہر فرد بشر کو آزادی ہو، اور جو شخص یا جو فرقہ اس میں مداخلت کرے وہ مجرم اور گنہگار قرار پائے۔ ضمیر اور عمل کی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لینے اور اس پر عوام کی تربیت کرنے کے بعد بلووں کی وہ کثرت اور شدت بھی ختم ہو گئی، لیکن پھر بھی اکا دکا بلوے اور فسادات کی وارداتیں جاری رہیں۔

نہرو رپورٹ: نہرو رپورٹ پر ہندوستان میں کافی شور اور اودھم مچ چکا ہے مگر ہندو مسلم مسئلہ کی تاریخ سمجھنے کا یہ ایک پرانا اور اہم مسئلہ ہے۔

۱۹۲۷ء میں برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کو نئے نئے آئینی اصلاحات دینے کے لئے سائمن کمیشن مقرر کیا۔ اور لارڈ برکنہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا کہ وہ اپنا متحدہ مطالبہ پیش کریں۔ جناب موصوف کو ہندوستان میں اتحاد نہ ہونے پر بڑا غرور تھا۔ اور شاید آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستانی کبھی مل ہی نہیں سکتے۔ بہرحال اسی سال ۲۰ مارچ کو ہندو مسلم رہنماؤں کی باہمی گفت و شنید کے بعد بعض ممتاز مسلم رہنماؤں کا مسٹر جناح کی صدارت میں ایک جلسہ دہلی میں ہوا جس میں مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کیا گیا۔ یہ تجاویز جن کو مسلم تجاویز کہا جاتا ہے یہ ہیں:-

(۱) سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے،

(۲) پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے مطابق ہو۔

(۳) مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندگی کا تناسب ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

(۴) صوبہ سرحد اور بلوچستان کے ساتھ دوسرے اصلاحات یافتہ صوبوں کی طرح برتاؤ ہو۔

اس کے بعد ہی مسلم لیگ کا کلکتہ میں سر محمد یعقوب کی صدارت میں اجلاس ہوا جس میں مندرجہ بالا تجاویز مندرجہ ذیل دو نئی شرطوں کے ساتھ قبول کی گئیں:-

(۱) مذہبی آزادی۔

(۲) کسی جماعت کی تین چوتھائی ممبروں کی اکثریت سے مجلس آئین سازی کوئی تجویز یا ترمیم خارج از بحث ہو جائے۔

اس اضافہ کے بعد سے مسلم مطالبات کی فہرست آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور شرائط میں اضافہ ہوتا گیا۔

۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو مدراس کانگریس کی ہدایت کے مطابق سوراج کا دستور مرتب کرنے اور دوسرے مسئلوں پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا، اور مہینوں کے بحث و مباحثہ

اور غور و فکر کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ پر ۲۸۔ اگست ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں مندرجہ ذیل تجویز پیش ہوئی :۔

(۱) مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے لئے مشترک اور مخلوط طریقۂ انتخاب ہو۔

(۲) مجالس آئین ساز میں نشستوں کا کوئی تحفظ نہ ہو، لیکن جہاں کہیں مسلمان اقلیت میں ہیں اور صوبۂ سرحد میں غیر مسلموں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ یہ تحفظ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں بالکل اُن کی آبادی کے تناسب سے ہوگا۔ اور صوبہ سرحد میں بھی یہ تحفظ غیر مسلموں کی آبادی کے تناسب سے ہو۔

جہاں نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی وہاں وہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مزید نشستوں کے لئے بھی مقابلہ کرنے کا حق دیا جائے

(۳) یہ بھی تجویز ہوا کہ صوبوں میں :۔

(الف) پنجاب اور بنگال میں کسی فرقہ کے لئے نشستوں کا تحفظ نہ کیا جائے۔ لیکن سفارش کردہ تجویز پر دس سال تک عمل کرنے کے بعد اگر کوئی فرقہ خواہش کرے تو فرقہ وارانہ نیابت کے سوال پر دوبارہ غور کیا جائے۔

(ب) پنجاب اور بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کے لئے اُن کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں اور انھیں مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کا حق بھی دیا جائے۔

(ج) اسی طرح صوبۂ سرحد میں غیر مسلموں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں اور انھیں بھی مزید نشستوں کے لئے الکشن لڑنے کا حق رہے۔

۴) جہاں کہیں نشستوں کے تحفظ کی اجازت دس سال کی مقررہ مدت کے لئے ہو وہاں اس کے اختتام پر کسی فرقہ کی خواہش پر اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جا سکے گا۔

صوبوں کی نئی تقسیم اور اُن کے درجوں کے متعلق اس کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی :۔

(۱) حکومت خود اختیاری کے قائم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علٰحدہ صوبہ بنا دیا جائے، بشرطیکہ :۔

(ا) سندھ مالی اعتبار سے اپنے حکومتی اخراجات کا بوجھ سنبھال سکے یا کمی کی صورت میں سندھ کے باشندے نئے انتظام کی مالی ذمہ داریوں کے برداشت کرنے پر آمادگی ظاہر

(ب) سندھ میں حکومت کی شکل وہی ہو جو اس دستور کے ماتحت دوسرے صوبوں کی ہو۔
(ج) سندھ کی غیر مسلم اقلیت کو صوبہ کی اور مرکزی مجالس قانون ساز کی نیابت میں وہی رعایتیں حاصل ہوں جو دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو دی جائیں۔
(۴) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اور تمام نئے صوبوں میں جو دوسرے صوبہ سے علحدہ کرکے بنائے جائیں اُن کی حکومت کی وہی صورت ہو جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہو۔ (ملاحظہ ہو رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس)

مسلمانوں کی رائے

نہرو کمیٹی کے مسلمان ممبران سر علی امام اور مسٹر شعیب قریشی اس تجویز سے متفق تھے۔ لیکن کھلے اجلاس میں پنجاب کے مختلف فرقوں کی نمایندگی پر کچھ اختلاف ہوا، تاہم مولانا ظفر علی خاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور چودھری افضل حق نے اور سکھوں کے نمایندوں نے اس تجویز کو مان لیا اور پنجاب کے سوال پر سارا اختلاف ختم ہوگیا۔ مگر مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کو بعض امور سے اختلاف ہوا۔ کچھ دنوں بعد سکھوں نے بھی مخالفت شروع کردی کہ وہ اپنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ ہی مخلوط انتخاب کو قبول کریں گے ورنہ نہیں۔

اسی سال دسمبر میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں ہوا سر آغا خاں ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کو چھوڑنے کے تیرہ سال کی مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور آپ کی ہدایت و قیادت میں مسلمانوں کے "حقوق" کی ایک طویل فہرست مرتب ہوئی، اور نہرو رپورٹ کو اس بنا پر مسترد کرنے کی تجویز پاس ہوئی کہ "سکھ غیر برہمن اور پست اقوام نے اسے منظور نہیں کیا اور کانگریس نے بھی اُسے ایک سال کے لئے ملتوی کردیا تھا اور اس کے علاوہ مسلمانوں کے لئے وہ چنداں مفید بھی نہیں"۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس دہلی میں مسٹر جناح کی زیر صدارت ہوا مسلم لیگ کا ایک بازو جس میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ شامل تھے نہرو رپورٹ کے بجنسہٖ قبول کرنے کا حامی تھا۔ دوسرا اس ترمیم کے ساتھ کہ مرکز میں نشستوں کا تحفظ کردیا جائے۔ مسٹر جناح ان دونوں بازوؤں میں سمجھوتہ کرانا چاہتے تھے۔ مگر یہ اجلاس شور و غل میں ختم ہوگیا۔

کانگریس کا فیصلہ

کانگریس نے سکھوں اور کچھ مسلمانوں کی مخالفت کے پیش نظر اپنے ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں اس تجویز کو ان الفاظ کے ساتھ مسترد کردیا:-
"کانگریس کا عقیدہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کو بالکل ہی قومی اصولوں

حل کیا جا سکتا ہے، اور چونکہ نہرو رپورٹ کی سفارشات پر سکھوں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے، اس لئے کانگریس مسلمانوں، سکھوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ مستقبل کا کوئی دستور اساسی کانگریس کے لئے قابل قبول نہ ہوگا اگر اس سے اقلیتوں کو اطمینان نہ ہوتا۔

اسی سال کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کا حسب ذیل خاکہ مرتب کیا، اور گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے لندن جانے لگے تو انھیں ہدایت کی کہ اسی بنیاد پر فرقہ وارانہ سمجھوتہ کریں یا اگر اس طرح سمجھوتہ نہ ہو تو جس طرح وہ چاہیں اس مسئلہ کو حل کر دیں۔ وہ خاکہ یہ ہے:-

(۱) (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے متعلق دفعہ میں اقلیت کی تہذیب، زبان، رسم الخط، تعلیم، مذہبی عقائد و رسمیات اور مذہبی اوقاف کی حفاظت کی ضمانت کر دی جائے۔

(ب) دستور اساسی میں قانون شریعت (Personal Law) کی حفاظت کے لئے ایک خاص دفعہ رکھدی جائے۔

(ج) وفاقی حکومت اقلیتوں کے سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار اور مجاز ہو۔

(۲) ووٹ کا حق ہر بالغ عورت و مرد کو دیا جائے۔

(نوٹ) کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ ہر صورت میں حق رائے دہی یکساں ہوگا اور اُسے اتنی وسعت دی جائیگی کہ مختلف فرقوں کے رائے دہندوں کی تعداد اُن کی آبادی کی مناسبت سے ہو۔

(۳) (الف) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ نمایندگی ہو۔

(ب) ہندوؤں کے لئے سندھ میں، مسلمانوں کے لئے آسام میں، سکھوں کے لئے پنجاب اور صوبہ سرحد میں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ہر اُس صوبہ میں جہاں اُن کی تعداد پچیس فیصدی سے کم ہو صوبوں کی مجلس اور وفاقی مجلس آئین ساز میں اُن کی آبادی کے اعتبار سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں، اور انھیں اس کا بھی حق ہے کہ وہ دوسرے فرقہ کے اُمیدواروں کا مقابلہ کر کے مزید نشستیں حاصل کریں۔

(۴) فیڈریشن حکومت اور صوبجاتی وزارت کی ترتیب کرتے وقت اقلیتوں کی شمولیت کا حق رواج کی حیثیت سے مان لیا جائے۔

(۵) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومت اور نظم و نسق کی وہی صورت ہو جو دوسرے صوبوں کی ہو۔

(۶) سندھ ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ بشرطیکہ باشندگانِ سندھ نئے صوبہ کے اخراجات کا بوجھ کا اُٹھانے کو تیار ہوں۔

(۷) ملک آئندہ دستورِ اساسی وفاقی ہوگا۔ اور فاضل اختیارات (Residuary Powers) ان صوبوں کو حاصل ہوں جو فیڈریشن کے جزو ہوں۔

گول میز کانفرنس گاندھی جی نے لندن روانہ ہوتے وقت اس بات کا اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کے ہر متحدہ مطالبہ کو چیوں کا تیوں مان لیں گے۔ اس پر مسلمانوں کے ہر خیال کے نمایندوں میں بھوپال میں گفتگو ہوئی پھر یہ لوگ شملے میں ملے۔ لیکن شملہ کا ماحول اور اس کے اثرات اتحاد کی کوششوں کے ناموافق ثابت ہوئے، بقول ڈاکٹر انصاری مرحوم:-

> شاید اگر مسلم کانفرنس کے بزرگوں کو تنہا چھوڑ دیا جاتا تو اُن کا فیصلہ کچھ اور ہی ہوتا۔ لیکن بڑی بڑی طاقتیں پس پردہ اپنا زور صرف کر رہی تھیں۔ اور مصالحت کی جو باتیں امید افزا حالات میں شروع ہوئی تھیں وہ ان مسموم اثرات کے تحت ختم ہوگئیں۔"

گاندھی جی انھیں مایوس کن حالات میں لندن پہونچے، جہاں ہر فرقہ نے اپنی اپنی جنس کی قیمت بڑھا رکھی تھی اور وہ خرید و فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سمجھوتے اور مصالحت جس رواداری سے ہوتے ہیں وہ وہاں مفقود تھی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں سے لندن میں یہ بھی کہا کہ ہم آپ کے سارے مطالبات مان لیں گے بشرطیکہ آپ (۱) کانگریس سے مل کر آزادی کے لیے جد و جہد کریں جس میں خود مسلمانوں کا بھی فائدہ ہے (۲) قوم پرست مسلمانوں سے مشورہ کیا جائے، اور رائے متفقہ فیصلہ ہو۔ (۳) دوسری اقلیتوں کے مفاد کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مسلم نمایندوں نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کیا۔ وہ یہ شرط ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے کہ قوم پرست مسلمانوں میں سے کسی کو گول میز کانفرنس میں بُلایا جائے۔ برٹش حکومت رجعت پسند طاقتوں کو مضبوط رکھنے کے لئے قوم پرست مسلمانوں کو گول میز سے علیحدہ کر رکھا تھا اور گول میزی مسلمان اسی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے تھے۔

لندن میں ایک موقع پر گاندھی جی اور مسٹر جناح سے بھی باتیں ہوئیں اور سمجھوتہ کا کافی امکان پیدا ہوگیا مگر اسوقت دوسرے رجعت پسند اور فرقہ پرست ہندوؤں نے اس میں رکاوٹ

ڈالدی اور ساری باتیں درہم برہم ہوگئیں۔

الہ آباد اتحاد کانفرنس | بہر حال لندن میں سمجھوتہ کی کشتی کو ڈگمگاتا دیکھکر ہندوستان میں کانگریسی مسلمانوں نے اتحاد کی بات چیت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود، مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خاں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مسٹر جناح کے تیرہ نکات کو مخلوط انتخاب کے ساتھ مان لیا جائے، اور اسی کی بنیاد پر ہندوؤں اور کانگریس سے گفتگو کی شروعات کی جائے۔

اس کے بعد الہ آباد میں اتحاد کانفرنس کا اجلاس ہوا، جس میں یہ تجاویز منظور ہوئیں:-

(۱) مخلوط طریقۂ انتخاب اس شکل سے رائج ہو کہ جس اُمیدوار کو اپنے فرقہ کے تیس فیصدی ووٹ ملیں اور مخلوط ووٹوں میں سے بھی اُسے سب سے زیادہ ووٹ ملیں وہ کامیاب سمجھا جانے۔

(۲) بنگال میں مسلمانوں کو اکیاون ۵۱ فیصدی نشستیں دی جائیں۔

(۳) پنجاب میں مسلمانوں کو اکیاون ۵۱ فیصدی، ہندوؤں کو ستائیس ۲۷ فیصدی، سکھوں کو بیس ۲۰ فیصدی ہندستانی عیسائیوں کو تین اور یوروپین وغیرہ کو ایک فیصدی نشستیں دی جائیں[۱]۔

(۴) اگر حکومت کی کسی تجویز کو کسی اقلیت کے تین چوتھائی ممبر اپنے حق میں مضر سمجھیں تو وزارت بصورت اتفاق رائے اس تجویز کو واپس لے لے اور اگر وزارت کو اس سے اتفاق نہ ہو تو اس معاملہ کو ایک خاص عدالت میں پیش کردے اور اس کے فیصلہ کی پابند ہو۔ فیصلہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں وزارت مستعفی ہو جائے۔

(نوٹ) اس عدالت کی تشکیل مرکزی حکومت کے ذمہ رکھی گئی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ اس میں ہائی کورٹ کے تین ہندوستانی جج ہوں، اس کے دو جج کسی ایک فرقہ کے نہ ہوں مگر ایک جج مدعی فرقہ کا ضرور ہو۔

(۵) سندھ کو ایک علٰحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور اس کو وہ تمام اختیارات دیدیے جائیں جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں[۲]۔

(۶) مرکزی وزارت میں مسلمانوں کی کافی تعداد اور رواج کی حیثیت سے ایک سکھ بھی شامل کیا جائے۔

---

[۱] کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ بنگال میں مسلمانوں کو ۴۸٫۴ فیصدی اور پنجاب میں ۴۴ فیصدی کے قریب نشستیں ملی ہیں، اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی آئینی اور آزادانہ اکثریت ختم ہو چکی ہے۔

[۲] اسی وقت وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس سمجھوتہ کو دیکھکر فوراً ہی سندھ کی علٰحدگی کا اعلان کردیا۔

اس کے بعد ۲۔نومبر کو مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلما، کانپور کا ایک مشترکہ جلسہ سر عبداللہ سہروردی کے زیر صدارت ہوا۔ اب تک یہ حضرات مسٹر جناح کے چودہ نکات کے زبردست حامی تھے۔ لیکن جب الٰہ آباد میں مسٹر جناح کے مطالبات کی بنیاد پر ہندو مسلم سمجھوتہ ہو گیا اور مسلمانوں کے متحدہ اور مشترکہ مطالبات پورے ہو گئے، تو ان حضرات نے "ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ" کی حیثیت سے یہ نئے شاخسانے نکالے:۔

(۱) آسام میں چالیس فیصدی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

(۲) مدراس میں مسلمانوں کا تحفظ (؟)

(۳) دلّی اور اجمیر سے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم نمائندہ ضرور انتخاب کیا جائے۔

(۴) بہار واڑیسہ میں مسلمانوں کے لئے ۲۷ فیصدی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

اسی کے ساتھ بنگال ہندو سبھا نے بھی اس سمجھوتہ کے اس حصہ سے جس کا تعلق بنگال سے تھا ماننے سے انکار کردیا اور اپنے خاص مطالبات پیش کئے جو یہ ہیں:۔

(۱) بنگال کونسل میں فرقہ وارانہ اصول پر کوئی نشست محفوظ نہ کی جائے۔

(۲) دس برس کے بعد تمام تحفظات بالغانہ حق رائے دہی کی شرط کے بغیر ختم کردیئے جائیں۔

(۳) بالغانہ حق رائے دہی کے لئے دونوں فرقے مل کر جدّ و جہد کریں۔

(۴) تمام چناؤ عام مشترک حلقوں سے ہو۔

اس شور و کہرام اور واویلا کو ختم کرنے کے لئے ایک اور فارمولا نکالا گیا۔

"بنگال میں دس سال کے لئے مسلمانوں کی آئینی اکثریت منظور کی جائے، بشرطیکہ دونوں فرقے مل کر اس فاضل اور ناجائز ویٹیج کو جو یورپین فرقہ کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملے ہیں کم کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمانوں کو مستقل آئینی اکثریت اور ہندوؤں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی حاصل ہو جائے۔"

مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء کانپور نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں سیدھے ۵۱ فیصدی مل جانا چاہیئے۔

مسٹر محمد علی جناح اور بابو راجندر پرشاد سابق صدر انڈین نیشنل کانگریس کی جو گفتگو ۱۹۳۴ء کے اخیر اور ۱۹۳۵ء کے شروع میں ہوئی تھی وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی تھی۔ اس وقت مرکزی اسمبلی میں مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر بحث ہونے والی تھی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ اگر کانگریس

کی اسمبلی پارٹی نے اِس رپورٹ کو مسترد کر دیا تو کمیونل ایوارڈ ختم ہو جائیگا۔ کانگریس اس کمیونل ایوارڈ کے متعلق بمبئی ہی کے اجلاس میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اسے ملک، قومیت اور مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتی ہے، لیکن جب تک مختلف فرقوں میں کوئی مناسب و متفقہ سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک وہ کمیونل ایوارڈ کے سوال پر غیر جانبدار رہیگی، اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کو اور دوسری اقلیتوں کو نقصان پہونچیگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسمبلی میں جب اس مسئلہ پر مباحثہ ہوا تو کانگریس کے تمام ممبر کمیونل ایوارڈ پر غیر جانبدار رہے، اور نہ مخالفت اور نہ موافقت کسی طرف ووٹ دیا۔ اس سے مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی اور کمیونل ایوارڈ منظور ہو گیا۔ جناح راجندر گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) حق رائے دہی کی اس طرح ترتیب کی جائے کہ اس میں مختلف فرقوں کی آبادی کے تناسب کا لحاظ کر لیا جائے۔ اور صوبوں اور مرکز دونوں کی فہرست رائے دہندگان میں یہ لحاظ رہے۔ اور جہاں کہیں ضرورت ہو اختلافی حق رائے دہی (Differential Fanchise) کا طریقہ بھی رائج کیا جائے۔

(۲) انتخاب کے حلقوں کو اور ووٹروں کو منتشر نہ رکھا جائے۔

(۳) پنجاب میں جو نشستیں مختلف فرقوں کو دی گئی ہیں اُن کے حلقے بناتے وقت پہلے سکھوں اور پھر ہندوؤں کو موقع دیا جائے کہ وہ کمیونل ایوارڈ کے رُو سے اپنی اپنی نشستوں کے لئے حلقے منتخب کر لیں، اور بقیہ حلقے اسی ایوارڈ کی رو سے مسلمانوں، ہندوستانی عیسائیوں یوروپین اور اینگلو انڈین کے حوالے کر دئیے جائیں۔

(۴) بنگال میں یوروپین فرقہ سے جو نشستیں حاصل ہوں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ ہندو مسلمان یوروپین فرقہ سے نشستیں واپس لینے کی متفقہ جدوجہد کریں جو نشستیں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملی ہیں اُن میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

(۵) دوسرے صوبوں میں جو جگہیں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملیں وہ بھی محفوظ رکھی جائیں۔

(۶) اسی طرح مرکزی اسمبلی میں جو جگہیں مسلمانوں کو ملی ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گی۔

(۷) تمام صوبوں اور مرکز میں جداگانہ انتخاب کے بدلے مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔

بنگالی ہندوؤں کو مسٹر جناح اور شری راجندر پرشاد کے اس آپسی سمجھوتہ پر یہ اختلاف تھا کہ :-

(۱) اختلافی حق رائے دہی کا وجود نہ ہو۔
(۲) بنگال میں نشستوں کی نئی تقسیم ہو۔
(۳) مرکز میں مسلمانوں کو ⅓ ۳۳ ملے۔
(۴) تحفظات کے لئے مدت کی قید ہو۔

مسٹر جناح اِن باتوں میں سے کسی کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ تب راجندر بابو نے یہ کہا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اسی سمجھوتے کی بنیاد پر سمجھوتہ ہو جائے اور کانگریس اور مسلم لیگ مل کر اس کے لئے جدوجہد کریں، اور فرقہ پرستوں کو دبائیں۔ مگر مسٹر جناح نے اسے بھی منظور نہیں فرمایا۔ حالانکہ خود انہیں نے گفتگو کی ابتدا میں کہا تھا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ مل جائیں تو فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کو دبا سکتے ہیں۔ اور انھوں نے اس کی شکایت بھی کی کہ کانگریس ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی لیکن جب راجندر بابو تیار ہوئے تو خود کھسل گئے۔

اب اِن تمام امور کو اپنے پیش نظر رکھئے، اور سمجھوتہ کی جو گفتگو حال میں شروع ہوئی ہے اس کا بغور مطالعہ کرتے رہئیے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس معاملے میں رجعت پسند حضرات کیسے کیسے رنگ بدلتے رہے ہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اس نام نہاد سمجھوتہ میں عوام کی بے روزگاری، جہالت اور صحت کی حالت سدھارنے کا سوال پیدا نہیں ہوا، اور نہ اس پر غور کیا گیا۔ بلکہ اسمبلیوں کی ممبری وزارتیں اور اسی قسم کے دوسرے سوالات پر سوچ بچار کیا گیا، پھر ان سمجھوتوں سے عوام کی اقتصادی اور اخلاقی بدحالی کیسے دُور ہو سکتی ہے۔

رُباعیات

جاری ہے گلوں کے درمیاں گفت و شنود — موضوع مکالمت ہے "انجام نمود"
کھلتی ہوئی کلیوں پہ ہے شبنم دمِ صبح — اِک موجِ تبسّم ہے مگر رشک آلود

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں — جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سُننے والے تمام ہو جاتے ہیں — افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

جوش

ہنگامۂ الہ آباد

(از مسٹر مدھر بہاری لال سریواستو)

یہ نظم الہ آباد کے ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ آئے دن کے افسوسناک ہنگاموں اور باہمی کشت و خون سے تنگ آکر پرجوش شاعر نے ہندو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر جو اظہار خیالات کیا ہے وہ بلاکم و کاست ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

اے الہ آباد اے پیشانیٔ گیتی کے داغ ۔۔۔ فتنہ پردازی کے گہوارے خصومت کے چراغ
اے سیہ رو۔ کینہ پرور، بے حیا و کج دماغ ۔۔۔ ہند کی بدبختیوں کا تجھ سے چلتا ہے سُراغ

مرکز کبر و ریا دارالعلوم کشت و خوں
بڑھ گیا حد سے زیادہ جاہلیت کا جنوں

اے الہ آباد۔ اے پروردۂ گنگ و جمن ۔۔۔ دھنس گئی تحت الثریٰ تک تیری بنیادِ کہن
گرد ہانِ دیر و کعبہ کی ہے تازہ انجمن ۔۔۔ کر دیا پامال شمشیرِ تعصب نے چمن

ایک ہلچل سی مچی ہے کوچہ و بازار میں
لگ گئی ہے آگ تیرے ہر در و دیوار میں

یاد کر وہ دن کہ ہندوستان کا فرمانروا ۔۔۔ پیکرِ حسن محبت یعنی ہر شش پارسا
سال میں اک بار آتا تھا پئے جود و سخا ۔۔۔ اور یوں مضبوط کرتا تھا اہنسا کی بنا

کوشش پیہم سے آخر یہ ہوا انجام کار
پھوٹ نکلا پتھروں سے بھی محبت کا شرار

جلوۂ معنی کی تیری بزم میں تھی روشنی ۔۔۔ میہمانوں کو ترے ملتا تھا درس آگہی
ہر طرف چھایا ہوا تھا ایک کیف بیخودی ۔۔۔ تیری بستی میں نہ تھی آلائشِ فتنہ گری

انسیت کی برق پہلو میں ترے تھی بیقرار
تھی شریک حال تیرے رحمت پروردگار

رہ نوردانِ حقیقت کا تو ہی مسکن رہا ۔۔۔ گوہرِ الفت کا اک نایاب تو خرمن رہا
گو ازل سے ہی فلک انسان کا دشمن رہا ۔۔۔ پھر بھی پھولوں سے بھرا ہر ایک کا دامن رہا

تجھ میں طرفہ زندگی تھی شورِ نوشانوش سے
عالم امکاں کی زینت تھی تری آغوش سے

حیف تیرا آج وہ دلکش سماں باقی نہیں   خار و خس باقی ہیں لیکن گلستاں باقی نہیں
تیری بزمِ خاص کے آتش بجاں باقی نہیں   گرد باقی رہ گئی ہے کارواں باقی نہیں

عظمتِ دیرینہ تیری ہو گئی خوابِ خیال
دیکھتے ہی دیکھتے جاتا رہا تیرا جمال

ہو گیا رخصت یکایک تیرے گلشن کا نکھار   ہو گئے کافور تیرے آہ وہ لیل و نہار
پڑ گیا تجھ پر بھی آخر کار دستِ روزگار   چار سو تیری تباہی کے نشاں ہیں آشکار

چل رہی ہے تیری آبادی میں وہ بادِ خلاف
جس نے برپا کر دیا ہنگامۂ جوشِ مصاف

محفلِ رنگیں میں تیری جمع ہیں وہ بد نہاد   شغل بیکاری ہے جن کا سر بسر فتنہ فساد
اپنے آپے میں نہیں پی کر مئے بغض و عناد   خونِ ناحق کو سمجھتے ہیں تقاضائے جہاد

جذبۂ غارت گری میں اس قدر ہیں بد حواس
اُن کو جیسے عاقبت کا کچھ نہیں بیم و ہراس

اُن کے دل میں نوعِ انساں کی کوئی وقعت نہیں   آہ ان میں نام کو بھی جذبۂ الفت نہیں
بھائیوں پر رحم کرنا داخلِ فطرت نہیں   قوم مٹتی جا رہی ہے اور کچھ غیرت نہیں

کر رہے ہیں آہ بیبا کانہ محشر خیزیاں
اور سمجھتے ہیں روا ہیں مذہباً خونریزیاں

ہو چکے ہیں حیف یکسر گند ان کے جبلیات   کچھ نہیں ان کے رگ و ریشہ میں انسانی صفات
کرتے ہیں سفاکیوں سے یہ ادا فرضِ حیات   فخر کا باعث سمجھتے ہیں جہاں میں اپنی ذات

وضعداری و مروت کا بیاں کیا ذکر ہے
ندیاں خوں کی بہیں بس اتنی اُن کو فکر ہے

اے الہ آباد کے بے شرم مردِ روسیاہ   یہ نزاعِ باہمی اور اُس پہ آزادی کی چاہ
دیکھ اور کچھ فہم انساں قوم کا حالِ تباہ   اپنی بربادی کا باعث ہے تو ہی بے اشتباہ

کس قدر ہے شرم آگیں حیف تیری زندگی
خاک میں تو نے ملا دی ساری عظمت ہند کی

"دون گھاٹی کی لڑائیاں"

(از حافظ محسن محی الدین عباسی)

کوہ کلنگا دیرہ دون سے تقریباً تین میل مشرقی سمت واقع ہے جس کے قریب سپیا نامی ایک رو یعنی پہاڑی ندی بہتی ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر گورکھوں نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزی فوجوں نے ۱۸۱۵ء میں منہدم کر دیا۔ پہاڑ کی بلند و ہیبت ناک چوٹیاں دون گھاٹی کے قدرتی مناظر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ لیکن آج کھنڈرات کے سوائے وہاں کچھ بھی باقی نہیں ہے۔

پہاڑ کے نشیب میں شہر دیرہ دون سے کچھ ہی دور پر سپیا ندی کے بائیں کنارے ایک یادگار ان لوگوں کے نام پر قائم ہے جو دون گھاٹی کی لڑائیوں میں کھیت رہے تھے۔ کوہ کلنگا کی شہرت محض دیرہ دون یا اس کے قرب و جوار تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی عظمت و شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسی مقام پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اس پہاڑی زرخیز خطہ پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا یا گورکھوں کا۔ کلنگا کی لڑائی کے بعد ہی دون کی ساری گھاٹیاں انگریزوں کے قبضے میں آ گئیں۔

عرصہ دراز سے دون کا سبزہ زار اور اس کی گھاٹیاں راجہ گڑھوال کے ماتحت تھیں لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں گورکھوں نے ان راجاؤں پر جو نیپالی سرحد کے قریب حکمرانی کر رہے تھے۔ حملے شروع کر دئے اور ۱۸۰۳ء میں کمایوں گڑھوال اور سرمور ناہن پر قبضہ کر لیا۔ تقدیر کی یاوری محض دس سال ہی تک رہی اور اس اثناء میں "دون کی گھاٹیوں" کی حالت بد سے بدتر ہو گئی اور بدانتظامی و بدنظمی کی وجہ سے سالانہ محاصل کی مقدار صرف بیس ہزار رہ گئی۔ گورکھے توسیع سلطنت کے خواب پورے نہ کرنے پائے تھے کہ جنوب مشرق سے انگریزوں کے حملے شروع ہو گئے جس کا سبب ایک سرکاری پولس افسر کا قتل بتلایا جاتا ہے۔ جس پر لارڈ ہیسٹنگ[۱] نے جو اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل تھے لڑائی کے احکام جاری کر دئے۔ میجر جنرل مارلی وٹ[۲] کو حکم دیا گیا کہ وہ آٹھ ہزار سپاہ لیکر کھٹمنڈو تسخیر کر لیں۔ اور میجر جنرل ووڈ[۳] کو حکم ملا کہ وہ چار ہزار فوج سے گورکھپور پر چڑھائی کر دیں۔ اس کے علاوہ میجر جنرل اختر لونی[۴] کے لئے یہ حکم نافذ ہوا کہ وہ گورکھوں کے ان ممالک پر حملہ کر دیں جو ستلج اور جمنا کے درمیان

Major General Marlywitt.[۲] Lord Hastings.[۱]
Major General Ochterlony.[۴] Major General Wood.[۳]

ی اثناء میں میجر جنرل گلسپی[ط] ساڑھے تین ہزار فوج لیکر دیرہ دون کی طرف چل کھڑا ہوا۔ کمانڈر
۔نلمہ تھا پہ جب یہ خبر سُنی کہ انگریزوں کی کثیر فوجیں دیرہ دون کی طرف آرہی ہیں تو وہ اپنی مختصر سی
ع لیکر کلنگا کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگیا۔

انگریزوں کی فوجیں دُون کی گھاٹیوں میں ہر دو جانب سے روانہ کی گئیں درّہ سوھنڈ گھاٹ اور
ملی گھاٹ میں ہوکر دونوں فوجیں ۲۴ راکتوبر ۱۸۱۴ء کو مل گئیں۔ گورکھے قلعہ کلنگا میں محصور تھے۔
اور انگریزی فوج کے سپہ سالار نے گورکھوں کو اس محفوظ و مضبوط قلعہ سے نکال باہر کرنے کا مصمم ارادہ
کرلیا تھا اس لئے ۳۱ راکتوبر ۱۸۱۴ء کو قلعہ کلنگا پر حملے شروع کردئے گئے۔

پہاڑی راستوں سے ناواقفیت اور گورکھوں کی بہادری کے باعث انگریزوں کو پہلی دفعہ
ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ ان کی بہت سی فوج بھی تباہ ہوئی اور میجر جنرل گلسپی خود بھی مارا گیا۔

ایک ماہ تک مسلسل اسی خیال سے انتظار کیا گیا کہ شاید قلعہ کے محصورین خود ہی انگریزوں کے رحم و
کرم کا خیال کرتے ہوئے اپنے کو حوالہ کردیں لیکن گورکھوں کے عزم و استقلال میں مطلق کوئی فرق نہ آیا۔
اور وہ بدستور قلعہ بند رہے۔ اب انگریزوں کے حملے اور بھی زوروں کے ساتھ شروع ہوگئے۔ قلعہ کو چاروں
طرف سے گھیر لیا گیا مگر یہ حملہ بھی ناکامیاب رہا اور بہت سے سپاہی ضائع ہوئے۔ حملہ کے تین روز بعد
قلعہ پر سخت گولہ باری شروع کردی گئی۔ ۳۰ رنومبر کو بہادر گورکھوں نے قلعہ کو چھوڑ دیا کیونکہ ان کے پاس
پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اسلئے وہ اپنے سامنے سے حملہ آوروں کو چیرتے کاٹتے نکل گئے۔ بہت سے
سپاہی راستے ہی میں مرگئے۔ بقیہ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے یہاں ملازمت کرلی بعد
کو یہ سب کے سب افغانوں کے مقابلہ میں لڑکر مارے گئے۔

میجر جنرل اخترلونی[ط] نے تمام دُون کی گھاٹیوں اور سرمور ناہن کو فتح کرلیا۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی گورکھوں کی
تمام طاقت ختم ہوگئی اور ۱۷ نومبر ۱۸۱۵ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیرہ دون اور دون گھاٹی کا اضافات
سہارنپور تک الحاق کا اعلان کردیا۔ اور مسٹر کالورٹ[ط] کو اسسٹنٹ کلکٹر مقرر کرکے انھیں کلکٹر سہارنپور
کے ماتحت کردیا۔ اس طرح بقیہ حصۂ ممالک بھی جو گڑھوال اور سرمور ریاست کے نام سے موسوم ہے۔
گورکھوں سے چھین لیا گیا اور ان کے اصلی حکمرانوں کو دے دیا گیا۔ اور دُون کی گھاٹی کمایون اور گڑھوال
کا وہ حصہ جو "برٹش گڑھوال" کے نام سے مشہور ہے انگریزوں کے قبضہ میں رہا۔

جنگ کلنگا کے میدان میں ایک یادگاری کتبہ اب بھی قائم ہے جس میں عبارت ذیل درج ہے۔

Major General Ochterlony. & M.G. Gillispie. [ط]

"پہاڑ کی بہت اونچی چوٹی پر اس یادگار کے قریب قلعہ کلنگا واقع ہے۔ جو دو حملوں کے (۳۱ اکتوبر ۱۸۱۴ء کو اور ۲۷ نومبر کو ہوئی) انگریزوں نے ۳۰ نومبر ۱۸۱۴ء کو فتح کر کے مسمار کر دیا۔
یہ عبارت اُن جانبازوں اور ہمارے بہادر دشمن بلبعدر سنگھ تھانہ کے یادگار میں لکھی جاتی ہے جو قلعہ کلنگا کے کمانڈر تھے اور بعد میں رنجیت سنگھ کے ماتحتی میں نوکری کر کے افغانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔"

اس لڑائی کے بعد انگریزوں کے تعلقات گورکھوں کے ساتھ اچھے رہے۔ چنانچہ آج تک یہ پہاڑی قوم جاں نثاری اور وفاداری کا پیمان باندھے ہوئے انگریزوں کی حکومت و سطوت کے عروج کو اپنے نوجوانوں کے خون سے سینچ رہی ہے۔

زمانہ تیس سال پہلے

زمانہ جون ۱۹۰۸ء میں "کیوں روتی ہے بھارت ماتا" پر ایک دلآویز نظم شائع ہوئی تھی جس کے بعض بند تیس سال کے بعد بھی دلچسپ ثابت ہوں گے۔ چنانچہ یہاں پر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مضطرب کس کے لئے ہوتی ہے بھارت ماتا — روتی ہے جانِ حزیں کھوتی ہے بھارت ماتا
داغ افلاس کو یوں دھوتی ہے بھارت ماتا — دانہ اشک پڑی بوتی ہے بھارت ماتا
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

مادرِ مشفق و غمخوار ہے بھارت ماتا — غم اطفال میں بیمار ہے بھارت ماتا
فکر روزی میں ہوئی زار ہے بھارت ماتا — آج کل زیست سے بیزار ہے بھارت ماتا
تم معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

کب سے پامال جفا ہوتی چلی آتی ہے — ہدف تیر بلا ہوتی چلی آتی ہے
کشتۂ تیغ قضا ہوتی چلی آتی ہے — کہ یہ مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

رہرو منزل

از سید محمد ابن علی بی۔اے

عالم وجود میں آنکھ کھلتے ہی انسان کو ایک نیلگوں چتر کے زیر سایہ تخت خاکی پر ایک کہن سالہ عورت کچھ عجیب انداز سے بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اُس کا طریقہ نشست بتاتا تھا کہ وہ کسی فکر میں سرگرداں ہے اور اُس کا دماغ کسی دُھن میں چکر کھا رہا ہے۔ اُس کا چہرہ برابر متغیر ہوتا رہتا، ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ کبھی بشاشں ہو کر اس طرح چمک اُٹھتا کہ مجسمۂ نور معلوم ہونے لگتا اور کبھی اتنا مضمحل ہوتا کہ وہی نور مبدل بہ سیاہی ہو جاتا۔ اُس کے سر پر اک بار گراں رکھا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دست و پا میں ایک خفیف سا رعشہ پڑ گیا تھا۔ تمام جسم پر صدہا جھرّیاں اور ساتھ ہی لاکھوں نشان پڑ گئے تھے۔ گو پیرانہ سالی نے اُس کے اصل پیکر میں اس قسم کے لاکھوں انقلاب پیدا کر دئے تھے تاہم اُس کے کھوئے ہوئے شباب میں اب بھی ایک مقناطیسی کشش باقی تھی۔ اُس کے ایک دامن میں کچھ پھول تھے اور دوسرے میں کچھ خار، اور وہ اُن کو اس طرح اُٹھائے ہوئے تھی کہ دامنِ گل، دامنِ خار سے پہلے نظر آتا۔ مگر دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ رہروانِ ملکِ عدم کو دامنِ گل دکھا کر کانٹوں میں اُلجھانا چاہتی ہے۔

اِس عجیب الخلقت مخلوق کو دیکھ کر انسان بُت بن کر رہ گیا اور اس حیرت و استعجاب کے عالم میں اُسے کچھ وقفہ گذر گیا۔ آخرکار اُس نے ایک ایک سے بہ تعجب دریافت کرنا شروع کیا کہ وہ عورت کون ہے؟ اور یہاں کس لئے بیٹھی ہے؟ استفسار کا سلسلہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ کسی نے بڑھ کر آواز دی۔ "یہ وہی عورت ہے جس کی پیدائش آج سے صدہا سال قبل بمصداق لفظ "کُن" عمل میں آئی تھی اور اسی کا نام "دُنیا" ہے۔ کہاں کھڑا ہے؟ جا اور اپنا کام کر"

دُنیا کا نام سُنتے ہی اُس نے تیزی سے قدم اُٹھانا شروع کیا۔ چاہتا تھا کہ جلد ہی اُس کے سامنے سے گذر جائے۔ مگر پریشان تھا کہ جائے تو کدھر جائے۔ راستہ مستقیم نہ تھا۔ راہ دور راہ تھی اور نہایت پیچیدہ۔ پریشانی کے عالم میں دربدر کی خاک چھانتا ایسے مقام پر جا نکلا، جہاں سے راستہ کا بالکل پتہ نہ چلتا تھا۔ بے چارہ گم کردہ راہ حیرانی کے عالم میں تھک کر منزل تک پہونچنے کی فکر میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی نگاہِ تجسس ادہر سے اُدہر دوڑا ہی رہا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک ہجوم نظر آیا۔ آگے

بڑھا تو دیکھا کہ وہ مجمع مختلف حالات اور مختلف خیالات کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ہر شخص ایک نئے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ کوئی سرگرم عیش و نشاط تھا تو کوئی محوِ اختلاط، کوئی مصروف بادہ نوشی تو کوئی بحالت خاموشی، کوئی سجادہ نشین تھا تو کوئی عزلت گزیں، کوئی روتا نظر آیا تو کوئی ہنستا، کوئی سر دھنتا اور کوئی سرد آہیں بھرتا تھا، کوئی شہسوار میدانِ علم وعمل تو کوئی غرقِ دریائے نکبت و جہل، کسی کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی، کسی کے سر پر تاج شہنشاہی، کوئی دولت و عزت سے مالامال۔ کسی کا افلاس و غربت سے برا حال۔ مجمع کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ سمجھا کہ شاید یہی میری بھی منزل ہو۔ قریب تھا کہ اُن میں سے کسی کا ہاتھ پکڑلے کہ یکایک ایک مرد خوبصورت و نیک سیرت پر اُس کی نظر پڑی جس کے چہرہ پر متانت و بردباری تھی، جس کی پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی، جسکی آنکھیں نورانی تھیں اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ اُس کا نام مردِ خرد تھا۔

اُس سے نگاہ دو چار ہوتے ہی مسافر کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوگیا۔ پریشانی اور اضطراب میں کمی ہوئی۔ اِس نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑلیا اور منزلِ مقصود تک پہونچا دینے کی التجا کی۔ مردِ خرد اُس کی بے چینی کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا:۔

"میں تو خود تمہاری رہبری کرنیکے لئے دیر سے یہاں کھڑا ہوں مگر تمہیں تو مجھ سے ملنے کی فکر ہی نہ ہوئی خیر چلو، میں تمہیں تمہاری اصل منزل تک پہونچا دینے کی کوشش کروں گا۔ مگر یہ خیال رہے کہ میرے حکم بغیر قدم نہ اُٹھے ورنہ نتیجہ اُس کا ایذائے ابدی ہوگا۔ دیکھو، سامنے دو راستے نظر آرہے ہیں۔ ایک کا سلسلہ ملک جنت نشان پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دوزخ مکان کی طرف گیا ہے۔ پہلا راستہ تو وہی ہے جو تمہیں تمہاری منزل تک پہونچا دے گا۔ جہاں تم آسودگی کی زندگی بسر کرسکو گے، گو اس راہ میں چلنے کے لئے تمہیں جفاکشی سے کام لینا ہوگا۔ دوسرا راستہ بظاہر پُر امن ہے مگر میں تمہیں اُس پر چلنے کی اجازت نہ دوں گا۔"

مردِ خرد کی اس ہمدردانہ گفتگو نے اُس کے دل میں جگہ کرلی اور اُس نے اس کو اپنا ہمدرد پاکر اس کے ساتھ چلنے پر کمر باندھ لی۔ غرض اس کی رہنمائی میں قدم شوق اُٹھاتا ہوا منزل پر پہونچنے کی اُمید میں راہ طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ طرح طرح کی وادیوں سے گذر ہوا۔ اکثر سراؤں میں قیام کرنا پڑا۔ سینکڑوں چیزیں اس کی نظر سے گذریں، مگر اُس نے مردِ خرد کے مشورہ بغیر کسی چیز کو نگاہ بھر کے نہ دیکھا اور نہ کسی طرف متوجہ ہوا۔ البتہ جب کبھی مردِ خرد کا اشارہ پایا تو رُک کر کچھ چیزیں اپنے دامن میں بھرلیں۔ غرض وہ شخص یونہی برابر چلا جا رہا تھا اور آسودگی سے راستہ طے ہو رہا تھا۔ اب اُس کو منزلِ مقصد

پہ پہونچ جانے کا یقین کامل ہوگیا تھا۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح مطمئن ہوا کہ مردِ خرد کی رہنمائی کا خیال نہ رہا اور اُس کے قدم بہ قدم رکھنا بھول گیا۔ اس طرح اُسے خبر بھی نہ ہوئی اور وہ بھٹک کر راہ سے بے راہ ہوگیا۔ مردِ خرد اُس سے کوسوں دُور ہوگیا۔ اور یہ اُس سے منزلوں ہٹ گیا۔ چلنے والا اب پھر تنہا رہ گیا۔ مگر اُسے کچھ ہوش اور وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُسے جلد ہی مسافروں کے لوٹ لینے والے رہزنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یکایک کسی نے اُس کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ آنکھ اُٹھائی تو عجب صورت نظر آئی۔ ایک قوی ہیکل ڈاکو، جس کی شکل پر پھٹکار برس رہی تھی اُس کے مقابل تھا اُس لٹیرے کے ہاتھ نہایت لمبے، پیٹ بڑا اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی ایسی کہ دیکھنے والے کو اُن کے بے نور ہونے کا فوراً یقین ہو جاتا تھا۔ بد قطع چہرہ، پھیلا ہوا مُنھ جس پر ناک بھی نہ تھی۔ عوام میں "حرص" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس نے مسافر کی دولتِ قناعت کو لُوٹ اُسے بالکل مفلس کر دیا۔ لاچار ہو کر اِس نے قزاق ہی کی خوشامد کی۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔ آخر کار اس نے اُسی کا ساتھ دینے کا قصد کر لیا۔ قزاق کے گروہ میں شامل ہوتا تھا کہ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بنت الوقت کے ہاتھ پر جسکا نام "بی عرض" تھا بیعت کر لی۔ اب عالم ہی جداگانہ ہوگیا۔ غفلت کے پردے آنکھوں پر پڑ گئے، دیکھ بھی نہ سکا کہ اُس کا قدم کس راہ پڑ رہا ہے۔ چلنے کو تو چلتا گیا مگر آگے کا کچھ خیال نہ رہا۔ جاتے جاتے اُس کا قدم "چاہِ مذلت" میں جا پڑا اور وہ اُوندھے مُنھ اُس کنویں میں گر پڑا۔ پھر تو ذلت و حقارت کے پانی میں غوطے کھانے لگا۔ پانی سر سے اونچا ہوا تو گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر پانی سے نکل نہ سکا۔ بہت غور و فکر کے بعد مردِ خرد کا خیال آیا۔ گردن جھکائی تو مردِ خرد کا عکس پانی میں جھلکتا ہوا نظر آیا۔ اپنی غفلت پر دل میں شرمندہ ہوا۔ فوراً دستِ توبہ بلند کئے۔ ایثار کی رسن ہاتھ میں آگئی، پھر کیا تھا۔ نیکی نے سہارا دیا۔ آسانی سے بلند ہو کر کنویں سے باہر نکل آیا۔ کمزوری و نقاہت قدم نہ اُٹھانے دیتی تھی۔ مگر ہمت نے اُسکا ہاتھ پکڑا۔ مستعدی کا پٹکا کمر میں باندھ اُس نے قدم اُٹھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں ایک ایسی بستی میں جا پہونچا۔ جہاں رحمت کا ابر چھایا ہوا تھا۔ کرم کی بارش ہو رہی تھی۔ راحت و آرام کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریائے عیش موجیں مار رہا تھا۔ ابر و باد کے باوجود بھی سکون کا عالم تھا۔ طائرانِ خوش الحان اُس پُرکیف فضا میں مست ہو ہو کر وفا کے گیت گا رہے تھے۔ لوگ عقیدت کے جھولے ڈالے محبت کے پینگ بڑھا رہے تھے۔ شاہ فرخندہ حال و ملکہ اُلفت زمانی کا راج تھا۔ اب مسافر بہت کچھ مسافت طے کر چکا تھا اُس کی منزل قریب تھی۔ ملک جنت نشان نظر آنے لگا تھا۔ ایک نفس کا فاصلہ تھا۔ چشم زدن میں منزلِ مقصود پہ جا پہونچا۔

استقبال

(از حضرت نظرت واسطی)

مہماں ہے اللہ اللہ مرے گھر خدائے ناز
ہر رنگ سرشِ ناز ہے کاشانۂ نیاز

دیوار و در میں حسن ہے آب و ہوا میں رنگ
امروز مہر و مہ ہیں مرے گھر کے خشت و سنگ

ذرّوں میں آ گئی ہے وہ تابانیٔ مزاج
گویا تمام صحن میں تارے بچھے ہیں آج

یہ تابشِ جمال یہ برق افگنیٔ حسن
ہے آج سارے گھر میں مرے روشنیٔ حسن

جنّت کا روپ لوٹ کے جنّت بنا ہے گھر
فردوسِ حسن و عرشِ لطافت بنا ہے گھر

گھر باغ در کنار ہوا مشکبار ہے
معیارِ خاص پر مرے گھر کی بہار ہے

منظر بھی لاجواب ہے موسم بھی لاجواب
ہر سانس موج مے ہے نظر مست اور خراب

کچھ فکر آج کی ہے نہ فردا کا ہوش ہے
دنیا کا غم ہے مجھ کو نہ عقبیٰ کا ہوش ہے

یہ اس لئے کہ آج ہے مہماں خدائے ناز
دل ہے مرا بہارِ دو عالم سے بے نیاز

آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں معراج بسم و راہ
جو بات ہے حدیثِ عنایاتِ بے پناہ

نازاں ہوں میں کہ ہاتھوں میں بانہیں ہیں حسن کی
رقصاں ہوں میں کہ مجھ پہ نگاہیں ہیں حسن کی

یہ رنگِ التفات یہ رنگینیٔ حیات
ہر سانس میں سجی ہوئی ہے شوق کی برات

میں میزباں ہوں آج عروسِ بہار کا
مجھ پر کرم ہے حسن کے پروردگار کا

پایا ہے میں نے آج محبت کا تخت و تاج
آنکھوں میں روشنی کی جگہ بجلیاں ہیں آج

سینے میں دل نہیں ہے محبت کی آگ ہے
نغمہ نہیں ہے میرا، جوانی کا راگ ہے

ہر موجۂ نفس میں خوشی کا پیام ہے
ہر جنبشِ نظر میں وفا کا سلام ہے

یہ اس لئے کہ آج ہے مہماں خدائے ناز
دل ہے مرا بہارِ دو عالم سے بے نیاز

تنقید کُتب

علم الحروف[1]

انسان اور دیگر جانداروں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ جانور اپنا مافی الضمیر اپنی جنس کے اُن جانداروں تک پہونچا سکتا ہے جو سامنے یا قریب موجود ہوں، مثلاً بندر چیخ کر یا کلکاری مار کر اپنی برادری کو اکٹھا کر لیتے ہیں، اور کوّے کائیں کائیں کر کے آس پاس کے کوّوں کا ٹڈی دل ایک جگہ لے آتے ہیں، مگر وہ اپنا مافی الضمیر کسی دُور دراز مقام کو منتقل نہیں کر سکتے۔ مگر انسان بعض مخصوص اور مسلّمہ اشارات یا نقوش کے ذریعہ سے اپنا مافی الضمیر ہزاروں کوس کے فاصلہ پر شخص غیر حاضر کے پاس پہونچا سکتا ہے۔ انھیں اشارات یا نقوش کو جو انتقال مافی الضمیر کا ذریعہ بنتے ہیں، اصطلاح میں "حروف" کہتے ہیں۔ یہ حروف کب اور کیونکر ایجاد ہوئے؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے۔ جسے زیرِ نظر کتاب میں حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر دہلوی نے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں قدیم مذہبی روایات، اثریات اور جدید ریسرچ سے کام لیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مفرد و مرکب الفاظ کے وجود میں آنے کے اسباب بھی بیان کر دئے ہیں۔

دُنیا میں ہزاروں قومیں آباد ہیں۔ اور ہر قوم اپنی اپنی بولی جداگانہ رکھتی ہے۔ بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو بولی تو رکھتی ہیں لیکن حروف نہیں رکھتیں۔ دُنیا کی تمام قوموں کو چار نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:- (۱) آریا (۲) سامی (۳) مغل اور (۴) حبشی۔ اگرچہ بعض نسلیں انھیں چار سے مخلوط ہو کر بنی ہیں۔ آریا نسل میں ہندوستان، افغانستان، ایران، شمالی وسطی اور مغربی یورپ کے لوگ شامل ہیں جنکی زبانیں سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ سامی نسل میں عرب، یہود اور شمالی افریقہ کے لوگ داخل ہیں۔ ان کی بولیاں آرامی زبان سے ماخوذ ہیں۔ مغلی نسل میں تبت، چین، منگولیا، جاپان، برہما وغیرہ کے لوگ ہیں جنکی بولیاں چینی زبان سے ماخوذ ہیں۔ حبش، سوڈان، نوبہ اور بقیہ افریقہ اور جزائر بحر الکاہل کے لوگ حبشی یا مخلوط حبشی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بولیوں پر زیادہ تر سامی زبانوں کا اثر پڑا ہے۔

حروف کی ایجاد جانوروں اور اشیا کی تصویروں سے ہوئی۔ ایسے حروف کو اصطلاح میں صوری یا ہیرو غلیفی کہتے ہیں۔ قدیم مصری اور موجودہ چینی اور جاپانی حروف ان کی زندہ مثالیں ہیں۔

---

[1] قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر فراش خانہ دہلی۔

جسمیں امتدادِ زمانہ سے رد و بدل ہوتے ہوتے ایک خاص صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اِس وقت دُنیا میں صرف چار قسم کے حروف ابجد رائج ہیں۔ اور دُنیا بھر کی زبانیں خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ اُنھیں حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ یعنی،

(۱) چینی (چین، جاپان، تبت، منگولیا، کوریا، برہما وغیرہ)

(۲) دیوناگری (سنسکرت اور ہندوستان کی تمام زبانیں اُردو کے سوا)

(۳) سامی (اردو، فارسی، عربی وغیرہ)

(۴) لاطینی (تمام یوروپین زبانیں اور ترکی)

موجودہ عربی و فارسی حروف ابجد کی ایجاد کا سہرا مورخین کے نزدیک فنیقی قوم کے سر ہے، جنھوں نے مصری ہیرو غلیفی ابجد میں اصلاح کی۔ موجودہ عربی حروف فنیقی ابجد ہی سے ماخوذ ہیں۔

اِس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں آغاز آفرینش سے لیکر اسوقت تک کے حالات لکھے گئے ہیں جب حروف ابجد کی ایجاد ہوئی۔ اسی سلسلہ میں مصر قدیم کی مختصر تاریخ اور قدیم ملوک عرب کے مختصر حالات اور مختلف قسم کی ابجدوں کی تاریخ بھی درج کی گئی ہے۔ یہ حصّہ خاص تلاش و تجسس اور دماغ سوزی سے لکھا گیا ہے جس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ دوسرا حصہ ایران یا عجم سے مخصوص ہے، جسمیں تاریخی حالات کے علاوہ مختلف قسم کے خطوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اور ایران کے مشہور خطاطوں کے حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ ضمناً آشوریہ، بابل اور عرب کے حالات بھی آگئے ہیں۔ ہندوستان کے سلاطین مغلیہ کے حالات بھی ہیں اور سب سے دلچسپ یہ ہے کہ اس حصّہ میں اُردو و فارسی پریس کے حالات بھی مختصراً درج ہیں، تیسرے حصّہ میں کاغذ، قلم، سیاہی پر بحث کی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں قدیم و جدید زبانوں کے شجرے اور ان کی ابجدوں کے نمونے اور بہت سے دیگر نقشے اور مشہور خطاطوں اور خطوں کے نمونے دئے گئے ہیں۔ آخر میں سوله صفحہ کا ایک ضمیمہ لگایا گیا ہے، جسمیں مرموز ابجدوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تعویذ نگاری کے آرٹ کی بھی خاص طور پر تشریح کی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جو علم الحروف کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔ چنانچہ جہاں جس ماخذ سے کوئی مضمون لیا ہے، حاشیہ میں اُس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ زمانہ کے جن پرچوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اُن کا بھی حوالہ دیدیا ہے حالانکہ اُردو میں عام طور پر مصنفیں و مولفین حوالہ دینے میں افسوسناک بخل سے کام لیتے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب بہت پُراز معلومات اور دلچسپ ہے۔ جس پر ہم حضرت ماہر صاحب کو

تہِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

اِس کی لکھائی، چھپائی بھی روشن ہے۔ کاغذ رسمی، ضخامت ۲۴۶ صفحے۔

زندگی[1]

یہ کتاب اُردو کے مشہور مزاحیہ نگار مُلا رموزی کے بعض مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مُلا صاحب نے اپنے خاص رنگ میں لکھے ہیں۔ بعض بعض ایسے قابلقدر جملے اور فقرے آگئے ہیں جنھیں پڑھ کر بڑے بڑے فقرہ باز بھی ہنسی ضبط نہیں کر سکتے۔ اگرچہ مُلا صاحب اپنی مخصوص چیز یعنی گلابی اردو' کے لئے مشہور ہیں، لیکن لٹریری قسم کے مضامین میں بھی آپ کو اچھا خاصہ دخل ہے۔ اگرچہ وہ اپنی "ننھے کی اماں" کے ذکر اور خودستائی سے کہیں نہیں چوکتے۔ مضامین کے اِس مجموعہ میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی پر خاص عنایت فرمائی گئی ہے۔ مقدمہ میں جو خود نوشت ہے مُلاّیانہ یا مولویانہ رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ جس میں خودستائی کے ساتھ اہلِ قلم حضرات پر خفیف چوٹیں بھی ہیں۔ سفرِ کانپور کے حالات کے سلسلے میں ایڈیٹر زمانہ سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ ایک آدھ مقامات میں اُنھیں کچھ سوءِ ظنی بھی ہوئی ہے جو ایک پُر مذاق مصنف کے شایان شان نہیں کہی جاسکتی ہے۔ بہرحال جن حضرات کو مُلا صاحب سے عقیدت و ارادت ہے اُنھیں اِس کے مطالعہ سے خاص لُطف آئے گا۔ کیونکہ مضامین میں زیادہ حصہ آپ بیتی کا ہے۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۲۱۳ صفحات۔

وفاقِ ہند[2]

اِس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات پر معقول روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے پڑھنے والے کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں ۱۹۳۵ء کا نظم ونسق ہند کا نیا قانون بھی تمام وکمال شامل ہے۔

ہمارے نزدیک خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ایل۔ ایل۔ ڈی، بار ایٹ لانے یہ کتاب لکھکر اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے اُردو داں جماعت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے بخوبی واقف ہوسکتی ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اِس کا تمہیدی نوٹ "پیش لفظ" کے نام سے آنریبل سرشاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا جیسے مشہور و معروف قانون داں مدبر نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب اعلیٰ۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔

---

[1] قیمت دو روپیہ (عہ)۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن۔

[2] قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:۔ اُردو لٹریچر کمپنی، دہلی۔

تاریخ انجمن ہند اودھ[1]

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب گورنمنٹ نے "بجلدوئے خدمات احسن" اودھ کے تعلقداروں کو جاگیریں اور سندیں عطا فرمائیں، تو بعض دور اندیش تعلقداران اودھ نے انجمن بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ مہاراجہ دگبجے سنگھ والیٔ بلرام پور، مہاراجہ مان سنگھ والیٔ اجودھیا اور بابو دکھنا رنجن مکرجی تعلقدار شنکر پور ضلع رائے بریلی نے باہم مشورہ کرکے انجمن تعلقداران اودھ کے قیام کی تجویز مرتب کی، تو چیف کمشنر سر چارلس ونگفیلڈ نے اُسے بہت پسند کیا۔ چنانچہ ۲۶ مارچ ۱۸۶۱ء کو تمام سربرآوردہ تعلقداران اودھ کا ایک عظیم الشان جلسہ عیش باغ میں منعقد ہوا جسمیں بابو دکھنا رنجن مکرجی کی تحریک پر "انجمن تعلقداران اودھ" قائم ہوئی اور اُس کا انگریزی نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" قرار دیا گیا۔

اِس انجمن نے کیا کیا کارنامے انجام دئے، اس کا مفصل حال خان بہادر شیخ صدیق احمد صاحب ایم۔بی۔ای۔ اسسٹنٹ سکریٹری انجمن مذکور نے نہایت تلاش و تحقیق اور دیدہ ریزی کے بعد پوری شرح و بسط سے کتاب مندرجہ عنوان میں درج کردئے ہیں۔ یہ گویا انجمن تعلقدارانِ اودھ کی ایک مفصل تاریخ ہے جسمیں انتزاع سلطنت اودھ سے ۱۹۳۵ء تک کے حالات درج کردئے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے تین حصّے کئے گئے ہیں۔ جنمیں دو حصے شائع ہوچکے ہیں اور تیسرا حصہ زیر تیاری ہے۔ جن لوگوں کو لکھنؤ، اودھ اور خصوصاً تعلقدارانِ اودھ کے مفصل حالات سے دلچسپی ہو، انھیں اس سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی۔ فاضل مصنف نے اسے لکھ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب پبلک اور پرائیوٹ لائبریریوں میں رکھے جانیکے قابل ہے۔

اِس کی لکھائی، چھپائی بھی بہت روشن ہے، کاغذ اور جلد سب نفیس ہے۔ تینوں حصّوں کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہوگی۔

قرآن پاک[2]

یہ مختصر رسالہ مولوی عبدالواحد سندھی اُستاد مدرسہ جامعہ ملیہ دہلی نے مسلمان بچوں کے لئے عام فہم اور سلیس زبان میں لکھا ہے۔ اِسمیں قرآن شریف کی حقیقت اور تعلیم پر مفصل اور دلنشین پیرایہ میں بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں اسلام کے متعلق ضروری باتیں درج کردی گئی ہیں۔ مسلمان بچوں کیلئے یہ کتاب مفید ہوگی۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ ہے۔

---

[1] قیمت فی حصہ چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ خان بہادر صدیق احمد صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقداران اودھ، قیصر باغ لکھنؤ۔

[2] حجم ۱۰۳ صفحات۔ قیمت ۶ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

بغداد کا چاند[1]

آجکل ملک کا کوئی اخبار اور کوئی رسالہ ایسا نہیں جسمیں کوئی نہ کوئی فسانہ درج نہ ہو۔ مگر اُنکا مقصد محض تفریح طبع ہوتا ہے۔ اور وہ اصلاحی یا حکیمانہ رنگ بہت پھیکا ہوتا ہے، جس کی بدولت پریم چند کا نام رہتی دُنیا تک قائم رہے گا۔

زیر نظر ناول بھی جس کے مصنف سیّد عبدالرحمٰن جوہری۔ اے زمیندار جاجمئو ضلع کانپور ہیں، محض تفنن طبع کیلئے نہیں لکھا گیا ہے، اس کا اصلی مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح "احسان کا بدلا احسان ہی ہوتا ہے"۔ فسانہ کا پلاٹ عہد عباسیہ کے بغداد میں رکھا گیا ہے۔ اور خاندانِ برامکہ کی تباہی سے شروع کیا گیا ہے۔ اسمیں شرافت، تہذیب و تمدن اور حریت و آزادی کی رنگین تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی عربی عورتوں اور مردوں کی تعلیم و تربیت کن مدارج تک پہونچی ہوئی تھی۔ اس فسانہ میں جہاں کہیں فلسفہ و حکمت کی چاشنی دی گئی ہے، وہ بہت سبق آموز ہے۔ البتہ فاضل مصنف نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ جس کے باعث پلاٹ کی بعض تفصیلات تشنہ رہ گئی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط درجہ کا۔ حجم ۱۰۰ صفحات

لطائف غالب[2]

مرزا غالب نے اُردو شاعری میں فلسفہ و حکمت کو داخل کیا۔ لیکن یہ واقعہ شاید زیادہ اصحاب کو معلوم نہ ہو کہ وہ انتہا درجہ کے ستم ظریف بھی تھے اور اُن کے لطائف و ظرائف لوگوں کو تڑپا دیتے تھے اگرچہ یادگار غالب اور بعض دیگر کتابوں میں مرزا کی بذلہ سنجی سے کافی بحث کی گئی ہے لیکن اُن ضخیم کتابوں کے پڑھنے کے لئے مدت درکار ہے۔ مسٹر ایم۔ اے شاہ پی ایس سی۔ ایف آئی سی کا ہمیں ممنون ہونا چاہئے کہ اُنھوں نے اس چھوٹی سی کتاب میں مرزا غالب کے تمام لطائف و ظرائف یکجا کر دئے ہیں۔ اِس رسالہ میں غالب کے سینتالیس لطیفے درج ہیں، جو بہت ہی پُر لطف ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

مقالات شبلی[3]

دار المصنفین اعظم گڈھ نے اِس عنوان سے علامہ شبلی مرحوم کے تمام مضامین کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ اِس مجموعہ میں سات تحقیقی و تاریخی مضامین ہیں۔ ہر مضمون دلائل اور حوالوں کیساتھ اپنی جگہ جامع اور قابل قدر ہے۔ بعض رائیوں میں اختلاف کی گنجائش ضرور ہے لیکن تحقیق کے شائق اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ مُفید اور دلچسپ ثابت ہوگا۔ لکھائی، چھپائی کاغذ سب قابل قدر، ضخامت ۲۰۴ صفحات

---

[1] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مستورات پریس، پریڈ کانپور۔

[2] قیمت تین آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ پنجاب ریلوے روڈ، لاہور۔ [3] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

نوحہ

(بر وفات بابو شمبھر ناتھ سری واستو یہ ایم۔اے)

(از حضرت کیلاش ورما شاد تیرتھ تھوگاوی)

کیا قیامت ہے زمیں کیوں لرزہ براندام ہے
کیا کسی کو موت کا یارب بلا پیغام ہے
صبح کی تابانیوں میں ظلمتِ ایام ہے
تابشِ نورِ سحر وقفِ سوادِ شام ہے
زندگی سے موت ملنے کے لئے ہے بیقرار
جیسے دلہن آتی ہو مستانہ وش مستانہ وار

کون یارب ہو رہا ہے اب جدا بیگانہ وار
کون آخر موت سے اُف ہو رہا ہے ہمکنار
کس کی فرقت میں ہوا یوں آہ میرا حال زار
چشم گریاں سینہ بریاں طبع مضطر دل فگار
سینۂ سوزاں سے شعلے اُٹھ رہے ہیں باربار
اشکِ خوں برسا رہی ہے چشمِ تر لیل و نہار

آہ کل تک تھا جو اپنا آج وہ بیگانہ ہے
جو حقیقت تھا کبھی وہ بن گیا افسانہ ہے
آج ساقی ہی نہیں گو شیشہ اور پیمانہ ہے
جانِ میخانہ نہیں باقی مگر میخانہ ہے
غنچہ کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُف مرجھا گیا
ابرِ غم دل پر سحابِ یاس بنکر چھا گیا

آہ مرگِ ناگہانی تو نے یہ کیا کر دیا
گلشن ہستی کو ویراں کرکے صحرا کر دیا
دم زدن میں ظلم کا در تو نے جب وا کر دیا
وہ ہنگامہ وہ محشر سا برپا کر دیا
حیف منکر رہ گیا کتنی دواؤں کا اثر
اور باطل ہو گیا ساری دعاؤں کا اثر

بار ہا ہے کون ہم سے منھ کو یوں موڑے ہوئے
رشتۂ عہد وفا کو اس طرح توڑے ہوئے

ہے کوئی مضطر ادھر بھی اپنا جی چھوڑے ہوئے یاس و حرماں سے دلِ صد لخت کو جوڑے ہوئے
آگ کے شعلوں میں جب نظروں سے پنہاں ہوگیا
آتشِ رنگیں سے دل گرما اور تاباں ہوگیا

اس بھری محفل کو اب سونی کئے جاتا ہے کون دوستوں کو داغِ فرقت کا دیئے جاتا ہے کون
دل سے میرے صبر و تسکین اب لئے جاتا ہے کون آہ یوں جامِ فنا آخر پیئے جاتا ہے کون
کون اپنی زندگی سے اس قدر بیزار ہے
کون مشتاقِ موت سے یوں برسرِ پیکار ہے

رُباعیّات

(از حضرت جگر بریلوی، بی۔اے)

گر رنج ہو کم تو رنج کرنا اچھّا تدبیر و علاج ہی میں مرنا اچھّا
جب حد سے گزر گیا ہو پانی سر پہ غفلت ہی میں عمر کا گذرنا اچھّا

جب رنج سے دل نڈھال ہو جاتا ہے معمورِ فنا خیال ہو جاتا ہے
محویتِ غم سے دل کی گہرائی میں محسوس ترا وصال ہو جاتا ہے

تدبیر و عمل ہے زندگانی کا نام تکمیلِ صفات ہی بشر کا ہے کام
جینا کیا ہے دماغ و دل کی تعبیر ہے زندگی خود ہی زندگی کا انعام

سرمایۂ نازِ زندگانی دل ہے سامانِ نشاطِ نوجوانی دل ہے
ہے تابعِ دل جگر حیاتِ جاوید درصل سروشِ آسمانی دل ہے

رفتار زمانہ

الف (غیر ملکی)

سیاسیات یوروپ کی حالت جیسی ایک ماہ پہلے تھی تقریباً ویسی ہی اب بھی ہے کہ زیکوسلاویکیا کے معاملہ میں جنگ چھڑ جاتی۔ مگر اب وہ اندیشہ جاتا رہا۔ کیونکہ اُدھر انگلستان نے زیکوسلاویکیا کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہ وہ اپنی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے بدرجۂ اتم جرمنوں کو مراعات دیدے اِس بات کا صاف طور پر اطمینان نہیں دلایا کہ وہ زیکوسلاویکیا پر دست درازی کے وقت مداخلت نہیں کریگا۔ اِدھر فرانس اور روس نے اعلان کردیا کہ وہ متذکرہ بالا ظہور پر زیکوسلاویکیا کی اعانت کریں گے۔ اِن وجوہ سے ہٹلر کو ضبط سے کام لینا پڑا۔ لیکن یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہٹلر کس وقت زیکوسلاویکیا کے ساتھ آسٹریا جیسی کارروائی کر بیٹھیگا اہلِ زیکوسلاویکیا خوددار بھی ہیں اور سریع الحس بھی۔ نیز اُنکی جنگی طاقت بھی کافی ہے غالباً وہ آسٹریا کی طرح بلا مقابلہ کئے سرِ تسلیم خم نہ کرینگے۔ ہٹلر نے بھی ان سب امکانات کو بخوبی سمجھ لیا ہے، مگر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ ہٹلر اور مسولینی کو خوش کرکے اپنے مال غنیمت کو برقرار رکھنے کیلئے در پردہ اِس بات کی کوشاں ہے کہ فرانس کی موجودہ گورنمنٹ پر جو اشتراکیت کی طرف مائل ہے فرانس کی مخالف پارٹی کو غلبہ دلاکر موخرالذکر کے ذریعہ فرانس اور جرمنی کا سمجھوتہ کرادے اور فرانس کو اِس بات پر رضامند کردے کہ وہ وسطی اور جنوب مشرقی یوروپ کی ریاستوں کو ہٹلر کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ اِس پالسی کی وجوہ دو ہیں۔ اولؔ یہ کہ برطانیہ اِس وقت تک جنگ کے لئے تیار نہیں ہے۔ دومؔ یہ کہ برطانیہ کی موجودہ گورنمنٹ جو سرمایہ داروں کی حامی ہے، جانتی ہے کہ ہٹلر اور مسولینی دُنیا میں اشتراکیت کے حریف اور سرمایہ داری کے محافظ ہیں۔

غرض اِسوقت برطانیہ کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ وہ اپنی جنگی طاقت بڑھائے، گو بحری طاقت قابلِ اطمینان ہے مگر ہوائی طاقت بہت کمزور ہے، حال ہی میں دارالعوام میں گورنمنٹ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی تھی کہ جرمن طیاروں کی تعداد برطانیہ کے ہوائی جہازوں سے دوچند ہے اور جرمنی کی ماہانہ برآورد ۳۵۰ ہوائی جہاز ہے، جس کے مقابلہ میں برطانیہ صرف سَو ہوائی جہاز تیار کرتا ہے اِس کمزوری نے لندن کی پوزیشن نازک کردی ہے۔ جس پر ہوائی حملہ ہوجانے کی صورت میں گورنمنٹ برطانیہ کے دست وپا شل ہوجائیں گے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ جب تک برطانیہ اپنی ہوائی طاقت نہ بڑھائے

اُس کو بین الاقوامی سیاسیات کی بساط پر ہر چال سوچ سمجھ کر چلنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چند ماہ برطانیہ کو ہٹلر اور مسولینی سے اِس قدر دبنا پڑا اور وہ چال اختیار کرنی پڑی جس کے باعث دُنیا کی نظروں میں اخلاقی طور پر رسوا ہوا۔ جنرل فرانکو نے (یا یوں کہئے کہ اُس کے آقا مسولینی اور ہٹلر نے) برطانوی جہازوں پر بمباری کی تو برطانوی گورنمنٹ اوّل اوّل چیں بچیں ہوئی اور جنرل فرانکو سے جواب طلب کیا۔ برطانیہ کی اِس خفگی پر حریفوں نے بے اعتنائی ہی نہیں دکھائی بلکہ دو اور جہازوں پر بمباری کردی اور چیمبرلین صاحب کو بجز اس کے کچھ نہ سوجھا کہ وہ برطانوی تجار پر یہ بات واضح کردیں کہ جنگ کے حلقہ میں داخل ہونے پر گورنمنٹ اُن کے جہازوں کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ چیمبرلین گورنمنٹ جنرل فرانکو ہی کی فتح کی آرزومند ہے کیونکہ اسپین گورنمنٹ اشتراکیت کی حامی اور سرمایہ داری کی حریف ہے نیز گورنمنٹ برطانیہ کو یہ شبہ ہے کہ جنرل فرانکو کی فتح کے بعد اطالوی فوجیں واپس ہوجائینگی اور "اینگلو اٹیلین" معاہدہ پر عمل ہونے لگیگا۔ لیکن یہ مقصد تو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، جبکہ بعد از جنگ ہسپانوی گورنمنٹ میں مسولینی اور ہٹلر کو دخل نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسپین کی قومی حکومت مسولینی کے کہنے پر الجزیرہ کے قریب توپیں نصب کردیگی۔ جس سے جبرالٹر کی پوزیشن قطعی غیر محفوظ اور نازک ہوجائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو مصر بچانے کے امکانات بہت کم اور برطانیہ اور اٹلی کا سمجھوتہ ہونا مشکل ہوجائے گا۔

امریکہ یوروپین سیاسیات کے بھنور میں پھنسنا نہیں چاہتا، گو کہ برطانیہ کی کوشش برابر یہی ہے کہ وہ امریکہ کو بھی اپنی پالسی کا موید بنا کر اپنے ساتھ رکھے۔ لیکن امریکہ نے ابھی تک کوئی خاطر خواہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ برطانیہ امریکہ کی دوستی اور مدد کے بغیر دوسری جنگ عظیم کی تاب نہیں لاسکتا۔ ہر چند کہ برطانیہ انتہائی جلدی کیساتھ اسلحہ جنگ میں اضافہ کر رہا ہے مگر ہنوز اسکی تیاریاں قابل اطمینان طور پر مکمل نہیں ہوئیں اور حریف تیغ بکف جنگ کی دھمکیاں دے رہے ہیں، اور جہاں موقع ملتا ہے کمزور ریاستوں کو دبوچ لیتے ہیں۔ برطانیہ مرعوب ہو رہا ہے۔ انھیں حالات کے زیر اثر برطانیہ نے آئرلینڈ کے منھ مانگے مطالبات پورے کردیئے۔ اور بندرگاہیں بلا کسی شرط کے اُسکے سپرد کردیں۔ دس کروڑ پونڈ کے قرضہ میں جو آئرلینڈ پر واجب الادا تھا ۹ تخفیف کردی، بس اب تقسیم آئرلینڈ کی تنسیخ کا معاملہ رہ گیا ہے، وہ کسی دن ڈی ویلرا کے حق میں فیصل ہوجائے گا۔

اِس وقت برطانیہ کا حریف جرمنی زوروں پر ہے، سنہ ۱۹۱۶ء میں بھی جب دُنیا میں جرمنی کا طوطی بول رہا تھا اور آئرلینڈ بغاوت پر آمادہ ہوگیا تھا۔ تو اُس نے جرمنی سے اسلحہ بہم پہونچانے کیلئے التجا کی تھی۔

اُس وقت آئرلینڈ کے ساحل تک غنیم کے جہاز کا عزم کرنا جان ہتھیلی پر رکھ کر چلنا تھا تاہم جرمن جانبازوں نے حوصلہ کرکے ایک جہاز ناروے کے جہازوں کی وضع پر تیار کرکے اور اس کے عملہ کو نارویجی لباس پہنا کر "ٹرالی" کی خلیج تک بھیجدیا تھا۔ مگر باغی کشتیاں لے کر موعودہ وقت پر نہ پہونچے، کیونکہ انھوں نے پروگرام بدل دیا تھا۔ جہاز کے کپتان نے بڑی ہمت دکھلائی وہ وہاں سے واپس نہ ہوا۔ اور باغیوں کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر برطانیہ کو اُس کی خبر پہونچ گئی اور وہ جہاز پکڑا گیا۔

بہرحال اِس وقت برطانیہ نے آئرلینڈ کیساتھ جس فیاضی کا سلوک کیا ہے وہ دانشمندی اور تدبر پر مبنی ہے۔

ب (ملکی)

ہندوستانی لیڈروں کے درپیش اُس فیڈریشن کا مقابلہ ہے جو حکومت برطانیہ جبراً وقہراً ہندوستان کے سر منڈھنا چاہتی ہے۔ لارڈ زٹلینڈ نے اِس سلسلہ میں جو تقریر لندن میں کی وہ نہایت دل شکن ہے۔ اُنھوں نے ناواجب تکبر و نخوت کا اظہار کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے یہی کہنا چاہا "لینا ہو تو لو نہیں تو گھر بیٹھو"۔ مانچسٹر گارڈین نے بھی لارڈ زٹلینڈ کی تقریر کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ اور یہ لکھا ہے کہ "یقیناً ہندوستان ایسے فیڈریشن کو ٹھکرا دیگا اور ہرگز قبول نہ کرے گا"۔ لارڈ زٹلینڈ نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ ہندوستان میں جو یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ وائسرائے ہند لندن اِس غرض سے گئے ہوئے کہ وہ حکومت برطانیہ کیساتھ اُس فیڈریشن میں ترمیم و تنسیخ کے متعلق غور و خوض کریں گے جسکی تشکیل انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک کہ اُنھیں علم ہے قطعی بے بنیاد ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُنکی رائے میں اس بات کا کمترین امکان ہے کہ پارلیمنٹ یا ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اِس بات پر رضامند ہو کہ فیڈریشن کے نفاذ سے پہلے وہ اُسمیں ترمیم و تنسیخ پر غور و خوض کریں، لیکن اُنھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایکٹ مذکور کے حدود کے اندر ہی صوبجات اور راجگان کے مناسب و ضروری مطالبات کے پورے کئے جانے کی گنجائش ہے۔ لارڈ زٹلینڈ کا ٹھیک مفہوم کیا ہے؟ اُن کی تقریر سے ظاہر نہیں ہوتا اور اس رائے میں اختلاف کی گنجائش نہیں کہ صاحب موصوف کی تقریر معاملات کے سلجھانے کی طرف مائل نہیں، اور اس سیاسی معمہ کے پُرامن حل کی قطعی حامل نہیں اور زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے۔ کہ اُنھوں نے یہ دھمکی دیدی کہ ہندوستان اگر اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تو شاید ایسا موقع ہندوستان کو پھر کبھی نہ ملے۔

ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمایندہ کو صدر کانگریس مسٹر سوبھاش چندر بوس نے جو مفصل بیان دیا اُسمیں اُنھوں نے یہی کہا کہ لارڈ زٹلینڈ صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم لوگ وائسراؤں اور گورنروں کے آنے

اور جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ انھیں ماڈرن انڈیا سے قطعی واقفیت نہیں۔ انڈیا کی قسمت ان لوگوں کے ہاتھوں یا صاحب موصوف کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ انڈیا کی قسمت ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور ہمیں اس امر کا احساس ہے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اُس حصہ کا نفاذ جسکا تعلق صوبجاتی حکومتوں سے ہے ہو ہی چکا ہے صوبجات میں حکومتیں بالخصوص کانگریسی حکومتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہیں مگر اس کامیابی کیلئے سنٹرل گورنمنٹ کی مدد لابدی ہے نیز یہ ایک امر واقعہ ہے کہ صوبجات کی حکومتوں کا مدار اقتصادی بہبودی پر ہے۔ صوبجات کا واسطہ براہِ راست اہلِ زراعت سے ہے اور اُن کے بجٹ میں آمدنی کا سب سے بڑا حصہ انھیں اہلِ زراعت کی فارغ البالی کا محتاج ہے۔ اِس فارغ البالی کے لئے عین ضروری ہے کہ روپیہ کی شرح تبادلہ میں کمی کر دیجائے یعنی شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سے ۱ شلنگ ۴ پنس کر دی جائے۔ مگر یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی پالسی ہمیشہ سے لنکا شائر کے مفاد کے زیر اثر رہی اور یہ شرح تبادلہ کا معمہ ہمیشہ سے گول مال رہا، جس کے لئے حکومت ہند ذمہ وار ہے۔ اثرات مابعد جنگ اقتصادی طور پر سلطنت برطانیہ کے لئے پریشان کُن ثابت ہوئے۔ ہندوستان نے رفاقت کا دم بھرا مگر جب وقت آیا کہ ہندوستان اپنا قرضہ وصول کرے تو شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس کر دی گئی، اِس طرح قریب قریب نصف قرضہ یوں ہی صاف ہوگیا۔ مدبران ہند نے شور و غل مچایا مگر اُن کا یہ ہنگامہ صدا بہ صحرا ثابت ہوا، شرح تبادلہ کی بابت بمبئی کے وزیر مالیات ساتوں کانگریسی صوبجات کی حکومتوں و نیز چار غیر کانگریسی صوبجات کی حکومتوں کو شریک کر کے حکومت ہند سے اِس امر کی نمایندگی کیلئے تیاری کر رہے ہیں کہ وہ شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سے ۱ شلنگ ۴ پنس کر دے۔ اُدھر حکومت ہند بھی تُلی ہے کہ وہ موجودہ شرح تبادلہ برقرار رکھے۔ اپنے ایک مراسلہ میں اُس نے اسی بات پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس کے پاس ۱۶۰ کروڑ اسٹرلنگ کی استطاعت شرح موجودہ کے برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ ہندوستان کے اقتصادی معاملات میں شرح تبادلہ کا معاملہ نصف صدی سے سخت پریشان کن رہا ہے اور جس طرح شرح تبادلہ گھٹائی بڑھائی گئی ہے اُسکا نتیجہ ہندوستان کی تباہی و بربادی ہوا ہے۔ اگر اب بھی حکومت ہند نے اِس سلسلہ میں صوبجات کے مطالبہ کو قبول نہ کیا تو اہلِ ہند کی عین بدقسمتی ہے۔

دوسرا اہم معمہ جو ملک کیلئے پریشان کُن ثابت ہو رہا ہے وہ ہندوستان اور برطانیہ کی تجارت کا ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ چند سال پیشتر اِس سلسلہ میں جس معاہدہ اٹاوہ کا عملدرآمد حکومت ہند نے کرایا تھا وہ ہندوستان کے مفاد کے سراسر خلاف تھا۔ ملک میں اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔

اب دو سال سے اِس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ دوسرا معاہدہ کیا جائے چنانچہ حال ہی میں شملہ میں لنکا شائر کے نمایندگان اور ہندوستان کی ٹکسٹائل ملوں کے نمایندگان کے مابین گفت و شنید ہوئی مگر لنکاشائر کے نمایندوں نے جو مطالبات پیش کئے وہ سراسر ناواجب تھے۔ انھیں فکر ہی کیوں ہوتی کہ نیا سمجھوتہ ہو جائے۔ کیونکہ معاہدۂ اٹاوہ جس کا عملدرآمد جاری ہے اُن کے عین موافق ہے۔ حکومت ہند کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ واضح طور پر کہہ دیتی معاہدہ اٹاوہ جلد از جلد منسوخ کر دیا جائے گا۔

ہندوستان کے ساختہ کپڑے پر ساڑھے ساٹھ فیصدی کا بار اس محصول سے پڑ جاتا ہے جو کہ روئی، مل اسٹورز، ہری مصالحہ، رنگ ریزی وغیرہ پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں اِسوقت مزدوروں کے حق میں جس پالسی کا عملدرآمد کانگریسی حکومتیں کر رہی ہیں، وہ بھی کپڑے کی قیمت پر گراں بار ہو رہی ہے۔

اب تک ہندوستان ۲۶ کروڑ ۶۰ لاکھ گز کپڑا برطانیہ سے خرید کرتا ہے۔ ہندوستانی ملوں کے نمایندے مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے یہاں تک رضامندی ظاہر کی کہ ہندوستان ۴۰ کروڑ گز کپڑا برطانیہ سے لیگا، نیز اسمیں پچاس فیصدی کا اضافہ کر دیگا۔ بشرطیکہ متناسب اضافہ برطانیہ ہندوستان کی روئی کی خریداری میں کرے اِسوقت برطانیہ ۶۵۰،۰۰۰ (650،000) گانٹھیں روئی کی ہندوستان سے خرید کر رہا ہے۔ سر موصوف نے اُسکے بالمقابل ۷۵۰،۰۰۰ (750،000) گانٹھوں کی خریداری کی تجویز کی تھی۔ لنکاشائر والے اِسوقت خواہ مخواہ بدنام کر رہے ہیں کہ ہندوستانی غیر سرکاری نمایندوں کی طرف سے کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی گئی۔

لنکاشائر والوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کم سے کم ۳۳ کروڑ ۳۰ لاکھ گز کپڑا برطانیہ سے خرید کرے لیکن اُنھوں نے کپڑے کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو برطانیہ کو ہندوستان میں داخل کرنے کا حق ہونا چاہئے تعداد متذکرہ بالا سے دوچند رکھی یعنی ۶۶ کروڑ ۶۰ لاکھ گز کپڑا۔ اور یہ تجویز کیا کہ موجودہ شرح محصول جو بیس فیصدی ہے گھٹا کر ۱۵ فیصدی کر دی جائے۔ اِدھر تو یہ زور اُدھر ہندوستان کی روئی کی خریداری کے بارے میں موجودہ تعداد ۶۵۰،۰۰۰ (650،000) گانٹھوں سے گھٹ کر ۴۰۰،۰۰۰ (400،000) گانٹھوں کی خریداری تجویز کی اور بقیہ کے لئے یہ کہہ دیا کہ برطانیہ اپنی کوشش زیادہ خریداری کے لئے کم نہ کریگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ناممکن القبول تجاویز ہندوستان کے غیر سرکاری نمایندے کیونکر قبول کر سکتے تھے۔

سر محمد ظفر اللہ انگلستان گئے ہوئے ہیں اور وہاں دفتر نوآبادیات اور برٹش بورڈ آف ٹریڈ سے اِس معاملہ میں گفت و شنید کر رہے ہیں۔ نئے معاہدہ کا وہاں جو خاکہ تیار ہو رہا ہے، وہ سر موصوف ہندوستان ماہ اگست کے پہلے ہفتہ میں لے آویں گے اور ایک جلسہ بنا بر مشورہ ہندوستان کے غیر سرکاری نمایندگان کا کریں گے۔ اب دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

لطفِ سخن

"پچھلے دنوں غازی آباد ضلع میرٹھ میں ایک شاندار بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی، جس کے انتخاب کیلئے ہم محمد اظہار الحسن صاحب بی۔اے، ایل ایل بی وکیل کے ممنون ہیں۔ بوجہ قلت گنجائش ہمیں اس انتخاب میں مزید کانٹ چھانٹ کرنی پڑی جس کیلئے ہم مجبور ہیں۔ بایں ہمہ کلام کے انتخاب میں کلام کی خوبیوں کا ضرور خیال رکھا گیا ہے۔"

ارشد حسن صاحب ارشد کاظمی

بھلاؤں لاکھ میں آتا ہے لیکن یاد رہ رہ کر — وہ آنا موسم گل کا وہ جانا میرا گلشن سے

نشاط و عیش حاصل تھا چمن کے رہنے والے تھے — یہ کیا معلوم تھا نسبت قفس کو بھی ہے گلشن سے

عذابِ جاں قفس کی تنگیاں پھر اُس پہ یہ طرّہ — ہواؤں پر ہوائیں آرہی ہیں صحنِ گلشن سے

یہی تو حاصلِ ہستی ہے تم پر مٹنے والے کا — جدا کیوں خاک دامنگیر کو کرتے ہو دامن سے

وہی ارشد تمہارا ہوں جسے کاندھوں پہ لائے تھے — گذرنے والو بچ کر نہ نکلو میرے مدفن سے

گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

چمن کی آنکھ کا تارا، نہ زیبِ طرّۂ خوباں — میں وہ گل ہوں جو گر جائے کسی گلچیں کے دامن سے

یہیں تو خانۂ صیاد بھی اک دو قدم پر ہے — یہ کیسی برق کو ضد ہے مری شاخِ نشیمن سے

اصغر صاحب مظفر نگری

چمن چھوٹا، کٹے پر، اور یہ کنج قفس دیکھا — قیامت ہو گیا میرے لئے اڑنا نشیمن سے

عبد الرحمٰن صاحب برقی غازی آبادی

لگے ہیں دل میں پنکھے شمع ہستی جھلملاتی ہے — ہوا کرتی ہوئی بادِ فنا آتی ہے دامن سے

سدا نند سکسینہ صاحب جلال ایم۔اے

رفیقِ زندگی غم ہے کہ افزوں اس کو پاتا ہوں — بڑھاپے میں جوانی سے جوانی میں لڑکپن سے

سید عبد الوحید صاحب چمن ہاپوڑی

صبا دو چار تنکے ہی اُڑا لا صحن گلشن سے — قفس میں ہم بہت بے چین ہیں یادِ نشیمن سے

سلطان محمد خاں صاحب زار غازی آباد

وہ صحرا ہو کہ گلشن انس ہو جاتا ہے مسکن سے — قفس سے اب وہ الفت ہے جو پہلے تھی نشیمن سے

عدم آباد کی دشواریٔ منزل معاذ اللہ — یہ رستہ وہ ہے جسکی ابتدا ہوتی ہے مدفن سے

امرناتھ صاحب مدن ساحر دہلوی

نمایاں ہے کسی کی خود نمائی طور وایمن سے — نہاں ہے حسن چلمن میں عیاں ہے جلوہ چلمن سے
میں لامذہب ہوں کفر عشق کا دلدادہ ہوں ساحر — مرا مشرب جدا ہے مذہب شیخ و برہمن سے

محمد سلیم صاحب سلیم ہاپوڑی

کرم اور گلفشانی کا کرم اک مرنے والے پر — مرے مدفن کو شرمندہ نہ کیجے اپنے دامن سے
کہاں دیدار اُن کا اور کہاں بے ہوشیٔ موسیٰ — نکل آئی تھی رو میں اک تجلی چشم ایمن سے

اللہ دیا صاحب شمس ہاپوڑی

نصیب دشمناں داغ محبت میں خلش کیسی — یہ کانٹے دور رہتے ہیں مرے پھولوں کے دامن سے
نگاہ شوق کو حسن نہاں اتنا بتا دینا — وہ کیا شے ہے جو چھن چھن کر نکل جاتی ہے چلمن سے

ظہیر حسین صاحب رضوی ایم اے۔ ایل ایل بی

ادھر عرض تمنا اک نگاہ آرزو فن سے — ابھر آنا اُدھر کچھ حسن کی موجوں کا چتون سے
وہ رنگین داستان دل جو اشکوں نے رقم کی تھی — بہار گلستاں بن بن کے پھیلی میرے دامن سے
بساط غم تو کیا سارا نظام دل پلٹ جاتا — یہ دو آنسو اگر تم پونچھ دیتے اپنے دامن سے
مری ہر خامشی پیغام حسرت کی وہ صورت ہے — جو مر کر بھی نہ ممکن ہو سکیگی میرے دشمن سے

سید سبط احمد صاحب غافل امروہوی

بتا دیتی ہیں نکتہ چینیاں راہیں ترقی کی — کمال فن کیا کرتا ہوں حاصل اپنے دشمن سے

احمد خاں صاحب کیفی بی۔ اے، ایل ایل بی میونسپل کمشنر کاسگنج

شکایت باغباں کی ہے نہ شکوہ برق گلشن سے — نشیمن جل اٹھا خود شعلۂ حسن نشیمن سے
کسی نے اُن کے دیوانے کی یوں تصویر کھینچی ہے — گریباں جل رہا ہے اور ہوا دیتا ہے دامن سے

مظہر علی صاحب مظہر غازی آباد

طریق عشق میں جائز نہیں ہے کینہ دشمن سے — مرا مذہب الگ ہے مذہب شیخ و برہمن سے
قفس ہی سے بس اے ہمدم مجھے مانوس رہنے دے — کہ دل پر چوٹ سی لگتی ہے روداد نشیمن سے

سید منظور حسن صاحب منظر ہاپوڑی

ترے جلووں کو تو پردہ میں چھپنا بھی نہیں آتا — نکلتی ہیں شعاعیں حسن کی چھن چھن کے چلمن سے

مباحثہ

اُردو۔ہندی۔ہندستانی

اِس عنوان سے زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۰ء میں جو مضمون مکرمی جگر بریلوی کا شائع ہوا ہے۔اُس کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی بی۔اے نے ایک طولانی مراسلہ لکھا ہے۔جسمیں آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"مضمون نگار کی نفس شکایت بیجا نہیں۔ہندوؤں کی حق تلفی اُردو کے باب میں ہوئی ضرور،لیکن یہ کہنا بھی زیادتی ہے کہ۔

"اُدھر ہندوؤں کی تصانیف کو دائرہ ادب سے خارج کردیا گیا،اُدھر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں سے ہندو مصنفوں کو نظرانداز کردیا۔"

پنڈت دیا شنکر نسیم۔بابو جوالا پرشاد برق۔پنڈت برج نراین چکبست۔منشی نوبت رائے نظر۔منشی دیا نراین نگم۔منشی دھنپت رائے" پریم چند"۔پنڈت برجموہن ناتھ کیفی۔پنڈت منوہر لال زتشی۔منشی جگت موہن لال رواں۔پنڈت انند رائے مُلا۔سُدرشن وغیرہ بیسیوں ہندو اہلِ قلم کے کارناموں کو کون بھلا سکتا،نظرانداز کرسکتا ہے؟ اُردو مصنفین اور شاعروں کا جب کبھی کوئی مسلمان مفصل تذکرہ لکھیگا،تو ان سب کے لئے بہرحال مناسب جگہ نکالنی پڑیگی۔میں نے آج سے ۱۹۔۲۰سال قبل (غالباً ۱۹۱۰ء میں) پنڈت کشن پرشاد کول صاحب کے رسالہ" صبح اُمید" میں ایک مضمون"ہندو مصنفین اُردو" کے عنوان سے لکھا تھا۔جو اگرچہ سرسری تھا،تاہم اُسمیں نہ صرف شعراء،ادب بلکہ ہر علم و فن سے متعلق ہندو مصنفین اُردو کے حوالہ درج تھے۔افسوس ہے کہ وہ پرچہ اِسوقت پیش نظر نہیں۔

شاعروں کے جو تذکرے مسلمان اہلِ قلم کے قلم سے ہیں۔اُنمیں بھی عموماً ہندوؤں کو"نظرانداز" نہیں کیا گیا ہے،میر حسن (صاحب مثنوی"بدرِ منیر") کے تذکرے میں کم از کم ۱۹ ہندو شاعروں کا ذکر تو ضرور موجود ہے۔ٹیک چند بہار،بندرابن راقم،انندرام مخلص وغیرہ۔میر تقی میر کا تذکرہ"نکات الشعراء"اگرچہ بہت مختصر ہے،تاہم چار عنوان تو ہندو شاعروں کے اس میں بھی موجود ہیں۔اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کا ذکر،میرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند میں بھی موجود ہے۔شیفتہ کے تذکرہ گلشنِ بیخار سے متعلق بھی یہ بیان صحیح نہیں کہ اُس میں صرف ۲۵۔۳۰ ہندو شاعروں کا ذکر ہے،کم از کم ۴۲ کا تو ضرور ہے۔نساخ کے تذکرہ"سخن شعراء میں" ناموں کے گننے کا تو وقت میسر نہیں۔لیکن برائے نام اُلٹ پلٹ میں بھی،متعدد صفحوں پر ہندو شاعروں کے نام نظر پڑگئے،مثلاً ص۱۱۵ پر جوہر تخلص کے ۳ ہندو شاعر،ص۳۵۰ پر غبار،ص۳۵۱ پر غلام،ص۳۵۲ پر غم،ص۴۵۴ پر ملک،ص۴۵۳ پر مقبول ص۴۵۵ پر مفتون تخلص کے دو ہندو شاعر۔تلاش سے یقیناً اس میں ایک بڑی تعداد مل جائے گی۔

صاحب"آب حیات" نے اگر ہندو شاعروں کو چھوڑ دیا ہے،تو اُس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے جو معیار (صحیح یا غلط،یہ ایک الگ سوال ہے) اپنے سامنے رکھا تھا۔اُس پر مسلمان شاعر ہی کون بہت سے اُترے ہیں؟ بس جو اُن کے معیار پر نہ اُترا،وہ خارج کردیا گیا۔اس کو شاعر کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

آخر میں مضمون نگار نے جو علاج تجویز کیا ہے،وہ مرض کو دُور کرنیوالا نہیں بلکہ اور پیچیدگیاں بڑھانیوالا ہے۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کے لئے فرصت کی ضرورت ہے۔یہ چند سطریں تو محض قلم برداشتہ لکھ دی گئیں۔

زمانہ جون
۴
اشتہارات
چند نئی کتابیں
دلّی کا سنبھالا:- از خواجہ محمد شفیع (دہلوی) مرحوم، دلّی کے ایام عروج کی مرقع نگاری، دلّی کی اُس
ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جو اب نابود ہے۔ اندازِ بیان ایسا موثر ہے کہ دل
بے اختیار ہو جاتا ہے۔ قیمت مجلد عہ
لطائف غالب:- مسٹر ایم۔ اے شاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت
سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت ۳ر
شعلۂ طور (طبع ثانی)۔ حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ، بالکل نئی ترتیب۔ بہت کچھ تازہ کلام
کا اضافہ، قیمت بھی کم کردی گئی ہے یعنی کے بجائے
سبدِ چین:- مرزا اسد اللہ خان غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ، جس میں اُن کے وہ فارسی
قطعات بترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل
ہیں۔ جو اُن کی کلیات میں موجود نہیں ہیں مع مکمل سوانح حیات۔ قیمت ۸ر
ذکرِ غالب:- مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانح عمری، جس میں
بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلبا کے لئے خاص طور سے بہت
مفید ہے۔ قیمت ۸ر
قرآن کیا ہے اور اُس نے کیا کر دکھایا؟ از عبدالواحد سندھی: اُستاد مدرسہ، جامعہ
بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدنظر
رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی
قیمت صرف ۶ر
دلّی:- بچوں کے لئے دلّی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان، جن کے پردے میں
دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی ہے۔ بلاک کی چھ تصاویر، دو نقشے۔ قیمت صرف ۴ر
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور